میرؔ اور مثنویاتِ میرؔ
پروفیسر وہاب اشرفی
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶
HaSnain Sialvi

میؔر اور مثنویاتِ میؔر

وہاب اشرفی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

کتب کو بِنا کسی مالی فائدے کے (مفت) پی ڈی ایف کی شکل میں تبدیل کیا جاتا ہے، ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بننے کیلئے وٹس ایپ پر رابطہ کریں

حسنین سیالوی
0305-6406067

Meer Aur Masnawiyat-e-Meer

by
WAHAB ASHRAFI

Year of Ist Edition 2003
ISBN 81-87667-57-5

Price Rs. 225/-

نام کتاب	میر اور مثنویاتِ میر
مصنف	وہاب اشرفی
سنہ اشاعت اوّل	۲۰۰۳ء
قیمت	۲۲۵ روپے
مطبع	عفیف پرنٹرس، دہلی

PUBLISHED BY
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Ph : 3216162,3214465 Fax : 011-3211540
E-mail- ephdelhi@yahoo.com

انتساب

عزّت مآب ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی
کے نام

جلوہ گاہِ طائرِ اقبال گردد ہر کجا
سایہ انداز دہمائے چترِ گردوں سائے تو
(حافظ)

ترتیب

دوسرا ایڈیشن

'مثنویاتِ میر کا تنقیدی جائزہ' بہت پہلے شائع ہوئی تھی، پھر یہ کتاب میرے ذہن سے قطعی نکل گئی حالانکہ اب اس کی جلدیں دستیاب نہیں ہیں۔ میں نے حک و اضافہ کے لئے اسے بہ نظر غائر دیکھنے کی کوشش کی، مجھے حیرت ہوئی کہ پہلے کا محاکمہ بھی کچھ ایسا نہ تھا کہ رد کر دیا جائے — میر کے بارے میں بعض تحقیقی مرحلے بھی سامنے آتے رہے ہیں، انہیں بھی نئی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تھی تو باتیں بہت آگے نہیں بڑھی تھیں — قاضی عبدالودود مرحوم نے اتنی محنت سے بعض نکتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے مطالعے سے آگے نکلنا تقریباً ناممکن ہے۔ بہت سے لوگوں نے میر کے متعلق جو تحقیقی امور درج کئے ہیں ان میں زیادہ تر قاضی صاحب کی محنت کا عکس نظر آتا ہے — میرے پیشِ نظر موصوف کی متعلقہ نگارشات رہی ہیں، ایسے میں ان پر کوئی اضافہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے، ہاں تنقیدی حصے کی بات اور ہے۔ لیکن پروفیسر نثار احمد فاروقی نے چند نئے نکات سامنے لائے ہیں۔

میں نے پہلی اشاعت میں اس کا اظہار کیا تھا کہ 'مثنویاتِ میر' دوبارہ شائع ہوئی تو مثنویوں کے متون کو شامل کرنا میری کاوش رہے گی، سو میں نے اس اشاعت میں یہ التزام رکھا ہے — میر کی مثنویات کے سلسلے میں میں نے کوئی تحقیقی کام سرانجام نہیں دیا ہے۔ یہ متون مجھے خدا بخش لائبریری کے ذی علم ڈائرکٹر ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری سے حاصل ہوئے ہیں — میں ان کی کرم فرمائی کا بے حد ممنون ہوں — میں دوسرے پراجکٹس میں اتنا الجھا ہوا ہوں کہ متون کے باب میں تحقیق کا نیا سلسلہ قائم نہیں کر سکتا — یہ کام میں

تیسرے ایڈیشن کے لئے اظہار کھتا ہوں۔

میں نے کتاب کے نام میں ضروری تبدیلی کر دی ہے، اب یہ 'میر اور مثنویات میر' کے عنوان سے شائع ہو رہی ہے، اس کی ایک وجہ میر کے احوال زندگی کی بحث ہے۔

میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کے مالکان کا شکر گذار ہوں کہ وہ مسلسل اس کتاب کی اشاعت پر اصرار کرتے رہے ہیں۔ آج بھی جب یہ تحریر قلمبند کر رہا ہوں تو ان کا ایک خط پیش نظر ہے جس میں کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں تاکید ہے۔

میر ایک ایسے شاعر ہیں جن کے بارے میں ان کی اپنی پیش گوئی ہے:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

اس کے بعد اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

وہاب اشرفی
۱۸/اگست ۲۰۰۲ء

حرفِ آغاز

(پہلے اڈیشن کا دیباچہ)

"مثنویاتِ میر کا تنقیدی جائزہ" میری نظر میں اس دیرینہ خواہش کا نتیجہ ہے کہ میر تقی میرؔ کی مثنویات پر ایک باضابطہ اور مکمل کتاب ہوتی۔ میرؔ اور اُن کی شاعری سے متعلق مواد کی کمی نہیں۔ کئی قابلِ لحاظ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، قاضی عبدالودود، خواجہ احمد فاروقی، سید عبداللہ اور صفدر آہ کی متعلقہ نگارشات نے میرؔ سے متعلق کتنے ہی اہم تحقیقی مسائل حل کر دیئے ہیں ـــ پھر صنفِ مثنوی اور اس کے ارتقاء پر الگ الگ جہت سے عبدالقادر سروری، گیان چند جین، گوپی چند نارنگ، سید عقیل رضوی اور نجم الہدیٰ کی کتابیں ہیں ـــ ان سب سے میں نے استفادہ کیا ہے۔ اکثر جگہوں پر میرؔ کی مثنویوں سے بحث ملتی ہے لیکن سرسری طور پر ـــ میں نے کوشش کی ہے کہ میرؔ کی مثنویوں کو سیاق و سباق کے حوالے سے دیکھا جائے اس طرح کہ ان کا جامع تنقیدی مطالعہ سامنے آ جائے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کتاب میں میرؔ کی مثنویوں کا متن بھی شریکِ اشاعت ہوتا لیکن تب ضخامت بہت بڑھ جاتی۔ ابھی اس کا موقع نہ تھا لیکن اس کتاب کو دوبارہ چھپنا نصیب ہوا تو یقیناً یہ کمی پوری کی

جائے گی۔

اس کتاب کی کتابت آخری مرحلے میں تھی کہ 'نقوش' لاہور کا میر نمبر سامنے آگیا، یہ ضخیم نمبر دو جلدوں میں ہے، سرسری طور پر میں نے اس کا مطالعہ کیا لیکن اس کی روشنی میں کوئی ترمیم، تنسیخ یا اضافے کی ضرورت محسوس نہیں کی، اس لئے کہ اس نمبر سے مثنویاتِ میر پر کوئی نئی روشنی نہیں پڑتی، پھر بھی چند نکات کی حد تک استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ بہر حال، اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے، حک و اضافے کی گنجائش تو ہمیشہ باقی رہے گی۔

وہاب اشرفی
۲۳ ستمبر ۱۹۸۱

حیاتِ میرؔ

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

میر تقی میرؔ کی شاعرانہ عظمت و سر بلندی کی کبھی کسی زمانہ یا کسی عہد میں کوئی حرف گیری نہیں کی گئی۔ ہر عہد میں انہیں مسلّم الثبوت استاد مانا گیا، ان کی عظمت پر مہر تصدیق ثبت کی جاتی رہی۔ لیکن ان کی زندگی کے اوراق بہر رنگ پریشان نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ سلسلۂ نسب بھی اختلافی روایتوں سے خالی نہیں۔

مولوی عبدالباری آسیؔ نے سلسلۂ نسب اس طرح درج کیا ہے:

شجرہ خاندان میر[1]

جد کلاں
- جد
  - پسر کلاں فاتر العقل
  - محمد علی
    - زوجہ اولیٰ
      - محمد حسن
        - محمد محسن
    - زوجہ ثانی
      - محمد تقی
        - عسکری
        - فیض علی
        - دختر
      - محمد رضی
      - دختر

---

[1] مقدمہ کلیات میر۔ صفحہ ۳
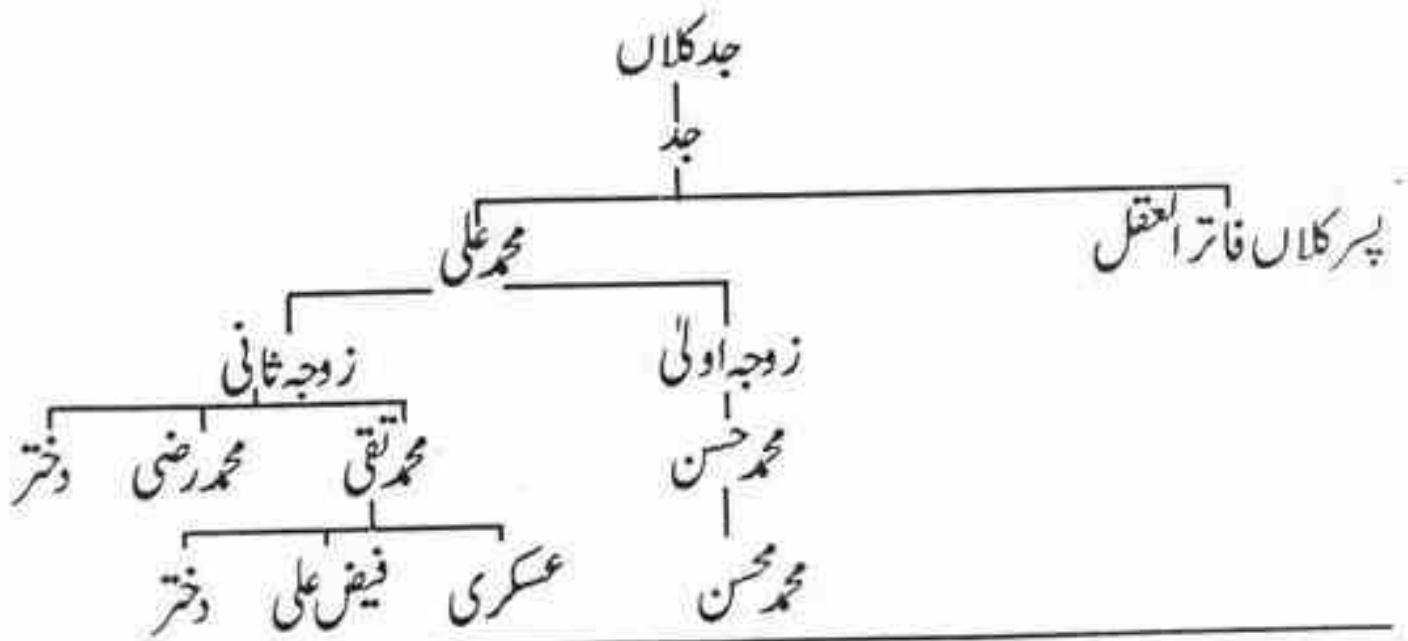
حیرت ہوتی ہے کہ خود میرؔ اپنی خودنوشت سوانح ''ذکرِ میر'' میں پر دادا اور دادا کا نام نہیں لکھتے جن پر نسب کی بنیاد ہے۔ بلکہ والد کا نام بھی شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی کی زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔ ''میاں علی متقی''[1] 'ذکر میر' کے دستیاب ہونے سے پہلے تذکرہ نگاروں نے ان کے والد کا نام عبداللہ بھی لکھا ہے۔ خود مولوی عبدالباری آسیؔ اپنے مقدمہ کلیات میر میں رقمطراز ہیں:

> ''دوسرے میرؔ صاحب کے والد جن کے والد کا نام محمد علی یا عبداللہ تھا
> اور علی متقی ان کے پیر کا بخشا ہوا لقب تھا۔[2]''

میرؔ نے اپنی خودنوشت سوانح میں اپنے خاندان کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے اسلاف حجاز سے ہندوستان پہنچے۔ پہلے دکن میں اقامت اختیار کی، مگر وہاں کچھ ایسی مجبوریاں پیش آئیں کہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے اور احمد آباد (گجرات) چلے آئے۔ لیکن یہ سرزمین بھی راس نہ آئی اور کشش آب ودانہ انھیں اکبر آباد (آگرہ) کھینچ لائی، یہیں پر وہ بس گئے اور یہیں رچ بس گئے اور یہیں ان کے آبا واجداد پیوند خاک ہوئے۔

ان کے دادا اکبر آباد میں فوجدار تھے۔ پچاس سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ مرحوم فوجدار کے دولڑکے ہوئے۔ ایک تو نوجوانی ہی میں اختلال دماغ یا جنوں کا شکار ہوکر انتقال کر گئے۔ دوسرے محمد علی تھے جس سے اس خاندان کی نسل باقی رہی۔ یہ میرؔ صاحب کے والد تھے۔

سیادتِ میرؔ

میرؔ کی سیادت پر مورخین کا اعتماد کلی نہیں ہے۔ یہ موضوع بھی متنازعہ رہا ہے۔ میرؔ خود کو بہت بلند آہنگی سے سید بتاتے ہیں اور اس امر کا فخریہ انداز میں اپنی غزلوں میں ذکر بھی کرتے ہیں۔ مگر ان کا دعویٰ عام طور پر مورخین کو مطمئن نہ کر سکا۔

---

[1] میرؔ کی آپ بیتی ترجمہ وتلخیص: خواجہ احمد فاروقی [2] مقدمہ کلیات۔ صفحہ ۳

اشعار :

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں	اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی
اے غیر میرؔ تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے	سیّد نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے
کب اقتدا ہو مجھ سے کسی کی سوائے میرؔ	بندہ ہوں دل سے میں اسی سیّد امام کا
سیّد ہیں میرؔ صاحب درویش درد مند	سر رکھئے ان کے پاؤں پہ جائے ادب ہے یہ
ذلیل ذات نہیں عشق میں کہ میرؔ کو دیکھ	ذلیل کیسے ہیں ان کی ہے گو کہ ذات بڑی
غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑ مریں گے	آگے بھی میر سیّد کرتے گئے ہیں ساکا
در پر سے ترے اب کے جاؤں گا تو جاؤں گا	یا پھر اگر آؤں گا سیّد نہ کہاؤں گا
منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میرؔ کی	ذاتِ مقدس ان کی یہی ذات ہو تو ہو
جانتے[1] ہیں کہ ہے یہ دل دادہ	سیّد خستہ خاک افتادہ
تم[2] بنی فاطمہ ہو ہم ہیں غلام	ہے غلامی تمہاری اپنا کام

لیکن میرؔ صاحب کے یہ بلند آہنگ دعوے چونکہ خود ان کی زبان سے ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ مورخین کے افکار بحث و تمحیص کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

''مقدمہ ذکرِ میرؔ'' میں جسٹس سر شاہ محمد سلیمان نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سلسلہ میں دوسرے مورخین کی رائیں بھی پیش کی ہیں۔ مقدمہ کلیات میرؔ میں عبدالباری آسیؔ نے بھی اس سے استفادہ کیا ہے اور بعینہٖ عبارت نقل کردی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ان کے نسب کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ یہ شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ اپنے کو سیّد کہتے تھے۔ لیکن ان کے زمانے میں کچھ لوگ اس دعویٰ پر حرف زن بھی تھے۔ 'تذکرہ شورش' میں ہے کہ خطاب سیادت

---

[1] معاملات عشق [2] مختار سلطنت کی زبانی

ان کو شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا۔ اور 'آبِ حیات' میں آزاد نے لکھا ہے کہ چند کہن سال بزرگوں سے سنا گیا کہ میر کے والد نے ان کو متنبہ کیا تھا کہ میر تخلص کرنے سے سید بن جائیں گے۔ اس کے بعد سودا کا ایک شعر آزاد نے نقل کیا ہے جو کلیات میں نہیں پایا جاتا اور وہ میر کی شرافت کی ہجو میں ہے :-

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر
کچھ شیر مال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

سودا کا ایک دوسرا شعر جو مشہور ہے اور جس میں میر ہی کے خاندان کی طرف اشارہ ہے، یہ ہے :-

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد
بیٹا تو گند نا بنا اور آپ کو تھمیر

بلا کسی بنیاد کے ذات پر حملہ کرنا ایک تعجب خیز بات تھی۔ زمانہ حال کے تمام نکتہ چیں آزاد کے اس شبہہ پر مضحکہ کرتے ہیں اور یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ میر ہمیشہ اپنے کو سیّد کہتے تھے اور ذکرِ میر میں بھی اپنے کو سیّد لکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا لقب میر مشہور تھا۔ لکھنؤ میں ان کو سب سیّد یقین کرتے تھے اور خود میر نے اپنے کو برابر سید لکھا ہے :-

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

لیکن مطبوعہ 'ذکرِ میر' میں بھی میر نے خود کو سوائے میر تقی لکھنے کے صاف طور پر سیّد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اپنے دادا پردادا کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ اپنے والد کو بھی سیّد نہیں لکھا اور نہ اپنے بھائیوں میں

سے کسی کو میر یا سیّد کے لقب سے یاد کیا ہے، بخلاف اس کے غیروں کو، مثلاً امان اللہ۔ مکمل خاں اور سعادت علی خاں کو سیّد لکھا ہے۔ مولوی مسعود حسین رضوی کے نسخے میں 'حقیقت حال مصنف' کے زیر عنوان اپنے متعلق یہ لکھا ہے کہ 'کسے فقیر و شاعر و متوکل دانستہ بطریق نذر چیزے میفرستند'۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ[1] میں یہ لکھا ہے کہ میرؔ صاحب نے 'ذکر میر' میں اپنے والد کے نام کے ساتھ میر کا لفظ لکھا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میرؔ صاحب اپنے والد کو ہر جگہ میر علی متقی لکھتے ہیں۔ اسی سے مولوی محمد عسکری نے بھی نقل کیا ہے۔ لیکن ایسا لکھنا نہایت تعجب خیز ہے۔ کیونکہ 'ذکر میر' میں اپنے والد کو علی متقی یا درویش یا عزیز مردہ کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ مجھے تو میر علی متقی کہیں نہیں ملا صرف ایک جگہ[2] 'میر محمد علی' درج ہے۔ حقیقت میں علی متقی جب ان کا لقب تھا تو اس کے پہلے میر لکھنا ہرگز موزوں نہ ہوتا۔ نہ کوئی درویش صفت بزرگ خود کو ایسا کہلانا پسند کرتا۔ البتہ مضامین کے عنوان میں 'میر علی متقی' لکھا ہوا ملتا ہے مگر مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمہ میں خود تسلیم کیا ہے کہ کوئی عنوان اصل متن میں تھا ہی نہیں۔ مولوی مسعود حسن رضوی کے نسخہ میں بھی اس قسم کا عنوان نہیں ہے اور نہ مولوی محمد شفیع کے نسخے میں ہے۔

دوسرا دعویٰ ان دونوں صاحبوں نے یہ کیا ہے کہ اس کتاب میں میرؔ نے اپنے والد کی زبانی اپنا نام میر محمد تقی لکھا ہے۔ اول تو ان کے والد کی زبانی اس طرح پر خطاب کیا جانا مجھے کہیں نہیں ملا، دوم یہ کہ اگر

---

[1] مقدمہ ذکر میر
[2] ذکر میر

ہو بھی تو تعجب خیز بات ہوگی کہ ایک صوفی منش درویش اپنے دس سال کے بیٹے کو 'میر محمد تقی' کہہ کر پکارے۔ یہ صحیح ہے کہ میر نے اپنے کو دوسروں کی زبانی بھی میر محمد تقی لکھا ہے۔ مگر واضح رہے کہ یہ کتاب انھوں نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھی تھی، جب وہ خود میر مشہور تھے۔ تو وہ اقوال جو انھوں نے اپنے والد یا سیّد امان اللہ کے نقل کئے ہیں لفظ بہ لفظ اصلی ہو سکتے ہیں، نہ اس کی امید کی جا سکتی ہے کہ دس سال کی عمر میں جو کچھ انہوں نے کانوں سے سنا اسے بجنسہ بعد کو یہی قلمبند کیا ہوگا جب تخلص میر تھا تو میر صاحب مشہور ہو جانا مشکل نہ تھا اور اگر حقیقت میں وہ سیّد نہ تھے تو 'ذکر میر' میں اپنے کو میر لکھنا کوئی نا قابل قیاس بات نہیں ہو سکتی۔ تحقیق صرف یہ راستہ ضرور دکھاتی ہے کہ میر اپنے کو سیّد کہتے تھے اور سیّد مشہور تھے لیکن مصحفی نے ہجو میں ان کی سیادت پر شبہہ کیا۔ اب اتنے زمانے کے بعد کہ درحقیقت میر سیّد تھے یا جیسا اکثر لوگوں نے اس زمانے میں کہا سیّد بن بیٹھے تھے مشکل ہے۔''[۱]

قاضی عبدالودود صاحب نے ''میر کے مختصر حالات زندگی'' میں میر کی سیادت کے متعلق جو کچھ متن وحواشی کے ساتھ رقم فرمایا ہے اس سے بھی ان کی سیادت پر شبہہ ہوتا ہے۔ ''افکار میر'' میں ایم حبیب خاں نے قاضی صاحب کے اس مضمون کو بھی اپنے مجموعۂ مضامین میں شریک کیا ہے۔ یہ مضمون صفحہ ۲۵ سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدائی حصہ میں یہ عبارت ہے:

''کچھ لوگ ('بزرگان میں' ذکر میر صفحہ۲) جن کی فاطمیت کا دعویٰ کیا گیا ہے، اپنے 'دارودستہ' کے ساتھ حجاز سے وارد ہند ہوئے۔ اور ان میں سے ایک شخص کا نام معلوم نہ ہو سکا آگرہ میں آکر توطن گزیں

---

[۱] ماخوذ از مقدمہ کلیات

ہوئے۔ کہا جاتا کہ ان کے بیٹے جو باپ کی طرح مجہول الاسم ہیں،
فوجداری نواح آگرہ پر فائز ہو گئے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے
جو خلل دماغ سے خالی نہ تھے، جوان مرے۔ چھوٹے جن کا نام محمد علی
تھا ۱۰۸۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ انھوں نے علوم ظاہری کی
تحصیل شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی متوفی ۱۱۰۹ھ سے کی اور ظاہراً انہیں کے
مرید بھی ہوئے۔ ان کی پہلی بیوی خان آرزو کی بہن تھیں، دوسری کس
خاندان کی تھیں اس کا پتہ نہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس عہد کے معیار
شرافت پر پوری نہ اترتی ہوں۔''

اس متن کے حواشی بھی قابل توجہ ہیں۔ متن ''جن کی فاطمیت کا دعویٰ کیا گیا ہے''
قاضی صاحب اس پر حاشیہ لکھتے ہیں:-

''میر نے کلیات میں ایک اور شخص کی زبان سے اپنے کو بنی فاطمہ
کہلوایا ہے۔ میری رائے میں ان کی فاطمیت مشتبہ ہے۔ اس رائے کی
تائید میں کہ میر صدیقی ہیں بعض اصحاب نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ
میرے نزدیک میں قابلِ قبول نہیں۔''

دوسرا حاشیہ ''دارودستہ'' پر لکھتے ہیں:-

''دارودستہ'' قوم قبیلہ، مراد یہ ہے کہ اس خاندان کے کچھ لوگ
آئے۔''

''تیسرا حاشیہ'' فوجداری نواح آگرہ پر فائز ہو گئے'' قاضی صاحب رقمطراز ہیں:-

''میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔''[1]

قاضی صاحب کے متن و حواشی دونوں مجمل ہیں۔ لیکن اس کی وضاحت انھوں

---

[1] افکار میر صفحہ ۲۵ تا ۲۶

نے اپنے مضمون کی سرخی ''میر کے مختصر حالاتِ زندگی'' پر حاشیہ لکھ کر ان الفاظ میں کر دی ہے:

''اس مقالے میں حوالات بہت کم ہیں، اور اجمال سے کام لیا گیا ہے۔
سند اور تفصیل درکار ہو تو میر سے متعلق میرے دوسرے مضامین دیکھے
جائیں۔ میر نے اپنی ذات اور اپنے بزرگوں اور اپنے مخالفین کی
نسبت جو کچھ تحریر کیا ہے وہ لازماً قابلِ قبول نہیں۔''

سر سلیمان جسٹس سہی، مگر تھے مشائخ گھرانے کے مرنجان مرنج شاہ صاحب۔ اس لئے مقدمہ کی تمام تلقیحات جمع کر دیں اور بحث و مباحثہ سے مسل تو مکمل کر دی مگر شرافت کی بنا پر کچھ فیصلہ لکھنا مناسب نہیں سمجھا، نیز یہ خیال بھی کہ ع

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

ان الفاظ و مباحثہ پر ختم کر دیا:-

''..... کہ اب اتنے زمانے کے بعد کہ درحقیقت میر سیّد تھے یا جیسا کہ
اکثر لوگوں نے اس زمانے میں کہا سیّد بن بیٹھے تھے، مشکل ہے۔''

مگر قاضی عبدالودود صاحب نے دوٹوک اپنا فیصلہ نافذ فرما دیا:-

''میری رائے میں ان کی فاطمیت مشتبہ ہے۔ اس رائے کی تائید میں
کہ میر صدیقی ہیں، بعض اصحاب نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ
میرے نزدیک قابل قبول نہیں۔''

جس طرح سر سلیمان اور قاضی عبدالودود کے افکار و آرا بغیر کسی قطع و برید کے بعینہٖ نقل کر دیئے گئے ہیں اسی طرح صفدر آہ کے خیالات و مباحث بھی زیرِ قلم آ جائیں تو لطف سے خالی نہیں ہوگا۔ کیونکہ انھوں نے سیادت میر کے سلسلہ میں بہت سے پہلوؤں کو مدِنظر رکھ کر قلم اٹھایا ہے اور اپنی حد تک ان کی سیادت کے عقلی و نقلی جو کچھ بھی دلائل فراہم ہو سکے ہیں ان کے اظہار میں کوتاہی نہیں کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میر صاحب مغفور کی سیادت نئے سرے سے ذہنوں پر مرتسم ہونے لگی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ موصوف نے اپنی کتاب ''میر اور میریات'' میں اس

موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے ابتدا میں تقریباً وہی باتیں لکھی ہیں جو سر سلیمان کے مضمون میں محمد حسین آزاد کے افکار و خیالات کے ضمن میں آچکی ہیں البتہ اتنی بات کا اضافہ بھی ہے کہ ''آزاد میر کی سیادت کے پُر زور موید ہیں۔'' اس سلسلہ میں ''آب حیات'' کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے:-

''پھر بھی میں اتنا کہنا واجب سمجھتا ہوں کہ ان کی (میر کی) مسکینی، غربت، صبر و قناعت، تقویٰ اور طہارت محضر بن کر ادائے شہادت کرتے ہیں کہ سیادت میں شبہہ نہ کرنا چاہیے۔ کس کس کو کیا نہ کہا گیا اگر وہ سیّد نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزّتِ سادات بھی گئی''[۱]

اس کے بعد صفدر آہ رقم طراز ہیں:-

''...آب حیات کے علاوہ بھی میر کی سیادت کے خلاف کافی مواد موجود ہے جس پر ذیل میں ایک سرسری نگاہ ڈالی جاتی ہے:

۱ کلیات قائم مملوکہ عبدالحق میں صفحہ ۲۰۵ پر کہتے ہیں کہ قائم کی یہ رباعی ہے:

روٹی کے لئے کہائے تم میر جی میر	کہتے تو بجا تھا آپ کو میر خمیر
پر میر ہوئے یہ اس طرح کہ جیسے	ساگوں میں کوتھمیر، راگوں میں حسیر[۲]''

قائم کی یہ رباعی مولوی عبدالحق کے ذاتی نسخے میں ہے۔ اگر اسے درست بھی مان لیا جائے تو میر کی بے پناہ شہرت اور کامیابی اور قائم کے حسد پر بھی غور کرنا چاہیے۔
یہ کہنا بجا ہے کہ ''قائم کے حسد پر بھی غور کرنا چاہیے۔'' لیکن اس چیز پر بھی توجہ

---

۱ میر اور میریات صفحہ ۲۶ ۲ ایضاً صفحہ ۲۶

دینے کی ضرورت ہے کہ رشک وحسد ہی کی وجہ سے سبھی ان کی ہجو میں ہر ہجو نگار خصوصیت سے 'تنور طبع'، 'نان'، 'پنیر'، 'گندنا'، 'کوتھمیر'، 'خمیر' ہی کا ذکر کیوں کرتا ہے؟ مختلف شعراء نے ہجویں لکھیں تو پہلو بھی مختلف ہوتے۔ نسب پر حملہ کرتے ہوئے سب کا اشارہ ایک ہی سمت کیوں ہو رہا ہے؟ سودا کے اس شعر کو

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر
کچھ شیر مال سامنے کچھ نان، کچھ پنیر

جو کلیات میں نہیں ہے یا خارج کر دیا گیا ہے۔ صرف ''شیر مال'' اور ''نان'' کی ''تلازمہ بندی'' کہہ کر اصل اعتراض کی طرف سے ہٹا کر ذہن کو دوسری طرف مائل کرنے سے کام نہیں چلتا جب تک ان کی نانیہال کھل کر سامنے نہیں آتی یہ خلش ذہن میں باقی ہی رہے گی کہ کیا واقعی میر کے نانا نانبائی تھے؟ اس جانب میر صاحب کا سکوت اور مورخین کی خموشی، ہجو نگاروں کا اس مضمون کو دکھتی رگ پکڑ لینے کی طرح باندھنا تو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ قاضی عبدالودود صاحب کا یہ جملہ کہ ''ممکن ہے وہ اس عہد کے معیار شرافت پر پوری نہ اترتی ہوں'' وزن رکھتا ہے۔

قائم کے رشک وحسد کی داستان سرائی کے بعد صفدر آہ لکھتے ہیں:-

''تذکرہ ''مسرت افزا'' مطبوعہ معاصر، پٹنہ میں ہے کہ خواجہ ناصر مرحوم نے میر تقی میر کی ذکاوتِ طبع آغاز جوانی میں دیکھ کر کہا تھا ''میر میدانِ سخنوری ہوگا'' اس دن سے میر نے اپنے آپ کو میر ملقب کیا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہ بھی نقل ہوئی ہے کہ حضرت مصیب فرماتے ہیں کہ وہ شخص میرا ہمسایہ تھا۔ کچھ دن سعی معاش کر کے وہ واپس آیا تو اس نے آپ کو میر مشہور کیا۔ ایک دن مذاق کے طور پر میں نے اس سے پوچھا کہ شیخ میں کیا نقصان تھا جو میر بن گئے؟ کہا ''پیر نے مجھے یہ خطاب دیا ہے۔''

صاحب تذکرہ ''مسرت افزا'' میر کا دشمن ہے۔ پھر بھی ان کے مندرجہ بالا بیان سے تین باتیں سامنے آتی ہیں۔ ان تینوں باتوں پر تحقیقی نظر ڈالنی چاہئے۔

پہلی بات یہ کہ خواجہ ناصر نے میر کو ''میر میدان سخنوری'' اور میر نے اپنا تخلص میرؔ رکھا۔

خواجہ ناصر کے ذہن میں ''میر میدان سخنوری'' کا تخیل پیدا ہونے کے لئے میر کا تخلص پہلے سے میرؔ ہونا ضروری ہے۔ نیز جوانی میں طبع دکھانے کے لئے ان کا پہلے شاعر ہونا بھی ضروری ہے۔ میر کا تخلص میرؔ اور شاعر ہونا خواجہ ناصر کے بیان سے مقدم ہونا عقلاً لازمی ہے۔ خواجہ ناصر کے بیان پر میرؔ نے اپنا تخلص میرؔ رکھا یہ بالکل غلط ہے۔[1]

یہ بات تو صحیح ہے کہ ''زور طبع دکھانے کے لئے ان کا پہلے سے شاعر ہونا ضروری ہے'' لیکن پہلے سے محمد تقی کا میر تخلص کرنا ضروری نہیں۔ کیونکہ آب حیات میں مذکور ہے کہ میرؔ نے ابتداء اپنا تخلص سوزؔ رکھا تھا۔ ہوسکتا ہے تخلص کی تبدیلی کا یہ واقعہ اسی دور کا ہوا اور اس کے بعد میرؔ نے اپنا تخلص بدل کر میرؔ رکھ لیا ہو کیونکہ اس تخلص سے سیادت بھی ابھرتی تھی۔ اس لئے صفدر صاحب کا یہ محاکمہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

صفدر آہ نے حضرت مصیب کی ہمسائیگی کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ ''پیری مریدی کی بات میرؔ کے عقائد سے میل نہیں کھاتی۔''

اگر میرؔ حضرت مصیب کے ہمسایہ نہ بھی رہے ہوں تو ہم شہر ضرور تھے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں رازداری کا لحاظ رکھا ہے اور کھل کر اپنے اس پڑوسی کا نام نہیں لیا ہے۔ جو بات کہی ہے اشارہ میں کہی ہے جو حالات کے مطابق میر صاحب کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اگرچہ ہم یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات میر تقی میرؔ ہی سے متعلق ہے مگر کلیتہً یقین وادعاں کی حد تک پہنچنے میں کوئی چیز روکنے والی بھی نہیں ہے اور یہ بھی ایک کھلی

---

[1] میرؔ اور میریات صفحہ ۲۶۷

ہوئی بات ہے کہ میر پہلے سنی تھے، پھر لکھنؤ کی آمد کے بعد انہوں نے اپنا عقیدہ تبدیل کیا۔ ورنہ پہلے جب وہ سنی تھے کسی بزرگ کو بھی عقیدت مندی کی وجہ سے بطور پیر پیش کر سکتے تھے۔ اس لئے اگر انھوں نے خواجہ ناصر کو پیر تصور کیا اور یہ کہا کہ ''پیر نے مجھے یہ خطاب دیا ہے'' تو خلاف عقل نہیں ہے اور اسی خطاب کو انھوں نے بعد میں اپنا تخلص بھی بنا لیا۔ صفدر صاحب نکات الشعراء کے حوالے سے مصر ہیں کہ ''درد، میر کے دوست تھے اور خواجہ ناصر ان کے والد اور اُس عہد کے مشہور درویش تھے۔ میر اسی لئے ان کا احترام کرتے تھے'' تو کیا تعجب ہے کہ اس پیش گوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے اپنا تخلص تبدیل کرلیا جو ان کے دعویٰ سیادت میں بھی کام آیا۔

صفدر آہ کے دل میں خود یہ بھی کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ ''آخر میر صاحب کے یہاں دعوائے سیادت میں اتنی شدت کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی احساس کمتری کا نتیجہ ہو؟''[۱]

اس کا جواب انھوں نے قرائن وشواہد سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

> ''اصل بات یہ ہے کہ ایک طرف تو میر کی وہ شہرت اور مقبولیت جو اس سے پہلے کبھی کسی اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ پھر معاصرانہ چشمکیں۔ ساتھ ہی میر کی انانیت اور تند مزاجی۔ ان سب باتوں نے مل کر اُن کے لاتعداد مداحوں کے علاوہ کچھ کٹر دشمن بھی پیدا کر دیئے تھے۔ پرانے زمانے میں سب سے گھٹیا حملہ نسل ونسب پر ہوتا تھا۔ اُن کے تخلص میر نے دشمنوں کے اس رجحان کو اور ہوا دی اور وہ ان کی سیادت کی مخالفت کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔''[۲]

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے، اس طرح گھٹیا حملے وہیں ہوا کرتے تھے جہاں کچھ نظر آتا تھا یا اس

---

[۱] میر اور میریات صفحہ ۲۸ [۲] ایضاً

کے کچھ اسباب و قرائن موجود ہوتے تھے۔ میر صاحب کے یہاں یہ بات پائی جاتی ہے کہ سیادت کا دعویٰ اپنے اشعار میں تو بہت زور شور سے کرتے ہیں مگر 'ذکر میر' میں جہاں ان کو اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کرنی چاہئے تھی وہاں اجمال سے کام لیتے ہیں۔ صرف اپنے اور اپنے اہل خاندان کے نام کے ساتھ لفظ میر لکھ کر بات ختم کر دیتے ہیں۔ ان پر تو مخالفین کی سمت سے بہت رکیک حملے ہو رہے تھے۔ یہاں تو انھیں بہت تفصیل سے اپنے پدری و مادری نسب نامے کو پیش کرنا تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ سوتیلے ماموں کا نام آئے۔ خود میر لکھیں۔ اس دور کے اور اس کے بعد کے مورخین یہ لکھیں کہ میر کے والد کا پہلا عقد خان آرزو کی بہن سے ہوا، لیکن دوسرا عقد جس کے بطن سے میر جیسا عظیم شاعر پیدا ہوا، اس کا کچھ ذکر نہ ہو ــــ آخر'' کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے'' ــــ ان کے دادا، پردادا کون تھے؟ ان کا کیا نام تھا؟ کہاں کسی نے وضاحت کی؟ خود میر خاموش ہیں۔ ان کی سیادت کی شہرت انھیں کی زبانی ہوئی۔ باپ کی جانب سے وہ نجیب و شریف ضرور تھے۔ خواہ سیّد ہوں یا شیخ۔ کیونکہ ان کے پدری نسب پر کوئی انگلی نہیں اٹھاتا اور اس جانب سے ان کے معاصرین مطمئن نظر آتے ہیں۔ ان کی سیادت کی قطعی دلیل تو یہی ہو سکتی تھی کہ کوئی نسب نامہ پیش کیا جاتا اور دیگر شواہد سے اس کی تصدیق بھی کی جاتی۔ مگر افسوس کہ ایسا بالکل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ حسنی تھے یا حسینی اور پھر سادات کی مختلف شاخوں میں سے ان کا تعلق کس شاخ سے تھا اس کا بھی پتہ نہیں۔

نثار احمد فاروقی نے لکھا ہے کہ ''میر نے شیخ عبدالعزیز عزت اور ان کے فرزند سے 'قرابت قریبہ' کا اعتراف کیا ہے۔'' اور پھر وہ پوری تفصیل اس طرح درج کرتے ہیں:

> ''میر نے شیخ عبدالعزیز عزت اور ان کے فرزند سے ''قرابت قریبہ'' کا اعتراف کیا ہے[۱] اور عزت کے احوال میں لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی

---

[۱] میر کی آپ بیتی ص ۲۹ (یہاں ناقل کی غلطی سے قمرالدین خاں نام چھپا ہے۔ یہی فارسی متن میں بھی ہے مگر صحیح فخرالدین خاں ہے۔ اور میر کی آپ بیتی ص ۹۶ میں بھی اسی طرح آیا ہے نیز تاریخ محمدی ص ۷۵)

نے لکھا ہے:

نسبش بہ محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما می رسد، یکے از اجدادِ
اُو بتصاریفِ ایام از مکہ معظمہ بہ ہند اُفتاد، بعضے آبائے او
در قصبۂ ڈھبائی[1] از توابع اکبر آباد توطن گرفت۔[2]

عزت کا شجرۂ خانداں اس طرح بنتا ہے۔

ملا عبدالرشید اکبر آبادی
(ف ۱۰۸۸ھ)

- شیخ عطاء اللہ (۱۱۱۸ھ)
- شیخ عبدالعزیز عزت (ف ۱۰۸۹)
  - سعدالدین خاں (ف ۱۱۱۸ھ)
    - قطب الدین خاں[4]
    - حفیظ الدین خاں[5] مخاطب بہ سعدالدین خاں
  - فخر الدین خاں[3] (ف ۱۱۴۳ھ)
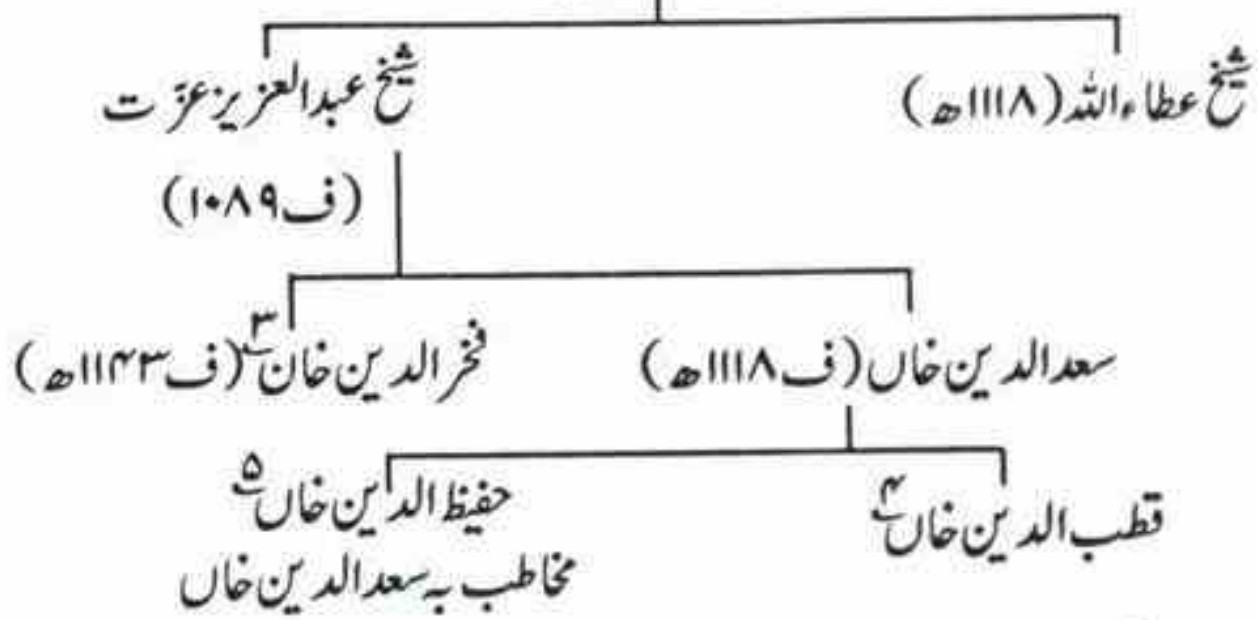
اگر یہ صحیح ہے کہ عزت اور میر تقی میر کے اجداد ایک ہی قبیلے کے تھے، تو میر بھی شیخ صدیقی تھے۔ وہ اپنے اور برادرِ خورد محمد رضی کے ناموں کے ساتھ التزاماً لفظ ''میر'' لکھتے ہیں، اپنے برادرِ علاتی حافظ محمد حسن یا ان کے بیٹے محمد محسن کو میر نہیں کہتے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ محمد علی نے دوسری شادی کسی شیعہ خاتون سے کی ہوگی جو سیادت کا دعویٰ بھی رکھتی ہوں گی۔

---

[1] یہ قصبہ ڈبائی ضلع بلند شہر میں ہے اور آگرہ سے قریب ہے [2] تین تذکرے ص ۲۴۶ مرتبہ نثار احمد فاروقی، شائع کردہ مکتبہ برہان دہلی [3] ان کا حوالہ میر کی آپ بیتی میں دو جگہ آیا ہے، ص ۳۹ (یہاں نام غلطی سے قمرالدین چھپا ہے) ص ۹۶۔ انھوں نے ستر سال کی عمر میں انتقال کیا (تاریخ محمدی ص ۷۵)؛ [4] ذکر میر کے نسخۂ لاہور کے خاتمے کی عبارت (میر کی آپ بیتی ص ۱۹۲) میں ان کا حوالہ ہے [5] میر کی آپ بیتی ۱۱۲، ۱۳۰

اس بارے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ تُوران میں سلسلہ نسب ماں کی طرف سے بھی ملایا جاتا ہے اور سیادت کی حد تک ایرانیوں نے بھی اس رسم کو قبول کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کو ''دنبالۂ سادات'' کہا جاتا ہے، اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد شیعیت کے فروغ کا ایک دور آیا تھا۔ خود اورنگ زیب کے اِس جانشیں نے شیعی عقائد اختیار کر لیے تھے، اور ماں کی طرف سے سیّد ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ بہادر شاہ اوّل کی ماں ایک کشمیری راجا (راجوری) کی لڑکی تھی، جو اورنگ زیب کو نذر کی گئی تھی، اس کے بارے میں یہ افسانہ گھڑا گیا کہ حضرت غوث الاعظمؒ کی اولاد میں سے ایک نہایت مقدس بزرگ سیّد شاہ میر کشمیر میں وارد ہوئے تھے اور راجہ ان کا اس حد تک معتقد ہو گیا تھا کہ اپنی ایک بیٹی ان سے بیاہ دی تھی جس کے بطن سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی پھر سیّد شاہ میر حج کرنے کی غرض سے روانہ ہو گئے، اور کبھی واپس نہیں آئے۔ اُن بچوں نے اپنے نانا کے پاس پرورش پائی اور جب شاہجہاں نے راجہ سے خراج طلب کیا تو اس نے یہی لڑکی بادشاہ کو ''ڈولے'' کی رسم کے طور پر بھیج دی، جو شاہزادہ اورنگ زیب سے بیاہ دی گئی۔ اس کا نام ''گلمتہ النساء بیگم'' تھا، مگر نواب بائی بیگم کہلاتی تھی۔ اُس کے بطن سے بہادر شاہ اوّل پیدا ہوا۔ لہٰذا اس نے بھی سیّد ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ نواب بائی کے نسب کا یہ افسانہ شاہجہاں کے عہد میں نہیں گھڑا گیا تھا، بلکہ اورنگ زیب کے زمانۂ مابعد میں اگر یہ بات شائع کی جاتی تو ظاہر ہے کہ یہ نسب کہیں اور جا ملتا۔''

۱۰ ولادتِ میر

میر کا سنہ ولادت کہیں مرقوم نہیں، البتہ ان کے سنہ وفات کی اطلاع تاریخ کے مصرعۂ تاریخ ''واویلا مردشہ شاعراں'' سے ملتی ہے۔ اس فقرہ سے ۱۲۲۵ھ نکلتا ہے۔ اسی سنہ سے ان کی عمر کا اندازہ کر کے مورخین نے ان کے سنہ ولادت کی تعین کی ہے۔ آزاد[1] نے آبِ حیات

---

[1] آبِ حیات

میں ان کی عمر سو سال بتائی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا سنہ ولادت ۱۱۲۵ھ ہوگا۔ مصحفی نے ''تذکرہ ہندی'' میں جس کا سنہ اختتام ۱۲۰۹ھ ہے، میر کی عمر اسّی سال بتائی ہے۔ جبکہ یہ کتاب تصنیف کے مراحل میں تھی۔ اس لئے مصحفی کے خیال میں بھی میر کی عمر تقریباً سو سال کی ہوئی۔ مگر یہ ساری قیاس آرائیاں میر کے دیوان چہارم کے قلمی نسخہ کے دستیاب ہو جانے کے بعد پادرہوا ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس نسخہ کے آخر میں یہ عبارت مرقوم ہے:

''بروز جمعہ بستم شعبان المکرّم وقت شام ۱۲۲۵ھ یک ہزار و دوصد و بست و پنج ہجری بود کہ میر تقی صاحب میر تخلص صاحب دیوان چہارم در شہر لکھنؤ درمحلّہ سٹہٹی بعد طے نہ عشرہ عمر بجوارِ رحمت ایزدی پیوستند و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دوپہر دراکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور قربائے خویش مدفون شدند۔ و چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم ہم ازاں جملہ است بہ محرر سطور محمد محسن المخاطب زین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیئاتہٖ درعین حیات خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشید ند۔ خدا ایش بیامرزاد۔''[1]

اس نسخہ کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولوی عبدالباری آسی لکھتے ہیں:

''(۱) [2] یہ دیوان خود میر صاحب مغفور و مرحوم نے اپنے شاگرد محمد محسن المخاطب زین الدین احمد کو اپنے ہاتھ سے عنایت فرمایا تھا۔

(۲) یہ دیوان میر حسن علی تجلّی داماد میر مغفور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو غالباً میر صاحب کی ایما سے لکھا گیا اور جسے میر صاحب نے دیکھا۔ کیونکہ وہ ان کے پاس نہ ہوتا تو وہ محمد محسن کو کیونکر دیتے۔

(۳) اس دیوان پر میر صاحب کے کچھ سوانح حیات ہیں جن سے

---

۱ میر تقی میر صفحہ ۲۲۰ ۲ مقدمہ کلیات میر

بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے جو اب تک تذکرہ نویسوں کی نظر سے مخفی تھیں۔

(۴) اس پر بعض شاہان اودھ کی مہریں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ شاہی کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے۔

(۵) اس دیوان میں کچھ غزلیں ایسی ہیں اور ایک مثنوی بھی ہے جو اب تک کسی دوسرے دیوان میں نظر نہیں آئی .... الخ

میر نے تاریخ وفات نثر میں لکھ کر دو قطعہ تاریخ بھی درج کیا ہے[1]

قطعہ تاریخ (۱)

محمد تقی میر شاعر کہ بود — مسلم و راتخت و تاج سخن
باقلیم معنی ز ارباب شعر — ستانندہ اُو بود باج سخن
زمرگش چو بے نور شد شعر، سال — نوشتم، بمردہ سراج سخن

۱۲۲۵ھ

تخرجہ (۲)

میر تقی استاد فن شعر — مُرد ز دنیا سوئے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بے سر — میر تقی استاد، رقم شد

۱۲۲۶ھ

قطعہ (۲) میں ایک عدد کا تخرجہ ہے چھبیس سے ایک کم کر دینے کے بعد پچیس رہ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ میں ہوا اور نوے سال کی عمر میں ہوا۔ اس لئے ان کا سنہ ولادت ۱۱۳۵ھ ہے۔

میر کا خاندان اور ان کے آبا و اجداد کی مختصر سرگذشت

میر کا خاندان میر کی بلند پایہ شاعرانہ شخصیت کی وجہ سے روشناس ہوا۔ اگر

---

[1] مقدمہ کلیات میر صفحہ ۸

میرؔ صاحب کو اپنی زندگی کے وسط حصہ میں ''ذکر میر'' لکھنے کا خیال نہ ہوتا تو اُن کے خاندانی احوال اور بھی پردہ خفا میں ہوتے۔ ''ذکر میر'' سے پہلے میرؔ کے والد کا صحیح نام بھی کسی کو معلوم نہ تھا۔ چنانچہ ''ذکر میر'' کی دریافت سے پہلے غالباً ان کو بندۂ خدا سمجھ کر لوگوں نے ان کا نام عبداللہ رکھ چھوڑا تھا۔ چنانچہ ''تذکرہ خوش معرکۂ زیبا''، ''تذکرہ گلِ رعنا''، ''گلزارِ ابراہیم'' اور ''آبِ حیات'' تک میں ان کے والد کا نام عبداللہ ہی مذکور ہے۔ انڈیا آفس کے ہندوستانی مخطوطات کی فہرست میں مسٹر ہارٹ نے بھی ان کا نام عبداللہ لکھا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب ''میر تقی میرؔ'' میں اس کا ذکر کیا ہے[۱] صفدر آہ کے بیان کے مطابق ۱۹۲۵ء میں ''میرؔ کے خودنوشت حالات 'ذکر میر' کے دریافت ہونے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان کے والد کا نام میر محمد علی تھا۔'' اور حسب بیان میر تقی میرؔ ان کے پیر نے ان کے تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے ''متقی'' کا خطاب عطا فرمایا تھا۔

یہ خطاب کس تقریب میں ملا تھا اس کا ذکر میرؔ نے اپنے خودنوشت سوانح ''ذکر[۲] میر'' میں کیا ہے۔ جس سے اس خطاب یافتگی کی خبر ہی نہیں ملتی بلکہ ''محمد علی'' پدر میر اور ان کے پیرومرشد شاہ کلیم اللہ اکبرآبادی کے مسلک پر بھی گہری روشنی پڑتی ہے کہ دونوں پیرومرید غالی تفضیلی شیعیت کے قریب تھے۔ کیونکہ تفضیلی صرف فضیلت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہ الشریف کو جملہ صحابہ کرام پر افضل مانتے ہیں۔ مگر کسی صحابی کا نام بے ادبی سے نہیں لیتے۔ اس واقعہ میں ان کے خطاب سے زیادہ ان کے مسلک کی وضاحت ہوتی ہے۔
'ذکر میر' میں اس طرح مذکور ہے کہ شیخ کلیم اللہ کی خدمت میں ایک روز میر صاحب کے والد ''محمد علی'' نے عرض کیا کہ آپ کی رہنمائی میں میں نے اپنے عقائد درست کر لئے ہیں۔ مگر حاکم شام (امیر معاویہ) کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ شیخ کلیم اللہ نے محض اتنے جواب پر سکوت کیا کہ ''بتاؤں گا''۔ کچھ دنوں بعد محلّہ سرائے شاہجہانی میں محرم خاں کی مسجد

---

۱ میر تقی میرؔ صفحہ ۵۳ ۲ ذکر میرؔ صفحہ ۵

میں تشریف لائے۔ آخر شب میں وضو کے لئے اٹھے تو میر کے والد محمد علی کے خدام ان کو پانی دینے کے لئے دوڑے مگر محمد علی پدر میر نے ان کو روک دیا اور خود پانی لایا اور پیر و مرشد کو وضو کرایا۔ اس وقت شاہ صاحب نے امیر معاویہ کے متعلق اپنے مسلک کا اظہار مرید کو مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ میں فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے:

''میاں[1] علی متقی، تمام عمر اس کا نام (امیر معاویہ) میری زبان پر نہیں آیا اس کے لئے میں خدا کا شکر کس طرح ادا کروں ـــــ''

اس کے بعد میر کے والد نے امیر معاویہ کے شب وستم سے نہیں بلکہ ان کا نام لینے سے ''کف لساں'' اختیار کیا۔

اس واقعہ میں ٹیپ کا بند شیخ کلیم اللہ کا انداز تخاطب ہے جس کے بعد سے ''متقی'' ان کا خطاب ہو گیا اور وہ علی متقی سے مشہور ہوئے۔

محمد علی متقی

''۱۰۸۲ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ انھوں نے علوم ظاہری کی تحصیل شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی (متوفی ۱۱۰۹ھ) سے کی اور ظاہراً انھیں کے مرید بھی ہوئے[2]۔''

میر اپنی خود نوشت سوانح 'ذکر میر' میں اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے مرجع خلائق[3] بہت بلند پایہ درویش تھے۔ مشیخت کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ عوام و خواص کی نگاہ میں اس پایہ کی کوئی اور ممتاز شخصیت نہیں تھی۔

وہ صالح اور نیک سیرت انسان تھے۔ دل میں عشق کی گرمی تھی اور علی متقی کے خطاب سے مشہور ہوئے۔

---

[1] عبارت ترجمہ میر کی آپ بیتی نثار احمد فاروقی از افکار میر صفحہ ۵

[2] میر کے مختصر حالات زندگی افکار میر صفحہ ۲۵

[3] قاضی عبدالودود اس بات کو نہیں مانتے۔

دن بھر الحاح وزاری کرتے، راتوں کو جاگتے، ان کی جبین نیاز ہر وقت بارگاہِ الٰہی میں جھکی رہتی۔ ہمیشہ شراب شوق سے سرشار رہتے۔ ان کا دامن تمام آلائشوں سے پاک تھا۔ ان کا نورانی چہرہ عابدوں کی محفل کی رونق تھا۔ وہ آفتاب تھے لیکن خلوت پسند اتنے کہ اپنے سایہ سے بھی گریزاں۔ میر کے الفاظ میں:۔

''روز حیراں کار، شب زندہ دار۔ اکثر روئے نیاز بر خاک۔ مدام مست شوق و دامن پاک۔ چہرہ نورانیش رونق افزائے بزم صبح خیزاں، آفتابے بود امااز سایۂ خود گریزاں[1]''

وہ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ ان سے اکثر خوارق و کرامات ظاہر ہوتے رہتے تھے۔ ازاں جملہ ایک مرتبہ وہ بہت پریشان حال گھر میں داخل ہوئے۔ بوڑھی ماما بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے کہا آج مجھے بہت زوروں کی بھوک لگ رہی ہے، اگر تھوڑی روٹی مل جائے تو جان میں جان آئے۔ ماما نے کہا گھر میں کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے پھر کہا کہ بھوک بے حد ہے۔ ناچار ماما اٹھی۔ بنئے کی دوکان سے آٹا اور گھی لایا تاکہ روٹی پکائے۔ مگر ان کا اضطراب بڑھتا ہی رہا۔ انھوں نے شدت گرسنگی کی پھر شکایت کی تو ماما جھنجھلا اٹھی اور ترخ کر بولی۔ ''صاحب یہ فقیری ہے یہاں نازنخرے نہیں چلتے۔'' انھوں نے جواب میں کہا۔ ''تو دل جمعی سے روٹی پکا میں ایک فقیر سے ملنے لاہور جارہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اپنا گریہ نیم شبی سے تربتر رومال اٹھایا اور لاہور روانہ ہوگئے۔ راہ کی کلفتیں برداشت کرتے ہوئے لاہور پہنچے۔ راہ میں رزق من جانب اللہ ملتا رہا۔ لاہور پہنچ کر اس فقیر نما مکار سے ملے اور اس کی مکاری کا پردہ چاک کر کے ایک فقیر کے تکیہ میں شب بسر کی۔ پھر لاہور سے واپس ہوئے اور دہلی پہنچ کر شیخ عبدالعزیز عزت کے بیٹے قمرالدین خاں کے مکان پر قیام کیا۔ یہ صوبے کے دیوان تھے۔ اور میر علی متقی سے ان کی کچھ قرابت مندی بھی تھی۔ آمد کی خبر سن کر خلقت

---

[1] ذکر میر صفحہ ٦

ٹوٹ پڑی۔ بہت لوگ اس مرد خدا مست (علی متقی) سے مرید ہوئے۔

عقیدت مند وضو کا بچا ہوا پانی لے جاتے، بیماروں کو پلاتے اور بیمار صحت یاب ہوتے۔ ان کی آمد کی خبر اتنی عام ہوئی کہ رؤسائے شہر ان سے ملنے کے متمنی تھے۔ مگر انھوں نے دولت مندوں سے ملنا پسند نہیں کیا اور یہ کہا کہ ''میں فقیر ہوں اور آپ امیر، میرا آپ کا میل کیا۔'' شہر کے تمام رؤسا میں صرف امیر الامرا صمصام الدولہ کو قدیم تعلقات کی بنا پر ملنے کی اجازت دی۔ مگر خلقت کے ہجوم سے تنگ آ کر ایک روز تہجد کے وقت اٹھے، نماز پڑھی اور شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اکبر آباد پہنچنے سے پہلے بیانہ جو شرفا و سادات کی بستی ہے وہاں قیام فرمایا۔

سیّد امان اللہ

بیانہ میں ایک حسین و خوش رو نوجوان سید امان اللہ تھے۔ جس روز یہ بیانہ میں وارد ہوئے اس روز ان کی شادی ہونے والی تھی۔ ان پر جو نظر پڑی تو ان پر جذبی کیفیت طاری ہو گئی۔ گھر والے بہت پریشان ہوئے اور سمجھے کہ یہ شیخ کی نظر کیمیا اثر کا کرشمہ ہے۔ بہت خوشامد کی کہ حضرت رحم فرمایئے۔ انھوں نے پانی منگوا کر دم کیا اور وہ پانی پلایا گیا تو سید امان اللہ آپے میں آئے۔ بہت آرزو منت کر کے شیخ کو گھر لے گئے۔ وہاں انھوں نے پانی پیا۔ کھانا تناول فرمایا۔ برات میں چلنے کے لئے سید امان اللہ مصر ہوئے تو انھوں نے شادی کی مذمت کی اور کہا کہ شادی اللہ کی راہ میں بہت حارج ہوتی ہے۔ میں بھی کبھی اس پھندے میں گرفتار تھا، مگر اب آزاد ہوں اور شمع وار ایک پاؤں پر کھڑا عشق الٰہی میں جل رہا ہوں۔ تم غزال رعنا ہو اس جال سے رم کر کے بھاگ نہیں سکتے۔ اگر عقل سلیم ہے تو اس نکتہ کو سمجھ لو کہ اللہ بس باقی ہوس۔

غرض اُدھر برات گئی اور اِدھر یہ بیانہ سے اُٹھے اور اکبر آباد آ کر اپنے گھر میں مقیم ہوئے۔ جب برات واپس آئی اور سید امان اللہ کو معلوم ہوا کہ درویش یہاں سے چلے گئے تو سخت پریشان ہوئے۔ مشکل یہ تھی کہ نہ شیخ کا نام معلوم کیا تھا نہ مقام۔ بہت سراسیمہ ہوئے

کہ کیا کیا جائے۔ ایک عالم جنون ان پر طاری تھا۔ تن بہ تقدیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میدانوں، بیابانوں اور جنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ آخر حضرت خضر کی طرف رجوع کیا اور ان کی معاونت سے نام و مقام معلوم کر کے اکبر آباد پہنچے، جناب علی متقی درویش حق آگاہ نے ان کی بہت پذیرائی کی اور یہ کہا کہ ''جس مصیبت کے بعد تم یہاں تک پہنچے ہو، تو اب واپس جانے کی ضرورت نہیں۔ اسی گھر کو اپنا گھر سمجھو اور میری اولاد کو اپنی اولاد۔ خوش ہو کہ تم نے اپنی نہر حیات کا رشتہ ایک عجیب دریا سے جوڑ لیا ہے۔ اب دل جمع ہو جاؤ اور دروازہ بند کر کے سب سے قطع تعلق کر لو۔ تھوڑے دن آپ میں گم رہو تا کہ خدا کو اپنی طرف کھینچ سکو۔''

اس ترک و تجرید کی تعلیم کے بعد سید امان اللہ کسب سلوک میں مشغول ہو گئے۔ اور کچھ ہی دنوں میں ایسے درویش کامل ہوئے کہ خلقت کا ہجوم ان کے دروازے پر رہنے لگا۔ مگر یہ دروازہ نہ کھولتے تھے۔ ایک مدت کے بعد شیخ نے حکم دیا کہ اب خلوت سے جلوت میں آؤ، مخلوق کو تمہاری ضرورت ہے۔ اس کے بعد سے وہ خدمت خلق میں مشغول ہوئے۔ یہ اکبر آباد میں علی متقی کے فیض صحبت کا لطف لے رہے تھے۔ ادھر بیانہ میں ان کی بیوی مفارقت کی کلفت برداشت کر کے تپ دق میں مبتلا ہو گئیں اور ملک عدم کو سدھار گئیں۔ اب غزال رعنا کو پھندا توڑنے کے لئے کسی رمیدگی کی ضرورت نہیں رہی۔ قضائے الٰہی سے دام خود ہی شکستہ ہو چکا تھا اور غزال رعنا آزاد۔ سید امان اللہ دل جمعی کے ساتھ رہنے لگے۔ علی متقی ان کو برادر عزیز کہتے اور معرفت کا ایک ایک باب روزانہ ان پر کھلتا۔ یہاں تک کہ کرامتوں کا صدور ان سے ہونے لگا۔

یہ تمام واقعات جو ''ذکرِ میر[1]'' سے بیان کئے گئے ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ میر کے والد متقی اپنے وقت کے درویش کامل اور صاحب حلقہ مشائخ تھے۔

---

[1] ذکرِ میر صفحہ ۱۸۔ لیکن باپ کے بارے میں بیٹے کا بیان اتنا مستند نہیں سمجھا جاتا، یہ خیال قاضی عبدالودود کا ہے۔

علی متقی کا عقیدہ

میر کے والد ابتدا میں سنی حنفی تھے، لیکن وہ اپنے استاد پیر شیخ کلیم اللہ اکبرآبادی کی تربیت میں رہ کر رفتہ رفتہ تفضیلی ہو گئے اور یہ تفضیلیت شیعیت کی سرحد کو چھو گئی تھی کیونکہ سنی تفضیلی صرف فضیلت خلیفۂ چہارم سیدنا علی کرم اللہ وجہ الشریف کے قائل ہیں مگر امیر معاویہ کے متعلق ان کا عقیدہ ''کف لسان'' یعنی ''زبان بندی'' ہے اور اس موضوع پر بحث و مباحثہ کرنے کی بجائے ان کا اصول ہے ؏

بیا ایں داوری ہا را بہ پیش داور ندادیم

لیکن علی متقی کے خطاب ''متقی'' کے سلسلہ میں جو حکایت میر صاحب کی زبانی ان کے خود نوشت حالات ''ذکر میر'' سے نقل کی گئی ہے جس کا ذکر اوراق گذشتہ میں بھی آچکا ہے وہ تفضیلی سنی کے بھی مسلک کے خلاف ہے۔ کیونکہ تفضیلی سنی اس حد تک آگے نہیں گئے ہیں کہ ان کا نام لینا بھی گناہ عظیم سمجھیں۔

علی متقی کے نصائح

میر نے والد کی نصیحتوں کو اپنی قادر الکلامی و شگفتہ بیانی سے بہت قیمتی ادب پاروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

(۱) ''اے پسر عالم از یک ہنگامہ بیش نیست۔ باید کہ بدیں آستیں بیفشانی، وگرد علائق بر دامن خود نیفشانی، عشق الٰہی راپیشہ خود کن، و روزے کہ پیش است اندیشہ خود کن، ہر کہ اہل است می داند کہ دنیا سہل است زندگانی وہم است۔ بنابر وہم گزاشتن آب رادر ریسماں بستن است، و درفسحت اہل بودن مہتاب رابہ گز پیمودن۔''[۱]

---

[۱] ذکر میر صفحہ ۶

(۲) ''معیت حق بہ خلق چوں معیت روح است بہ جسم، ترا بے او وجودے نہ، واورا بے تو نمودے نہ، عالم پیش ازظہور عین او بود، بعد از ظہوراو عین عالم است ....''[۱]

(۳) ''عندلیب گلے باش کہ ہمہ بہار است، آں سادۂ شوکہ یک پرکار است، آسماں رورنگ دررنگ ندارد کے شباب، فرصت غنیمت شمارد خودرادریاک.......''[۲]

ان نصائح سے ''علی متقی'' کے علمی مقام کا اندازہ ہوتا ہے۔اس کا پتہ چلتا ہے کہ وہ فقرا اور درویشوں کی صحبت اٹھائے ہوئے ایک ذی علم درویش تھے اور ان کی ذات سے دوسروں نے بھی فائدہ اٹھایا۔علاوہ ازیں اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ اپنے مریدوں کو اس کی بھی اجازت دیتے تھے کہ وہ دوسرے مشائخ کی خدمت میں جائیں یا ان سے استفادہ کریں۔چنانچہ 'ذکر میر' میں سید امان اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک بزرگ حسان اللہ سے ملنے جایا کرتے تھے اور مستفیض ہوتے تھے۔ ''تلخیص ذکر میر'' مرتبہ نثار احمد فاروقی میں یہ واقعہ اردو میں اس طرح مذکور ہے۔ذکر میر کی اصلی فارسی عبارت نقل کرنے کی بجائے بمقتضائے ضرورت اردو ہی میں لکھ دینا مناسب ہے:۔

''درویش جگر ریش (میر امان اللہ) ہفتہ میں ایک بار احسان اللہ نامی ایک فقیر سے، جو مرد آزاد تھا، ملاقات کرنے جایا کرتے تھے۔آگرے میں عیدگاہ کے اس پار ایک محلّہ 'فقیر کا تکیہ' تھا وہاں ان کا صاف ستھرا بلند چہار دیواری کا مکان تھا جس کے دروازہ پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

خاطر آسودہ خواہی رہ آرشد بہ بند
چاک در پیراہن دیوار از دست دراست

---

۱ ذکر میر صفحہ ۷ ۲ ذکر میر صفحہ ۸

جو کوئی ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا اور آواز دیتا تو خود آتے اور جواب دیتے

''احسان اللہ گھر مین نہیں ہے جلدی جاؤ یہ گھر خالی ہے۔'' [۱]

ایک بار سیّد امان اللہ ملنے گئے۔ میرؔ ان کے ساتھ تھے۔ حسب معمول جواب ملا۔ ''احسان اللہ گھر میں نہیں۔'' سیّد امان اللہ نے جواب دیا ''اگر احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ ہے۔'' ہنسے اور دروازہ کھول دیا اور بہت گرم جوشی سے ملے۔

میرؔ ان بزرگ کی ہیئت و شکل کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں:-

''ایک گٹھے ہوئے متناسب جسم کا جوان ہے، خورشید سوار، جس کی پیشانی سے ہیبت حق نمودار ہے۔ اکہری چادر اوڑھے، لنگی باندھے نہایت پُر ہیبت سرخ آنکھیں گویا شیر عشق الٰہی ان کے در پر سو رہا ہے۔'' [۲]

احسان اللہ درویش کے کچھ ملفوظات بھی میرؔ نے ''ذکر میر'' میں نقل کئے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

''اے یار عزیز دل اگر غم گین ہے تو مبارک ہے۔ غم اگر گداز ہے تو اچھا ہے۔ درویش دل محزوں تلاش کرتے ہیں نہ شائستہ طرب۔ جان دردمند چاہتے ہیں نہ درماں طلب۔ روئے نیاز اس کی طرف رکھو، جو بے نیاز ہے۔ سب کام اسے سونپ دو جو کارساز ہے۔ گوشہ نشیں ہو جاؤ اور توکل کرو۔ اپنے اندر کھو جاؤ اور تامل کرو۔ اگر جان میں نیاز پیدا ہو جائے تو عنقا ہے۔ دل اگر گداز ہو جائے تو کیمیا ہے۔

اے عزیز وہ یکتا پیرہن معشوق جس میں رنگ چاہتا ہے، نمودار ہو جاتا ہے۔ کبھی پھول ہے کبھی رنگ۔ کہیں لعل ہے کہیں سنگ۔ کچھ لوگ پھول سے جی خوش کر لیتے ہیں۔ بعض رنگ سے عشق کرتے ہیں۔ ایک جماعت لعل کو معتبر جانتی ہے تو دوسری پتھر کو خدا مانتی ہے۔

خبردار کہ یہ غور کرنے کا مقام ہے۔ایسی آنکھ ہونی چاہئے کہ جو ماسوا
کی طرف نہ اٹھے اور وہ دل درکار ہے جو اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔دشمن
اور دوست سب اسی کے ہیں۔کیونکہ دلوں پر اس کا تصرف ہے۔
ہدایت و گمراہی دونوں اسی کے مظہر ہیں۔مست و ہشیار سب اسی کو
ڈھونڈتے ہیں۔محراب اس کے ابرو سے پیدا ہے۔میخانہ اس کی آنکھ
سے ہویدا ہے۔زاہدان مناجاتی عبادت و طاعت کرتے ہیں۔
رندان خراباتی جام لنڈھاتے ہیں۔محراب میں سر جھکانا چاہئے اور
خرابات میں رندانہ وضع سے آنا چاہئے۔یعنی ہر موقع کی رعایت اور
مرتبہ کا لحاظ ضروری ہے۔" [۱]

علی متقی کا مقام

علی متقی کا مقام ان کے معاصرین کی نگاہ میں بہت بلند تھا۔اس کے ثبوت میں میر
صاحب "ذکر میر" میں لکھتے ہیں کہ ایک درویش بایزید تھے جن کی ملاقات کو سید امان اللہ جایا
کرتے تھے۔ایک مرتبہ جانے لگے تو میر تقی میر کو بھی ساتھ لے لیا۔یہ اس وقت بہت کم سن تھے
شیخ بایزید بہت شفقت سے پیش آئے اور سید امان اللہ جن کی تربیت میں میر صاحب تھے ان
سے پوچھا یہ بچہ کون ہے؟ جب یہ معلوم ہوا کہ یہ علی متقی کا فرزند ہے تو فرمانے لگے:۔

"اوہ! پھر تم سے کیا پوچھنا۔اس بچے کے والد تو بڑے دانائے اسرار
بزرگ ہیں۔وہ آسمان درویشی کے خورشید، مشہور جہاں، بلکہ
جان درویشی ہیں۔ایسا دریا ہیں جن کی تہہ سے قیمتی موتی نکلتے ہیں۔ہم
فقیر تو بے مایہ ہیں، ہم سے کیا بن پڑتا ہے۔میاں لڑکے میری طرف

---

[۱] افکار میر صفحہ ۶۵

سے سلام و نیاز کے بعد کہنا کہ یہ شوق بے پایاں کی کوتاہی نہیں جواب
تک حاضر نہیں ہو سکا بلکہ شکستہ پائی اور وقت کی نایاوری ہے ....
آپ بڑے بزرگ ہیں آپ کی نسبت چھوٹا ہوں ۔ مجھ ایسے بے سروپا
کے لئے کسی خاص وقت میں دعا فرمائیے۔''

یہ وہی بزرگ ہیں جن کی پہلی ملاقات کے بعد جب سید امان اللہ نے ان کے احوال قلندرانہ بیان کئے تھے تو جناب علی متقی نے ان کے وصف میں فرمایا تھا۔ ع

''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است''

علی متقی کے ایک پیر بھائی اسد اللہ تاجر اپنے خواب کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے پیر نے خواب میں بشارت دی کہ تم علی متقی سے مل کر اپنے حق میں دعا کراؤ تمہاری معاشی تنگی دور ہو جائے گی، جس سے یہ معلوم ہوا کہ خود ان کے معاصر اور اخوان طریقت بھی ان کو مستجاب الدعوات مانتے تھے۔[1]

میر صاحب نے اپنے والد کی ولایت اور خدا رسی کی تعریف بہت کی ہے۔ لیکن چونکہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں مشتبہ سمجھی جاتی ہے اس لئے محققین کو دیگر شواہد کی تلاش ہے۔۔ مگر افسوس یہ ہے کہ کسی دوسرے واسطے سے کوئی سراغ نہیں ملتا۔ قاضی عبدالودود صاحب ان کے والد کے لقب ''متقی'' پر لکھتے ہیں:۔

''قرینہ ہے یہ لقب (متقی) خود میر کا دیا ہوا ہے۔ ذکر میر میں یہ ایک
درویش کامل کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں جو شہرہ آفاق بھی تھے۔ ان
کی ولایت کا حال وہی جانیں۔ ''شہرہ آفاق ہونا'' محض غلط ہے۔ 'ذکر
میر' نہ ہوتی تو آج ان کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔ آبا و اجداد
سے متعلق فسانہ طرازی پہلے بھی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔''

---

[1] افکار میر صفحہ ۷۱

قاضی عبدالودود صاحب کا دوسرا اعتراض یہ بھی ہے کہ جس ہستی کے شہرہ آفاق اور مشہور صاحب سلسلہ بزرگ ہونے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے اس کا تذکرہ نہ اولیاء اللہ کے کسی تذکرہ میں ملتا ہے اور نہ کہیں کوئی ملفوظ ہی ان کا پایا جاتا ہے اس لئے یہ تمام مراتب و مقام خود میر ہی کے عنایت کردہ معلوم ہوتے ہیں۔

صفدر آہ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

''ہمارے سامنے بیسیوں ایسی مثالیں ہیں کہ بعض فقراء اور شعراء اور اطبا اپنے عہد کے مرجع خلائق بنے ہوئے تھے۔لیکن مرنے کے کچھ دنوں کے بعد دنیا ان کا نام تک بھول گئی۔علی متقی بھی اسی قسم کے درویش ہو سکتے ہیں۔''

''اگر علی متقی سچ مچ بڑے درویش نہ ہوتے تو خواجہ باسط کے ایسا بڑا صوفی ان کے گیارہ سال کے یتیم لڑکے محمد تقی کو لے کر صمصام الدولہ کے پاس کبھی نہ جاتا اور پھر صمصام الدولہ کی سرکار سے میر کو گھر بیٹھے پانچ سال تک ایک روپیہ یومیہ یعنی تیس روپے ماہوار کا وظیفہ ملنا بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ صمصام الدولہ کی نظر میں علی متقی کا کافی احترام تھا۔لکھنؤ جانے سے پہلے دتی میں نوکری کر کے بھی میر کبھی پچیس روپیہ مہینہ سے زیادہ نہ کما سکے۔''

اس کے بعد میر نے اپنے والد کی صورت و سیرت کی جو قلمی مرقع کشی کی ہے اور جس کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب کے خیال میں ''محض فسانہ طرازی'' اور ''مبالغہ آمیزی'' ہے۔اس کے بارے میں صفدر آہ چند مختصر نمونے پیش کرنے کے بعد اپنا محاکمہ پیش کرتے ہیں:۔

''ان خیالات کو باپ کے لئے مبالغہ کہہ کر نظر انداز کر دینا درست نہیں ہے۔اس زمانہ میں مبالغہ طرازی، انشاپردازی کا حسن سمجھی جاتی تھی۔

میرؔ کا یہی رنگ انشا ہم ان کی دوسری تحریروں میں بھی پاتے ہیں، جو دوسروں کے متعلق ہیں۔ لیکن ایک بات بالکل واضح ہے کہ میرؔ اپنے والد کی شخصیت سے غیر معمولی طور پر متاثر ہیں۔

میرؔ کے والد نے چونسٹھ سال کی عمر میں انتقال کیا، جب میرؔ گیارہ سال کے تھے۔ میرؔ نے چھ سات سال کی عمر میں جب ہوش سنبھالا ہوگا تو ان کے والد ساٹھ سال کے ہوں گے۔ ذاتی اوصاف درویشی کے علاوہ بھی ان کی عمر نے ان کی شخصیت کو اور پُر اثر بنا دیا ہوگا۔ شفقت پدری کے ساتھ اس زمانے کی پوشاک میں جب ایک کم سن بچہ انہیں دیکھتا ہوگا تو وہ مسحور ہو جاتا ہوگا۔ یہی میرؔ کے ساتھ بھی ہوا جس کا اثر ان کی تحریر سے ظاہر ہو رہا ہے۔''

میرؔ کے والد کی نصیحتیں بھی ''جو بلا شبہ بیش قیمت ادب پارے ہیں، ان کی کمال درویشی کی سند میں پیش کی گئی ہیں۔ لیکن آخری بات جو صفدر نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ:

''میر علی متقی کے مرتبے کے تعین کرنے کے لئے میرؔ کی شہادت کے علاوہ اور کوئی چیز موجود نہیں ہے.... جب اس کے خلاف واضح شہادتیں نہ ملیں باپ کے متعلق بیٹے کی شہادت کو درست نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔''[1]

راقم کے خیال میں بیٹے کی شہادت باپ کے متعلق کوئی ضروری نہیں کہ غلط ہی ہو۔ مبالغہ آمیزی ممکن ہے۔ جس میں محبت پدری کے عناصر کی کارفرمائی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کا تذکرہ ہو رہا ہے جو شہرہ آفاق ہے، اپنا ایک حلقہ رکھتی ہے۔ لیکن اس کے قریب سے دور تک کہیں اس کا ضمنی ذکر بھی نہ ملے، حیرت انگیز ضرور ہے اور لازماً شک پیدا کرتا ہے۔

---

[1] میر اور میریات صفحہ ۱۷

میر کا بچپن، تعلیم وتربیت

میرؔ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''ذکر میر'' میں بھی اپنی تعلیم کے متعلق کوئی واضح بیان نہیں دیا ہے۔ جس وقت ان کے والد کا انتقال ہوا، ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی۔ اس اثنا میں انہوں نے ابتدائی تعلیم میں کلام پاک پڑھا۔ اپنے والد سے بھی کچھ تعلیم حاصل کی اس کی وضاحت نہیں ملتی ہے۔ میرؔ کے والد کے انتقال سے پہلے ہی سید امان اللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ سات سال کی عمر سے میرؔ نے تعلیمی سلسلہ شروع کیا۔ دس برس کی عمر تک کلام پاک ختم کیا۔ ممکن ہے اس اثنا میں کچھ ابتدائی درسیات کی بعض کتابیں بھی پڑھی ہوں۔ میرؔ کے والد میرؔ کے بیان کے مطابق دس برس کی عمر میں بہت اہم نصیحتیں بھی کر دیا کرتے تھے جس طرح کسی باشعور شخص کو نصیحت کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ سید امان اللہ کی موت سے میں بہت مغموم ورنجیدہ رہا کرتا تھا یہ بات میرے والد کو بہت دکھ دیتی تھی وہ مجھے صبر کی تلقین فرماتے تھے کہ :-

> ''اے پسر من ترا بسیار می خواہم۔ اما ازین غم می کاہم کہ من نیز بر سرِ راہم۔ گاہ میگفت کہ ماہ من نہ طفل ہالۂ الحمد للہ کہ دہ سالۂ۔ چہ بہ کاہش افتادۂ آخر درویش زادۂ۔ دل قوی دار و وخود را بخدا سپار۔'' [۱]

میرؔ کی تعلیم ابھی ابتدائی مراحل میں بھی کسی خاص حد تک نہ پہنچ سکی تھی کہ قضائے الٰہی سے ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ان کے والد مرض موت میں مبتلا ہوئے۔ امید زیست منقطع ہوگئی۔ اس لئے انہوں نے چاہا کہ بچوں کو وصیت کر دیں اور اپنی زندگی میں ہی اشیائے متروکہ تقسیم کر دیں۔ اس خیال سے انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں یعنی حافظ محمد حسن اور محمد تقی کو بلایا اور یہ کہا کہ ''میں فقیر و درویش ہوں میرے پاس نہ نقد و جنس ہے نہ کوئی زمین و

---

[۱] ذکر میر

جائداد، لے دے کر صرف تین سو کتابیں ہیں۔ لاؤ انہیں تقسیم کردوں۔'' مگر ان کے بڑے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن کی نیت صاف نہ تھی۔ انھوں نے کہا کہ ''ابھی سے ان کتابوں کو تقسیم کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ (میر) ابھی بچہ ہے۔ کتابوں کی قدر و قیمت کو کیا سمجھے گا، ضائع کردے گا، کاغذ کے اوراق پھاڑ کر کاغذ کی ناؤ بنائے گا۔ اس لئے ان کتابوں کو میری حفاظت میں رہنے دیجئے۔ میں ابھی طالب علم ہوں۔ کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔'' مگر میر کے والد کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے یہ سمجھا کہ یہ محمد تقی محروم وراثت رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ ان کو غصہ آ گیا وہ محمد حسن کی بدمزاجی اور نیت کے فتور سے واقف تھے۔ اس جواب سے کچھ ایسے برافروختہ ہوئے کہ طعن و تشنیع سے بھی نہ رک سکے۔ میر لکھتے ہیں:-

''[1] پدر از مزاج ناساز او باخبر بود۔ شانہ گیر شد و گفت چہ ترک لباس کردہ۔ لیکن کج پلاسی تو ہنوز نرفتہ است می خواہی طفلان بیچارہ را بازمی دہی و پس از مرگ دل بخرابی ایشاں نہی۔ دانستہ باش کہ حق تعالیٰ غیور است۔ وغیور را دوست میدارد۔ غالب کہ میر محمد تقی دست نگر تو نمی شود۔ اگر نوع دیگر پیش خواہی آمد کاسہ بر سرت خواہد شکست......''

وہ برافروختگی میں یہاں تک کہہ گئے کہ ''ایک جلد کتاب کے لئے یہ تمہاری کھال تک کھینچ لے گا۔ اس کے مقابلے میں تمہارا رنگ نہیں جم سکتا تمہاری نیت میں فتور ہے تو جاؤ یہ سب کتابیں تم خود رکھ لو۔''

اس کے بعد میر کے والد نے میر سے کہا۔ ''میں بازار کے بنیوں کا تین سو روپیوں کا مقروض ہوں۔ جب تک وہ ادا نہ کرلو میری تجہیز و تکفین نہ کرنا۔''

میر صاحب نے عرض کیا۔ گھر کا اثاثہ تو صرف یہی کتابیں تھیں، جو بھائی جان کی ملک میں آ گئیں۔ اب مجھ سے قرض ادا کرنے کی کیا شکل ہوگی؟ انھوں نے کہا گھبراؤ مت اللہ مسبب الاسباب ہے۔ روپیہ آتا ہے، ہنڈی چل چکی ہے اور اور ابھی راہ میں ہے۔ میری

---

[1] ذکر میر صفحہ ۵۹

زندگی میں آجاتی تو اچھا تھا، مگر مجھے امید نہیں، کیونکہ میرا وقت قریب ہے، اس لئے اب خدا حافظ کہتا ہوں۔

مختصر یہ کہ ہنڈی سے پہلے ہی میر محمد علی متقی اس دنیا سے سدھار گئے۔ یہ وقت میرؔ کے لئے انتہائی ابتلا و آزمائش کا تھا۔ باپ کی موت کا صدمہ، افلاس و ناداری، تجہیز و تکفین کا سامان نہیں، باپ کی وصیت کا پاس، ادائے قرض کی فکر۔ نظر کے سامنے تاریکی ہی تاریکی تھی۔ اس پر بڑے سوتیلے بھائی محمد حسن کی طوطا چشمی۔ جب کسی نے ان کو حالات کی طرف متوجہ کیا تو بقول میرؔ کہنے لگے ''کسانیکہ ہم گیر نازونعم بودند۔ آنہا دانند و کارہائے آنہا، من در حیات پدر دخیل کارے نگشتم، از وقف اولادی ہم گزشتم۔ سجادہ نشینان او سلامت باشند سر را می کنند، وجہ می خراشند، آنچہ مصلحت خواہد بود۔ خواہند نمود۔''

جب بڑے بھائی نے دوٹوک جواب دے دیا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ ان کے سجادہ نشیناں جانیں۔ چاہے اپنا سر پھوڑیں یا منہ نوچیں۔ جو مصلحت ہوگی کریں گے۔ میں نہ باپ کی زندگی میں ان کے کاموں میں دخیل تھا نہ بعد میں ہوں۔ میں وقف علی الاولاد سے بھی ہاتھ اٹھا چکا ہوں۔

اس اثنا میں بازار کے کچھ افراد جو علی متقی سے عقیدت رکھتے ہوں یا میرؔ کی بے بسی پر انہیں رحم آ گیا ہو وہ دو سو روپے لے کر آئے لیکن میرؔ صاحب نے والد کی نصیحت کا پاس رکھتے ہوئے وہ روپے نہیں لئے۔ یہاں تک کہ سید مکمل خاں کا آدمی پانسو کی ہنڈی لایا۔ اس روپے سے پہلے بنئے کا قرض چکایا گیا۔ بقیہ دو سو روپے مرحوم کی تجہیز و تکفین میں صرف ہوئے۔

باپ کی موت میرؔ کے لئے ایک سانحہ عظیم تھی، کوئی سرپرست نہ تھا۔ بقول میرؔ کے بھائی نے بھی نہ صرف یہ کہ کنارہ کشی اختیار کی بلکہ درپے آزار بھی ہو گئے۔ جب کوئی چارہ نظر نہ آیا تو مجبوراً میرؔ کو تلاش معاش کی ضرورت پیش آئی۔ گھر کی ضرورتوں کا متکفل اپنے چھوٹے بھائی کو بنا کر خود تلاش معاش میں نکلے۔ پہلے اکبر آباد میں سرگرداں

رہے۔ لیکن جب وہاں کامیابی نہ ہوئی تو ترک وطن کر کے دہلی کا رخ کیا۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:۔

"[1] خدائے کریم مرا شرمندۂ احسان کسے نکرد۔ و دست نگر برادر کہ سر بہ سرِ من داشت نساخت۔ نقل ماتم درویش قسمت ساختم۔ کار را بہ لطف خداوند انداختم۔ دم خود را بہ برادر خورد سپرد بہ تلاش روزگار در اطراف شہر استخواں شکستم، لیکن طرفے نہ بستم۔ یعنی چارہ کار در وطن نیافتم۔ ناچار بغربت شتافتم۔ رنج راہ بر خود ہموار کردم۔ شدائد سفر اختیار کردم۔ بہ شاہجہاں باد دہلی رسیدم۔ بسیار گردیدم شفیقے ندیدم۔"

تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، بس اتنا غور کر لینا کافی ہے کہ ایک گیارہ سال کا بچہ ایک ہوش مند اور تجربہ کار انسان کی طرح باپ کے مرنے کے بعد اس کی وصیتوں پر عمل کرتا ہے۔ جملہ مراسم موتی کو ادا کر کے اپنے چھوٹے بھائی کو، جو زیادہ سے زیادہ نو برس کا ہوگا، گھر کی کفالت سپرد کر کے خود تلاش معاش میں نکلتا ہے۔ جب اپنے وطن میں کوئی صورت نہیں نکلتی تو تن تنہا پیادہ آگرے سے دہلی کا سفر کرتا ہے۔ وہ بھی اس زمانے میں جبکہ راہیں محفوظ و مامون نہ تھیں۔ قافلے لٹ جاتے تھے۔ بڑے بھائی تو دشمن تھے۔ مگر قرابت اور عزیز داری میں ایک متنفس بھی نہ تھا جو میرؔ کو ایسے سخت اقدام سے روکتا۔ دراصل میرؔ اپنی غیر معمولی اہلیت کے اظہار میں درایت کو بھول جاتے ہیں اور جو بات بھی ان کو ایسی نظر آتی ہے جس میں انوکھا پن ہو، بے تکان بول جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی روایتیں پایۂ اختیار سے گر جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرؔ نے اپنی عمر دانستہ اتنی کم بتائی ہے کہ انسان کو اچنبھے میں ڈال دے۔ جو واقعات میرؔ نے بیان کئے ہیں اگر وہ حرف بہ حرف درست ہیں تو ہرگز وہ اتنی کم عمری کے واقعات نہیں ہیں۔ وہ اس وقت

---

[1] ذکر میر

باشعور ہوں گے۔ "نوادر الکملا"[1] میں باپ کے انتقال کے وقت ان کی عمر سترہ سال کی لکھی ہے "بعد واقعہ ہائلۂ پدر بزرگوار بہ عمر ہفدہ سالگی در دہلی رفت۔" یہ بات یک گونہ عقل لگتی معلوم ہوتی ہے۔

دہلی کا سفر

میر صاحب صعوبت برداشت کرتے ہوئے دہلی پہنچ گئے۔ دہلی میں کہاں مقیم ہوئے اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ مگر قرائن شاہد ہیں کہ سراج الدین خاں آرزو، جوان کے سوتیلے ماموں تھے، انھیں کے یہاں مقیم رہ کر فکر معاش میں سرگرداں رہے ہوں۔ کسی طرح ایک روز خواجہ باسط جو صمصام الدولہ کے بھتیجے تھے، ان کی ملاقات ہوگئی۔ وہ میر کی پریشان حالی سے متاثر ہوئے اور ان کو لے کر صمصام الدولہ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے پوچھا یہ کون لڑکا ہے؟ خواجہ باسط نے کہا۔ "میر محمد علی" کے فرزند ہیں۔ وہ سمجھ گئے کہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ بہت اظہار تاسف کیا اور یہ کہتے ہوئے کہ "ان کے مجھ پر بہت حقوق ہیں" ایک روپیہ یومیہ مقرر کردیا۔ میر صاحب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ زبانی گفتگو ہے۔ مبادا کیا اتفاق ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ تحریری فرمان حاصل کرلیا جائے۔ انھوں نے جیب سے عرضی نکالی اور دستخط کی درخواست کی۔ اس سلسلے کے ضمن میں میر لکھا ہے کہ جب میں نے دستخط کے لئے عرضی پیش کی تو نواب نے ٹال مٹول کے لئے یہ کہا کہ "وقت قلمدان نیست" میر صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے ہنسی آگئی۔ پوچھنے لگے کیوں ہنسے؟ میں نے کہا آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر یہ کہتے کہ "قلمدان بردار نہیں" یا یہ دستخط کا وقت نہیں" تو یہ ایک بات ہوتی۔ قلمدان کوئی جاندار نہیں کہ اس کے آنے نہ آنے کا کوئی وقت مقرر ہو۔ "وقت قلمدان نیست" یہ نئی ترکیب ہے، جس نوکر سے فرمایئے ابھی لاکر حاضر کردے گا۔"

اگرچہ یہ بے باکانہ گرفت خلاف ادب ضرور تھی۔ مگر بات مزے کی تھی، میر کی

---

[1] مقدمہ کلیات صفحہ ۱۳

جرأت مندی اور علمی مذاق کی شاہد بھی۔ نواب کو بھی ہنسی آ گئی۔ فوراً قلمدان منگوایا اور عرضی پر دستخط کر دیا[1]۔ اب معاش کی جانب سے ان کو سکون حاصل ہوا اور تعلیم حاصل کرنے کی جانب متوجہ ہوئے۔

خان آرزو[2] کا مکان علم و فضل کا مرکز تھا۔ اہل علم کی محفلیں ہر وقت گرم رہتی تھیں۔ میر صاحب کو ان کی علمی صحبت سے پوری طرح استفادہ کا موقع ملا اور چند سالوں میں انھوں نے فارسی پر اتنی دست رس حاصل کر لی کہ اس میں شعر موزوں کرنے لگے، جو خان آرزو کی اصلاح سے اور بھی چمک جاتے۔ اس اثنا میں دو اور شخصیتوں کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہہ کیا۔ ایک عظیم آباد کے رہنے والے میر جعفر جن کے متعلق مزید معلومات نہیں ملتی بجز اس کے کہ میر صاحب نے ان سے بھی کچھ سیکھا۔ میر فرماتے ہیں ''وہ سر کھپا کر مجھے پڑھاتے اور میں تا مقدور ان کی خدمت کرتا۔ دوسرے سعادت علی امروہوی تھے۔ ان سے میر نے کیا سیکھا اس کا ذکر نہیں۔ مگر ان کی ہدایت سے ریختہ میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ اب محنت و مشقت کے بعد میر صاحب اہل علم کی مجلسوں میں پوری طرح روشناس ہو چکے تھے۔ کلام کی مقبولیت خواص کے حلقہ سے نکل کر عوام تک پہنچ چکی تھی۔

ذریعہ معاش

باپ کے مرنے کے بعد سب سے پہلے امیر الامراء صمصام الدولہ کی سرکار سے ایک روپیہ یومیہ کا وظیفہ مقرر رہا جس سے بسر اوقات کی شکل ہو گئی۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے:-

''آں روزینہ می یافتم نان و نمک می خوردم و بسر می بردم۔''

۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کے حملہ کے زمانہ میں صمصام الدولہ مارے گئے۔ اور میر پھر پریشان حال ہو گئے۔ بصورت موجودہ دہلی میں پھر کوئی شکل نہ بن سکی تو اکبر آباد چلے گئے مگر نہ معلوم اس مرتبہ ان سے کیا ایسی حرکت سرزد ہوئی کہ سارا شہر ان سے کھنچ گیا۔ یہاں تک کہ

---

۱ یہ پوری بات قاضی عبدالودود کے نزدیک مجہول ہے۔

۲ میر خود خان آرزو کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، جب ان سے ان بن ہو گئی تو انہیں استاد تسلیم کرنے سے انکار کیا۔

ان کے والد کے معتقدین جوان کے زمانہ حیات میں میرؔ کی خاک پا کا سرمہ اپنی آنکھوں میں لگاتے تھے، اب ان سے منہ چراتے۔ اگر راہ میں ملتے تو صاحب سلامت کی بجائے کترا کر نکل جاتے۔

میرؔ نے اس انقلاب کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ آگرے میں ایک فرد بھی لائق تخاطب نہیں ملا، حالانکہ میرؔ وہاں کے بڑے بڑے صاحب جبہ و دستار سے ملے جن کو اپنے علم وفن پر ناز تھا اور جو شعر و سخن میں اپنے تئیں بہت کچھ سمجھے جاتے تھے، مگر میرؔ نے انھیں بھی کھوکھلا پایا، اس لئے دل برداشتہ ہو کر پھر دوبارہ دِہلی کا قصد کیا اور سراج الدین خاں آرزو کے یہاں مقیم رہ کر ان سے استفادہ کرنے لگے۔ پھر سوتیلے بھائی محمد حسن کی کینہ توزی یہاں بھی پیچھے لگی رہی۔ انھوں نے لکھ بھیجا کہ محمد تقی فتنہ روزگار ہے، اس کی تربیت نہ کی جائے، بلکہ دوستی کے پردہ میں اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

سراج الدین خاں آرزو بھانجے کی بات میں آگئے۔ ایک روز دسترخوان پر مجھے بہت پھٹکارا، یہ بات بہت تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ میں فوراً وہاں سے اٹھ آیا۔ وہ برابر میری ایذا دہی میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ مصائب کی برداشت مجھ سے نہ ہو سکی اور میں پاگل ہو گیا۔ اپنے جنون کا منظر یوں پیش کرتے ہیں:-

> ''.....وحشتے پیدا کردم۔ در حجرۂ کہ می بودم درش می بستم و باایں کثرتِ غم تنہا نشستم، چوں ماہ برمی آمد، قیامت برسری آمد........در شب ماہ پیکرے خوش صورت ....از جرم قمر انداز طرف من میکرد و موجب بیخودیٔ من می شد۔ بہر طرف کہ نظر افتاد بر آں رشک پری می افتاد۔ بہر جا کہ نگاہ می کردم تماشائے آں غیرت حور می کردم۔ در و بام و صحن خانہ من ورق تصویر شدہ بود۔ یعنی آں حیرت افزا از شش جہت رو می نمود............تمام روز جنوں می کردم...............ناگاہ موسم گل رسید، داغ سودا سیاہ گردید..........شائستہ کنارہ گیری شدم

زندانی وزنجیری شدم۔"[۱]

ایک[۲] مدت تک ان کا علاج ہوتا رہا، احباب واعزہ نے توجہ کی، خاص کر فخر الدین خاں کی بیوی، جو غالباً میر کے والد علی متقی کی مرید تھیں اور کچھ قرابت بھی رکھتی تھیں۔ بہت تندہی سے علاج کی طرف متوجہ ہوئیں۔ تعویذ گنڈے بھی کئے گئے اور اطبا سے علاج بھی کرایا گیا۔ میر صاحب تندرست ہو گئے۔

میر نے اپنے جنون کے اسباب پر کھل کر روشنی نہیں ڈالی ہے مگر کیفیت جنون کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اصل سبب کی بہت کچھ غمازی کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں اس راز درون پردہ کو مصنف "بہار بےخزاں" نے فاش کیا ہے، جس سے بہت سے پہلو روشن ہوتے ہیں۔

"به[۳] شہر خویش! پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع میل خاطر داشت۔ آخر عشق اورا خاصیت خشک پیدا کرد میخواست کر بجیہ بہ چار سوئے رسوائی کند، وحسن بے پردہ بجلوہ گری درآید۔ از ننگ افشائے راز از وطن و اقربا بادلے بغل پروردۂ حسرت و حرماں، با خاطر ناشاد دست و گریباں و قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد خانہ بر انداز یہا بہ شہر لکھنؤ رسید۔"

میر دوبارہ اپنے وطن اکبرآباد (آگرہ) گئے تو اس وقت وہ اس عمر میں تھے کہ عشق کر سکیں۔ دہلی میں رؤسا کی صحبت میں رہ کر شاہد بازی کا لطف لے چکے تھے، کچھ سکون قلب بھی حاصل ہو چکا تھا، اس لئے عشق فراموشی کی منزل سے نکل کر عشق بازی کی سرحد پر پہنچ چکے تھے، تصوف کا گہوارہ جس میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی ختم ہو چکا تھا۔

وطن پہنچنے کے بعد قرابت کی کسی پری تمثال دوشیزہ پر نظر پڑی اور کیوپڈ کا تیر کام کر گیا۔

---

[۱] ذکر میر صفحہ ۶۴ [۲] ذکر میر [۳] از شعر الہند بحوالہ بہار بےخزاں

ہوشم بہ نگاہے بر د جانا نہ چنیں باید
یک جرعہ خرابم کرد پیمانہ چنیں باید

رفتہ رفتہ معاملہ ''ہمہ کارم بہ نادانی بہ بدنامی کشید آخر'' تک پہنچ گیا۔۔۔ یہ بے راہ روی کسی فرد سے برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔ بات ایک شریف پردہ نشیں لڑکی تھی۔ سب نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو میؔر کے والد کے مداح و عقیدت مند اور میؔر کے قدر داں تھے، ان سے برگشتہ ہو گئے جسے میؔر بے وفائی اور بے مروتی کہتے ہیں۔

''[1] کسانیکہ پیش درویش خاک پائے مرا کحل بصری باختند ازنظرم انداختند ....''

اب اس کے سوا اور کیا چارہ کار تھا کہ ترک وطن کر کے اس بدنما دھبے کو اپنے دامن سے دھونے کی کوشش کریں۔ یہ کچھ مجنوں کا عشق تو تھا نہیں کہ بدنامی و رسوائی سے بے نیاز ہو کر کوئے یار کے چکر کاٹتا۔ بہتری اسی میں تھی کہ ٹل جایا جائے۔ چنانچہ وہ ٹل گئے۔ کیونکہ تقاضائے ادب بھی یہی تھا۔

دور بیٹھا غبار میؔر اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مگر اپنا وطن جواب دیارِ محبوب بھی تھا، اس کا چھوڑنا بڑے دل گردے کی بات تھی۔ خود فرماتے ہیں:۔

چلا اکبر آباد سے جس گھڑی — درو بام پر چشم حسرت پڑی
پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت — بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت
جگر جور گردوں سے خوں ہوگیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
نظر رات کو چاند پر گر پڑے — تو گویا کہ بجلی سی دل پر گرے
نظر آئے اک شکل مہتاب میں — کمی آئے جس سے خور و خواب میں

---

[1] ذکر میر

اور یہی بات انہوں نے 'ذکر میر' میں بھی کہی ہے ''اگر نظر بر گل مہتاب می افتاد، آتش در جاں بے تاب می افتاد۔'' اب بات واضح ہوگئی کہ جنوں کا اصل سبب کیا تھا اور خان آرزو سے کشیدگی کے اسباب کیا تھے۔ موصوف شہر کے ایک ممتاز شخص تھے۔ اس قسم کی باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میرؔ کے مربّی و سر پرست بھی تھے۔ میرؔ کو خود اس کا اعتراف بھی ہے ''تذکرۂ نکات الشعراء'' میں ان کو ''استاد پیر و مرشد بندہ'' لکھتے ہیں۔ لیکن ''ذکر میرؔ'' میں ان کو ''مرد دنیادار'' لکھا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ میر خان آرزو کے باب میں اپنا توازن اس حد تک کھو چکے تھے کہ انہیں اپنے محسن کے احسانات کا بھی پاس نہیں رہا تھا۔ وہ کچھ نہ کر سکتے تھے مگر دل ہی دل میں اپنے پھپھولے توڑ سکتے تھے۔ بے پناہی انھیں خان آرزو کا در چھوڑنے میں مانع تھی اور نگاہیں چار کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اس ذہنی کش مکش میں ایک روز گھر سے نکلے اور قاضی کے حوض پر آ کر پانی پیا۔ وہیں بیٹھے تھے کہ ایک شخص سے ملاقات ہوگئی۔

چونکہ اب تک ان کی شاعری کی کافی شہرت ہو چکی تھی، خواجہ میر دردؔ جیسے مقتدر اور مظہر جان جاناں جیسے مغتنم عارف کامل کی بارگاہ میں عزت کی سند مل چکی تھی۔ ادبی و علمی حلقے میں خان آرزو کی صیقل گری سے ان کا جوہر قابل کافی چمک اٹھا تھا۔ شہر کے علم دوست رؤسا ان کی قربت و مصاحبت کو قابل فخر سمجھنے لگے تھے۔ اس لئے حوض قاضی پر ملنے والے ایک شخص نے انھیں رعایت خاں کی حویلی میں لے گیا اور ''رعایت خاں'' نے ان کو اپنا رفیق بنا لیا۔ اس طرح ان کو تنگ دستی سے ایک بار پھر نجات مل گئی۔[1]

مگر گردشِ تقدیر ہمیشہ ان کے ساتھ لگی رہی۔ کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا پھر منقطع ہو جاتا۔ حکومتوں کا الٹ پھیر طوائف الملوکی اور کہیں خود میرؔ کی اپنی افتادِ طبع سدِ راہ بن جاتی اور میرؔ افلاس کا شکار ہو جاتے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ یہاں تک کہ حملہ درّانی کے بعد دہلی

---

[1] افکار میر صفحہ ۴۵

بالکل اجڑ چکی تھی، وہ اگلی صحبتیں درہم برہم ہو چکی تھیں۔ یہ راجہ ناگرمل کی[1] سرپرستی میں جا بجا کی خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ برسانہ، گمبھیر پور وغیرہ کا سفر اسی اثنا میں پیش آیا۔ ہر جگہ سے چکر لگا کر دوبارہ دہلی وارد[2] ہوئے تو نہ قائم تھے، نہ سودا، نہ سوز سب دہلی سے جا چکے تھے۔ مرزا مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد اور حاتم موجود تھے۔ میر کی چشمک اگر چل سکتی تھی تو حاتم ہی سے چل سکتی تھی۔ مظہر و درد جیسے بزرگ اس قسم کے خرافات میں پڑنے والوں میں نہ تھے کہ کسی پر کیچڑ اچھالنا شاعری کا ایک خاص جزو معاصرین کی تخفیف اور اپنی تعلی تھا۔ سودا کو وہ کسی قدر آنکھ لگاتے تھے اور اپنا معاصر سمجھتے تھے اس لئے ان سے تو معاصرانہ چشمک رہتی تھی۔ لیکن ان کے علاوہ تمام شعراء پر ان کے حملے بہت رکیک ہوا کرتے تھے۔

اس مرتبہ جو میر دہلی آئے تو حاتم سے ٹکر لی۔ مگر ضرورت تھی پیٹ بھرنے کی اور اس کا سامان مفقود تھا۔

لکھنؤ کا قیام

میر[3] صاحب کی شاعرانہ عظمت دور دور تک پہونچ چکی تھی۔ ۱۱۹۶ھ میں مرزا سودا انتقال کر گئے۔ آصف الدولہ کا دربار کسی بڑے استاد سے خالی ہو چکا تھا۔ آصف الدولہ کو خیال ہوا کہ میر کو بلایا جائے۔ انھوں نے سالار جنگ کے مشورہ سے زاد راہ بھیج کر میر صاحب کو لکھنؤ بلا لیا۔ بہت شفقت سے پیش آئے اور اپنے درباری شعرا میں ان کو شریک کر لیا۔ یہ برابر ان کے ہمرکاب رہتے۔ سفر و حضر میں ان کا ساتھ رہتا۔ دو سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ ملتا تھا اور خوش خوش زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر مزاج کی غیر معمولی انانیت آڑے آئی اور یہ وظیفہ نواب سعادت علی خاں کے زمانہ ہی میں بند[4] ہو گیا۔ نواب سعادت علی خاں نے اپنی جانب سے ان کی قدر افزائی اور ناز برداری میں کبھی فروگذاشت نہیں کی۔ خلعت اور ہزار روپیہ کے انعام سے بھی نوازا۔ مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔

---

۱ ذکر میر صفحہ ۷۵ ۲ افکار میر صفحہ ۴۳ ۳ افکار میر صفحہ ۴۴

۴ افکار میر صفحہ ۴۷ بحوالہ تذکرہ کمال

وفات میر

میر کے آخری ایام نہایت تنگی اور پریشان حالی میں گزرے۔ اب عمر بھی نوے کے قریب ہو چکی تھی۔ طرح طرح کے امراض مزمنہ میں مبتلا تھے ہی، کہ بالائے ستم یہ ہوا کہ تین سال مسلسل اپنے عزیزوں کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ ایک سال[1] ان کی لڑکی کا انتقال ہوا، دوسرے سال ایک جوان لڑکے نے داغ مفارقت دی اور تیسرے سال ان کی اہلیہ بھی چل بسیں۔ اس پیرانہ سالی میں مسلسل صدمات کی تاب نہ لا کر میر صاحب بالکل نڈھال ہو گئے۔ ہوش و حواس میں وارفتگی آ گئی اور اب بالکل خانہ نشیں ہو گئے۔ شعری محفلوں میں شریک نہیں ہوتے۔ شاعری چونکہ ان کی فطرت ثانیہ تھی اس لئے کچھ نہ کچھ کہتے ضرور تھے مگر اس کا انداز ہی دوسرا تھا۔

کر فکر اپنی، طاقتِ فکری جو ہو ضعیف
اب شعر و شاعری کی طرف کم لگا دماغ
بہت ہرزہ گوئی کی یاں میر صاحب
کر وواں کے کچھ منہ دکھانے کی باتیں

زندگی یوں ہی چل رہی تھی کہ آخر جمادی الثانی[2] میں بیمار پڑے۔ دوست احباب علاج و معالجہ کی طرف پوری توجہ سے مشغول ہوئے۔ اطبا نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" نفع کی کوئی شکل نظر نہ آئی۔ بقول مولانا روم "چوں قضا آید طبیب ابلہ شود" غیر معمولی ضعف تو تھا ہی، قبض دور کرنے کے لئے تلیں دی گئیں۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو دست آئے اور ۲۰ رشعبان المکرم ۱۲۲۵ھ بروز جمعہ شام کے وقت روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اپنے آبائی قبرستان اکھاڑہ بھیم میں اپنے عزیزوں کے قریب دفن ہوئے۔

---

۱ مقدمہ کلیات صفحہ ۳۷ ۲ مقدمہ کلیات میر

میر کی اولاد

جس طرح میؔر نے ''ذکر میر'' میں اپنی ننھیال کی وضاحت نہیں کی، اسی طرح خود اپنی شادی یا شادیوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ محققین اس بنیاد پر کہ میر فیض علی اور میر حسن عسکری کی عمر میں غیر معمولی تفاوت ہے یہ اندازہ لگایا ہے کہ میؔر نے دو شادیاں کیں۔ میر فیض علی .... سے تھے اور ایک بیٹی جو شاعرہ بھی تھیں اور بیگم تخلص کرتی تھیں۔ محل دوم سے حسن عسکری عرف میر کلو عرش تھے۔

قاضی عبدالودود ناصر کے حوالہ سے لکھنؤ میں میر کی شادی کو تسلیم کرتے ہیں۔

عہد میؔر

تاریخ کے ناقدین اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے جو رائے بھی قائم کریں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت مغلیہ کا آخری نقطۂ عروج اورنگ زیب ہی کا عہد تھا۔ اس بلند ہمت بادشاہ نے اپنے پنجاہ سالہ دور حکومت میں ہر قسم کی شورشوں کو فروع کر کے ایک مستحکم حکومت کی بنیاد ڈال دی تھی۔ وہ بیک وقت میدان جنگ کو بھی سنبھالتا تھا اور اندرون ملک نظم و نسق پر بھی قابو رکھتا تھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ ان کے بعد اس کے اخلاف میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ حکومت کو درست طریقے سے چلا سکیں، اس لئے اپنے بیٹوں کی تربیت کی طرف بھی اس کی توجہ رہا کرتی تھی۔ وہ اپنے رقعات میں برابر ان کو کبھی افہام و تفہیم اور کبھی زجر و توبیخ سے ان کی بے راہ روی پر متنبہ کیا کرتا تھا، لیکن شہنشاہی کے گہوارے میں پلے ہوئے فرزندوں نے آنکھ کھولتے ہی شاہانہ جاہ و جلال کے تماشے دیکھے تھے ان میں سے ہر ایک دل میں یہی جذبہ پرورش پا رہا تھا کہ یہ جاہ و جلال، یہ مطلق العنانی ان ہی کے حصہ میں آتی اور اس لئے سب ہی آپس میں جوڑ توڑ کر رہے تھے ادھر اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوئی تھی کہ قلعے سے لے کر صوبے صوبے میں انتشار کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ جب اندرون خانہ ہی سکون نہ ہو بیرون خانہ کی نگاہداشت کیسے ممکن ہے۔

اورنگ زیب کے بعد شاہ عالم اوّل اور پھر جہاندار شاہ اورنگ عالمگیری پر متمکن ہوئے۔ ان کی جانشینی کے ساتھ ہی اورنگ زیب کی بساط تقویٰ پارہ پارہ ہوگئی۔ عیش پرستی و ظلم، فسق و فجور کا بازار گرم ہوا۔ وہ بہادر جو کل خاک و خوں میں غلطاں اپنے قوت بازو سے میدانِ کارزار میں تیغ دیو پیکر کے جوہر دکھار ہے تھے آج خود کسی کی تیغ ابرو کے شکار اور کسی کے تیرِ مژگاں کے گھائل ہو رہے تھے۔ عدل و انصاف کی مسند اٹھی اور اس کی جگہ محفل رقص و سرود نے لی۔ دربار میں گویئے، بھانڈ، ڈھاری اکٹھا ہوئے۔ زنان بازاری نے باریابی حاصل کی اور صدر میں جگہ پائی۔ خود جب بادشاہ کا یہ حال ہو تو حکام و عمال کا کیا حال ہوگا۔ غرض ''تقدیر امم'' کا پہلا دور ''شمشیر وسناں'' ختم ہو چکا تھا۔ طاؤس و رباب کے نغمے گونج رہے تھے۔

آ تجھ کو بتا تا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر وسناں اوّل طاؤس و رباب آخر

مگر دور طاؤسی کی مدت ہی کیا؟

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغباں وکف گل فروش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر کے بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

آخر یہی ہوا۔ کئی سو برسوں کی مستحکم و وسیع حکومت چند ہی برسوں میں اپنے حدود کم کرنے لگی اور رفتہ رفتہ سمٹ کر صرف لال قلعہ میں رہ گئی اور یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بادتند کی تاب نہ لا کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔

جہاندار شاہ کے عہد پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد ہادی کامور خاں رقمطراز ہیں:

''بلبلوں کی جگہ کوّوں نے لے لی تھی۔ اور بازار کے گھونسلوں میں اُلّو

بس گئے تھے۔‘‘[1]

’’منتخب الباب‘‘ میں خافی خاں لکھتے ہیں:۔

’’درعہد[2] ناپائیدار جہاں دارشاہ کہ بنائے ظلم وفسق رااستحکام تمام شد۔
چناں بازار رودوسرودقوم قوالاں وکلاونت، ودھاڑی گرم گردید کہ
نزدیک بود کہ قاضی فرابہ کش ومفتی پیالہ نوش گردد.....‘‘

مگر ع ’’یہ عیش ونشاط وکامرانی کب تک‘‘ آخر زیادہ مدت نہ گذری کہ فرخ سیر نے سادات بارہہ کی مدد سے جہاں دارشاہ کوشکست دے کرقتل کروادیا اور خاندان کے جتنے دعویدار سلطنت ہوسکتے تھے ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھروادیں تاکہ کوئی دعویدار کھڑا نہ ہوسکے اورخوداورنگ حکومت پر متمکن ہوگیا۔ اراکین دربار دوگروہوں میں منقسم تھے۔ تورانی سنّی اور ایرانی شیعے۔ جب ادبار آتا ہے تو ایک ہی راہ سے نہیں آتا اختلاف کے مختلف اسباب نکل آتے ہیں۔ ان ہی میں ایک مذہبی رقابت اورآپس کے جھگڑے بھی ہیں۔ اُن شیعہ سنّیوں میں برابر چشمک رہا کرتی تھی اور دونوں ہی دنیاوی اقتدار کے لئے مذہبی اختلافات ہوادے کرآپس کے اتحاد کونقصان پہنچاتے رہتے تھے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ فرخ سیر چلا تو تھا بڑے شد ومد سے مگر بعد کی ناعاقبت اندیشیوں اورآپس کی رقابت نے ملک کے مالیہ کوشدید صدمہ پہنچایا تھا۔ اس دور میں اراکین سلطنت کچھ اس حد تک بااختیار ہوچکے تھے کہ بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ جس کو چاہتے تخت نشیں کردیتے، جس کو چاہتے معزول کر کے قتل کردیتے۔ اورنگ زیب تک جتنے بادشاہ گذرے وہ خود صاحب سیف وقلم تھے، فوج کی کمان ہمیشہ میدان جنگ میں خود ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی اوراب حال یہ تھا کہ خود بادشاہ اپنے امراء کا دست نگر تھا چنانچہ میر جعفر زٹلی کی پھبتی اسی بنیاد پر تھی جس کے نتیجہ میں وہ قتل ہوا، جس کا تذکرہ گذشتہ ابواب میں گذر چکا ہے۔

---

[1] تذکرۃ السلاطین چغتائیہ [2] منتخب الباب حصہ دوم

سادات بارہہ کا احترام ان کی سیادت ونجابت نیز ان کی مشیخیت کی وجہ سے سب ہی کرتے آتے تھے۔ ان میں اچھے بھی تھے، مست مئے پندار بھی تھے، مگر سلاطین ان کی رعایت یکساں کرتے تھے اورنگ زیب کے دور تک انھوں نے حکومت میں کوئی بار نہیں پایا تھا مگر اپنی غیر معمولی رعایتوں کی وجہ سے کبھی کبھی سر اٹھاتے اور دربار عالمگیری تک خبر بھی ہوتی مگر اورنگ زیب یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتا۔ ''سادات بارہہ ہیزم مسجد اند، نہ لائق سوختنی نہ قابل فروختنی۔'' انھیں اپنے حال پر چھوڑ دو۔ مگر اورنگ زیب کے بعد رفتہ رفتہ یہ حکومت پر اتنا اثر انداز ہو گئے کہ بادشاہ کا عزل ونصب ان کے ہاتھ میں تھا۔ فرخ سیر کو بر سر تخت لانے والے بھی یہی تھے۔ اپنی روش کے مطابق جب انھوں نے اس کو اپنے کام کا نہیں دیکھا تو اس کو قتل کروادیا۔ اس کے بعد کئی بادشاہ تخت پر بیٹھے مگر ان کی مدت حکومت چند ماہ سے زیادہ نہ رہی۔

اردو مثنوی کا اِرتقا عہد میر تک

صنف مثنوی شعرائے فارس کی دین ہے۔ اہل فارس نے اس صنف کی ابتدا ہی نہیں کی بلکہ اس کو بام عروج تک پہنچا دیا۔ فارسی مثنویوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رزم و بزم، فلسفہ و اخلاق، مذہب و روح مذہب، تصوف و علوم، معاشرہ، مدح و ذم، دولت و فقر، حسن و عشق کی کرفرمائیاں، قصے اور کہانیاں، فطری اور مافوق الفطری باتیں، غرض دل و دماغ کے سکون ولذّت کے جملہ اسباب ان مثنویوں میں جمع ہو گئے ہیں۔

اردو شاعری چونکہ فارسی سے متاثر ہے بلکہ یوں کہئے کہ زبان کا فرق جدا کر کے دیکھا جائے تو چوکھٹا وہی ہے جو اہل فارس نے تیار کیا تھا اور اس میں اپنے مرقعے سجائے تھے۔ پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ مثنوی کے فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو میں اس کی پیروی نہ کی جاتی تو مثنوی کا وسیع میدان اردو میں بھی جولان گاہ بنتا۔ شمالی ہند سے پہلے جنوبی ہند کے شعراء نے اس کی طرف توجہ دی۔ غزل گوئی کی طرف وہ بعد میں مائل ہوئے۔

ڈاکٹر گیان چند کی تحقیق کے مطابق، دکن کا پہلا شاعر نظامی[1] ہے جس نے ۸۶۵ھ اور ۸۶۷ھ کے درمیان مثنوی ''کرم راؤ پدم راؤ'' لکھی۔ دکنی صوفیائے کرام نے تعلیم و تعلم کے خیال سے ملک کی عام بول چال میں اپنی فکری صلاحیتوں کو منتقل کرنے کی طرف توجہ دی۔ نثر بھی لکھا اور نظم میں بھی اپنی تخلیقات پیش کرتے رہے۔ لیکن چونکہ صوفیائے کرام اصل منشا تذکرہ و تخلیق تھا اس لئے ان کی تصنیفات بھی اسی نہج کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں صفحہ ۱۱۸

مثنویاں معرفت و سلوک، وعظ و تذکیر کے مضامین سے بھری پڑی ہیں۔ ان ابتدائی مثنویوں میں ادبی چاشنی مفقود ہے کیونکہ یہ میدان اس کا متحمل بھی نہیں۔ ورنہ اگر وہ ادب نوازی سے کام لیتے تو اصل مدعا اپنی غرض سے بہت دور پڑ جاتا۔ اس لئے یہ مثنویاں بالکل سپاٹ ہیں، اور اس قسم کی تلاش بھی یہاں بے محل ہے۔ ان مثنویوں میں اشرف کی ''نوسر ہار'' فیروز بیدی کی ''پرت نامہ'' میراں جی شمس العشاق اور ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی ''مختصر مثنویاں'' شیخ خوب محمد چشتی گجراتی کی طویل مثنویاں شامل ہیں جو تمام تر فارسی کی علمی و عرفانی مثنویوں کے زیر اثر لکھی گئی ہیں۔

بعض اہل تحقیق یہ خیال کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا مثنویوں نیز وہ عشقیہ مثنویاں جو بعد میں دکن میں لکھی گئیں ''شمالی[1] ہند میں بالکل رائج نہ تھیں، کم سے کم میر کے لئے تو یقینی ہے کہ وہ ان مثنویوں سے واقف بھی نہ تھے۔''

تعجب ہے کہ جس عہد سے چند صدی پہلے ''قند فارسی'' طوطیانِ ہند کے لئے ''شکر شکن'' بن جائے اور شیراز سے بنگال تک اس کی شیرینی پھیل رہی ہو وہاں شمالی ہند جنوبی ہند سے اتنا بے تعلق ہو کہ وہاں کی مثنویاں یہاں بالکل نہ پہنچیں؟ جب کہ خواجہ حافظ کی غزل بنگال سے اس دعوے کے ساتھ پہنچ رہی ہے۔

شکر شکن شود ہمہ طوطیانِ ہند
زاں قند پارسی کہ بہ بنگال می رود

اس لئے یہ تصور کہ شمالی ہند والے دکنی مثنویوں سے بالکل ناآشنا تھے بالکل قرین عقل نہیں ہے۔

شعراء کی پرورش اور سرپرستی سلاطین کے دربار سے ہوتی رہی ہے اور اس ماحول میں ان کو اپنی فطری صلاحیتوں کو ابھارنے کا برابر موقع ملتا رہا ہے۔ دکن کی حکومتوں نے اپنی علم دوستی اور ادب نوازی میں بہت پیش دستی دکھائی ہے وجہی جیسا شاعر قلی قطب شاہ کی علم دوستی ہی کی وجہ سے حیات دوام حاصل کر سکا۔ باوجودیکہ اس نے اپنی نثر میں پاکبازانہ

---

[1] میر اور میریات صفحہ ۱۱۳

تصورات کی پوری ترجمانی کی ہے۔ لیکن حالات کے ماتحت اس نے ایک عشقیہ مثنوی ''قطب مشتری''، لکھی[۱] اور اس پہ ممدوح خود قطب شاہ کو قرار دیا، اور معرکۂ عشق میں ممدوح کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اس دور کے دوسرے شعرا کے لئے بھی اپنی جولائی فکر کے مظاہرے کے لئے عشق ہی کی فضا سازگار نظر آئی اور انھوں نے بھی اپنی حد تک افسانہ کے پیرایہ میں مضامین عشق کو سجا سجا کر پیش کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ چند مثنویوں کو چھوڑ کر وجہی کے بعد کی دیگر مثنویاں داد عشق دینے میں کوشاں نظر آتی ہیں۔

خود تراشیدہ عشقیہ افسانے قوم کے مزاج سے بہت قریب تھے، اس لئے محنت کی داد اگر کہیں سے صلہ کی شکل میں نہ بھی ملتی تو ستائش کی تمنا تو پوری ہو ہی جاتی تھی۔ لہٰذا عشقیہ مثنویوں کا ایک چلن چل گیا، جس کی وسعت شمال سے جنوب تک کم و بیش برابر ہی رہی۔ اس سلسلے میں شعرا کی کاوشیں بھلائی نہیں جا سکتی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے ان ناموں کو خصوصیت سے گنوایا ہے:-

> ''احمد کی[۲] لیلیٰ مجنوں، غواصی کی سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ، مقیمی کی چندر بدن و مہیار، امین کی بہرام اور حسن بانو، ملک خوشنود کی ہشت بہشت، ابن نشاطی کی پھول بن، نصرتی کی گلشنِ عشق، جنیدی کی ماہ پیکر، طبعی کی بہرام و گل اندم، فائز کی رضوان شاہ و روح افزا، ہاشمی کی یوسف زلیخا مشہور ہیں۔

زمانہ قدیم میں کہانیاں، قصے وغیرہ دو مقصد سے لکھے جاتے تھے۔ یا تو کوئی نصیحت مقصود ہوتی تھی یا محض تفریح طبع اور جذبات کو برانگیختہ کرنا مدنظر رہا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان داستانوں میں مافوق الفطرت، محیر العقول باتیں جو کبھی حقیقت کی شکل میں نمایاں ہی نہیں ہو سکتی تھیں، داستان گو اپنی طرز ادا سے ان کو حقیقت بنا کر پیش کر دیتا تھا۔ زندگی کی تعمیر میں اس کا کوئی نمایاں تاثر نہیں ہوا کرتا تھا۔ داستان کا مطلب ہی یہ تھا کہ اس میں تاثیر بیان

---

۱ اردو مثنوی کا ارتقا ۲ اردو مثنوی شمالی ہند میں صفحہ ۱۲۰

ہو مگر واقعہ میں صداقت بھی ہو، داستان کے لئے بالکل ضروری نہ تھا۔ بلکہ جس قدر حقیقت سے دور کہانیاں ہوتیں، اسی قدر پسندیدہ خاطر اور خاطر اور مقبول ہوتی تھیں۔ عموماً واقعات کی ترتیب اس طرح ہوتی کہ کسی خوشرو پری تمثال شاہزادے کا دل اچانک کسی حور پر کسی ہنگامی حالات میں مائل ہو جاتا، رفتہ رفتہ یہ تعلق عشق کی صورت اختیار کر لیتا۔ دونوں جانب چنگاریاں مشتعل ہوتے ہوتے شعلۂ جوالہ بن جاتیں۔ محبوب کے حصول کے لئے ہفت خواں طے کرنا پڑتے۔ جنوں اور دیوؤں سے مقابلہ کی نوبت آتی۔ اسی درمیان میں آدم زاد پر کوئی پری عاشق ہوتی یا غلط فہمی میں کوئی آدم زاد کسی پری پر عاشق ہو جاتا۔ ایک مدت دراز کے بعد وصل محبوب شادی کی شکل میں جائز طریقہ پر نصیب ہوتا اور دونوں شادکام اور بامراد اپنا گھر بساتے۔ کبھی کبھی داستان کا اختتام نہایت حسرتناک ہوتا، زندگی میں وصل محبوب نصیب نہ ہوا لیکن موت کے بعد ایسا وصال ہوا کہ نعشیں الگ نہ ہو سکیں اور اسی طرح ان کو "من تو شدم تو من شدی" کے عالم میں ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا گیا اور ان کی یادگار مصنف کی داستان یا شاعر کی مثنوی باقی رہ گئی۔

مقیمی نے اپنی مثنوی کا پلاٹ یوں تیار کیا کہ "شہزادی چندر بدن" کسی میلے میں سیر کے لئے گئی وہاں ایک مسلمان تاجر کا لڑکا "مہیار" اس پر عاشق ہو گیا، کسی طرح چندر بدن تک اس کی رسائی ہو گئی۔ بس قدموں پر گر گیا اور یہ التجا کی (بقول اکبر)۔

تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے

ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

مگر اس نے اس کی درخواست ٹھکرا دی۔ شاید اسے بھی خیال آیا ہو "بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"، انجم نگر کے بادشاہ نے بیچ میں پڑ کر کوشش کی طریق اکبری کو اپنایا جائے۔ لیکن یہ بہت پہلے کی بات ہے جبکہ یہ بے دینی اور ادھرمی کی بات ممکن نہ تھی۔ چندر بدن کے باپ نے یہ رشتہ منظور نہیں کیا اور "مہیار" ناکام محبت غمِ جدائی کی تاب نہ لا کر ایک روز اس دنیا سے چل بسا۔ عاشق کا جنازہ اٹھا۔ بے کسی ماتم کناں آگے آگے چلی۔ جب

''چندر بدن'' کے محل کے نیچے جنازہ پہنچا، زمین نے سب کے پاؤں شکنجے کی طرح جکڑ لئے۔ کسی کا قدم آگے بڑھتا ہی نہیں، آخر معشوق نے سمجھا کہ یہ سب کچھ حضرت عشق کی نیرنگیاں ہیں۔ باپ سے اجازت لی، جنازے کے پاس آئی، کلمۂ شہادت پڑھ کر جنازے کے پہلو میں لیٹ گئی اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ مدفن میں جب تابوت کھولا گیا تو عجیب کرامت نظر آئی۔ چندر بدن کی لاش مہیار کی لاش اس طرح چسپاں تھی کہ الگ نہیں ہو سکتی۔ آخر عاجز آ کر لوگوں نے اسی طرح دونوں کو سپرد خاک کر دیا۔

مقیمی کی ترتیب اپنے مقدمین سے مختلف ہے۔ وہ مرتے مرتے بھی عاشق و معشوق کو ملا دیتا تھا اور دونوں اپنا گھر بسا لیتے تھے۔ مقیمی نے دو مختلف المذاہب شخصیتوں میں محبت پیدا کی۔ نتیجہ ظاہر تھا کہ اختلاف مذہب کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ اگر بے چارہ مہیار تنہا مر کر گڑ جاتا تو یہ ناکامی بالائے ناکامی ہوتی۔ اس لئے مقیمی نے ایک قبر میں دونوں کو دفن کرنے کے لئے پہلے معشوق کو مسلمان کیا، پھر دونوں لاشیں باہم چسپاں کر کے اعجاز عشق کا تماشہ دکھا دیا، جو یقیناً ایک نئی راہ تھی اور اس پر چل کر بعد کے شعرا نے خود ہی نئی راہیں نکالیں۔

لیکن چونکہ زمانہ پرفتن تھا، تمام ہندوستان طوائف الملوکی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس لئے لوگوں کے دل کچھ خدا کی طرف بھی مائل تھے۔ بے ثباتی عالم کا پورا پورا منظر سامنے تھا، اس لئے ''طاؤس و رباب'' سے ایک حد تک ہی دلچسپی لی جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس دور کی مثنویوں میں مذہبی طرز کی مثنویاں خاصی تعداد میں مل جاتی ہیں۔ اگرچہ ان مثنوی نگاروں کا مطمح نظر نہ خدمتِ فن تھا نہ شاعری کا کمال دکھانا، نہ زبان و ادب کی مشاطگی، پھر بھی چونکہ وہ مثنویاں اُردو ہی میں لکھی گئیں اس لئے فنی اور لسانی خوبیوں سے بالکل عاری نہیں ہیں۔ اس طرز کی مثنویوں میں نصرتی کا ''عادل نامہ'' ایک رزمیہ مثنوی ہے جو اپنے پہلو میں تاریخی صداقتیں بھی لئے ہوئے ہے۔ یہ مثنوی سلسلہ بیجاپور ''علی عادل شاہ'' کے معرکوں کے ذکر میں ہے۔

''پدماوت کا ترجمہ'' بھی دکن میں کیا گیا۔ غلام علی نے جائسی کی ''پدماوت[1]'' کو اردو تعلیم کا جامہ پہنایا۔ یہ مثنوی تاریخی اور تمثیلی دونوں حیثیت سے قابل قدر ہے۔ حضرت علیؓ کے معرکوں کو بھی مختلف شعرا نے مثنوی کے طرز پر نظم کیا ہے۔ مگر اصل معرکوں سے زیادہ خیالی معرکہ آرائی ہے۔ جس نے ان کی اصل شان شجاعت کو کم کر کے افسانوی پہلو ان کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ رستمی نے اپنے ''خاور نامہ'' میں ان کے غزوات کی تفصیل دی ہے جس سے یہ مثنوی اس پہلو سے بھی قابلِ قدر ہو گئی ہے اور رزمیہ مثنویوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کی خوبی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ابن حسام کی فارسی مثنوی کا یہ ترجمہ ہے۔

اخلاق و تصوف کے ضمن میں ذوقی نے وجہی کی جب اس کے مضامین نظم کئے اور منازل سلوک کو تمثیل کے رنگ میں پیش کیا۔ ''ڈاکٹر گیان چند'' کی مختصر فہرست میں یہ نام اس طرح آئے ہیں:-

> ''معرفت کی مثنویوں میں عشرتی کی 'چت لگن' اور 'دیپک پتنگ' وجدی کی 'پنچھی باچھا'، 'باغ جاں فزا' 'تحفۂ عاشقاں'، بحری کی 'من لگن' مشہور ہیں۔ مولوی محمد باقر آگاہ کی مثنویاں بھی مذہب و طریقت پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ خاص مذہبی مثنویاں بھی لکھی گئیں مثلاً ولی ویلوری کی 'روضۃ الشہداء'، اشرف کی 'جنگ نامہ حیدر' محمود کی قصہ ملکہ مصر۔''

لیکن مثنویاں چونکہ مذہبی رنگ میں تھیں، اس لئے عوام سے داد تحسین نہیں لے سکتی تھیں۔ تمام شعرا صوفی تو تھے نہیں کہ شاعری کو بھی ابلاغ و تبلیغ کا ذریعہ بناتے۔ ان کو اپنی کاوش کی داد ملنے کی تمنا تھی اس لئے عشقیہ مثنویاں بھی اپنی جگہ پھلتی پھولتی رہیں۔ اس سلسلہ عشق کی گیر معمولی اہمیت رکھنے والی مثنوی سراج کی بوستان خیال ہے، جو میر اثر کی مثنوی خواب و خیال کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ سراج[2] نے اس مثنوی میں اپنی طرف سے منسوب کر کے ایک کہانی

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں صفحہ ۱۴۳ [2] اردو مثنوی کا ارتقا صفحہ ۹۸

لکھی ہے کہ کسی لالہ کے لڑکے کو دل دے بیٹھے، ہر وقت اس پر اپنی جان چھڑکنے کو تیار رہتے مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا بلکہ مع لوازمات عشق ان کو اپنے در سے باہر کیا۔ ان کی دل برداشتگی دیکھ کر ایک دوسرے صاحبزادے نے خود ہی اپنی پیش کش کی لیکن انہوں نے اس کی طرف نگاہیں نہیں اٹھائی۔ جس کے ہو چکے تھے اسی کا دم بھرتے رہے۔

آثر اور سراؔج دونوں اپنے مسلک کے لحاظ سے صوفی تھے۔ سراؔج نے گویا اس مثنوی میں اس بات کی تلقین کی ہے کہ ''یک گیر محکم گیر'' خواہ بارگاہ محبوب میں پیرائی ہو یا نہو، ہرجائی پن وفادار کی شان نہیں۔ جس در پر سر جھکا چکا ہوں اب وہاں سے اٹھ نہیں سکتا۔

حسرت اب اور جا کے کریں کس کی بندگی
اچھا جو سر اٹھائیں بھی اس آستاں سے ہم

''بوستانِ خیال'' کی خاص خوبی یہ ہے کہ شستہ زبان کے ساتھ، منظر نگاری اور وادات دلی کی بچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ایک منظر کے چند اشعار ہیں:[۱]

رواں آب کے ہر طرف آبشار	جدھر دیکھئے ہو رہی تھی بہار
طرب بخش تھا ناچنا مور کا	تماشا تھا مرمور کے شور کا
ہر اک شرد پر عشق پیچے کی میل	خوشی کی گلی تھی گویا چمیل

معشوق کی عشوہ گری اور عاشق کو رجھانے کا منظر یوں پیش کیا ہے:

کبھی سر کو لادیں مرے منہ کے پاس	کہ پہنچے ہر اک طرح زلفوں کی باس
کبھی میرے زانو پہ زانو رکھیں	کبھی میرے پہلو پہ پہلو رکھیں
دو پٹہ مرا اوڑھ کر لیٹ جائیں	کبھی شال اپنی مرے تئیں اٹھائیں

زبان کی اسی روانی اور شستگی کی بنا پر اس مثنوی کو دکن کی دوسری مثنویوں کے مقابلہ میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ پروفیسر عبدالقادر سروریؔ کی رائے میں ''بوستان خیال دکن کی بہترین مثنوی ہے۔'' کیونکہ دکن میں جو مثنویاں لکھی گئیں ان میں چند عیوب بہت

---

[۱] ماخوذ از اردو مثنوی شمالی ہند صفحہ ۱۲۱

نمایاں ہیں۔ طرز بیان نہایت نامانوس، زبان میں پوری بدریت، فنی محاسن کی کمی، ساخت اور جسم کے اعتبار سے ڈھیلی اور بے ڈھنگی ہیں۔ لیکن ''بوستان خیال'' بہت کچھ خامیوں کے باوجود زبان وبیان کی وجہ سے ایک مقام رکھتی ہے۔ اس سے ایک اور بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ میر کا دور آتے آتے دکن میں بھی عمدہ مثنویاں تصنیف ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

شمالی ہند کی ابتدائی مثنویاں عہد میر تک

شمالی ہند میں اردو مثنوی نگاری میں اوّلیت کا سہرا افضل کے سر ہے جنھوں نے اپنی ''بکٹ کہانی'' مثنوی میں نظم کی۔ ڈاکٹر گیان چند کے الفاظ میں:

> ''اس بارہ ماسہ کی طرز میں ایک برہ کی ماری نازنیں اپنے شوہر کو یاد کرتی ہے۔ یہ موضوع ہند شاعری سے لیا گیا ہے۔ اُردو میں مرد کے جذبات اور تجربات رقم کرنے کی روایت ہے۔ 'بکٹ کہانی' میں موضوع کے ساتھ اسلوب بھی ہندی شاعری سے متاثر ہے۔ ہندی اسلوب کے دوش بدوش فارسی تراکیب کی بھی غیر معمولی کثرت ہے۔ محض ایک شعر میں دونوں رجحان واضح ہو جاتے ہیں۔
>
> تمامی لوگ مجھے بوری کہیں رے
> خرد گم کردۂ مجنوں کہیں رے''

ابتدائی دور میں جنوبی ہند کے مقابلہ میں جو مثنویاں شمالی ہند میں ملتی ہیں وہ اگر چہ ہندی نژاد ہیں لیکن ان کی پرورش کے لئے زیادہ تر ایرانی دایہ ہی تلاش کی گئی اور اسی کی آغوش میں یہ پروان چڑھتی رہیں۔ چونکہ زبان بالکل ابتدائی منزل میں تھی، قواعد وضوابط بھی مرتب نہیں ہوئے تھے، اس لئے یہی ناہمواری شاعر کے حسن ترتیب سے دل کش نظر آتی تھی اور آج بھی کہ صدیاں گزر چکیں، عروس اردو اپنی جملہ تزئین سے آراستہ ہو چکی ہے، قدیم طرز مین ایک کشش محسوس ہوتی ہے۔ افضل کی 'بکٹ کہانی' فارسی ترکیبوں اور ہندی کی آمیزش سے خسرو کی ڈالی ہوئی بنیاد کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ افضل نے فارسی ترکیبوں کی آمیزش سے

صرف فارسی الفاظ ہی کا لحاظ نہیں رکھا ہے بلکہ بے تکلف وہ اردو یا ہندی مصادر کو فارسی اصول افعال کے طریقہ پر بھی استعمال کر دیتے ہیں۔ اگر چہ ان کے بعد خود ان کے معاصرین میں ایسی مثالیں نہیں ملتی ہیں۔ ان کے کلام میں اس طرح کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

چو شد مدت پیا کے سنگ رہتے
مرم با یک دگر سنتے و کہتے

متفرق اشعار کے یہ دو مصرعے بھی قابل توجہ ہیں :

ع ''نہیں جز وصل کا سوکھا نہالم''
ع ''ملے آ کر چھٹے جانم جلن سوں''

افضل کے اصل و گوہر اور زاد بوم کے متعلق روایتیں مختلف ہیں۔ لیکن والہ داغستانی[1] کا بیان بہت حد تک قابلِ اعتبار نظر آتا ہے۔

پانی پت کے رہنے والے ایک صوفی شاعر تھے۔ ظاہری و باطنی ہر دو علوم سے آراستہ، درس و تدریس کا مشغلہ رکھتے تھے۔ نہایت پاکباز اور تقویٰ شعار تھے۔ مگر قضائے الٰہی سے سرمد کی یہ رباعی ان پر حرف بہ حرف صادق آ گئی۔

سرمد در دیں عجب شکستے کردی ایماں بفدائے چشم مستے کردی
عمرے کہ بہ آیات واحادیث گزشت رفتی و نثار بت پرستے کردی

کسی ہندو دوشیزہ پر نظر پڑی عقل و ہوش کھو بیٹھے، فارسی میں چند غزلیں کہیں جن میں اپنی گرمی عشق کی پوری تپش بھر دی تھی۔ لڑکی کے قرابت مندوں کو خبر ہوئی تو انہوں نے اس کو متھرا بھیج دیا۔ کیونکہ یہ کوئے یار کے چکر برابر لگایا کرتے تھے جس سے اس کا گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ ایک روز اتفاقاً وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ نکلی، افضل بایں ریش وفش اس کے سامنے آ گئے اور مطلع عرض کر دیا۔

---

[1] ریاض الشعرا

خو شا رسوائی و حال تباہ ہے
سد را ہے و آہ ہے و ننگا ہے

لڑکی یہ توہین برداشت نہ کر سکی اور اس نے برہمی کے ساتھ کہا۔ ''موئے تجھے شرم نہیں آتی منہ پر سفید داڑھی اور جوان عورت سے محبت کا دم بھرتا ہے۔'' اس کے بعد مولانا افضل وجد میں آ گئے ''جواب تلخ میزید لب لعل شکر خارا'' فوراً چار ابرو کا صفایا کر کے ایک مندر کے پجاری سے ہندی علوم سیکھنے لگے جب فی الجملہ معلومات بہم پہونچ گئیں تو کسی ایسے مندر کے خود پجاری بن گئے جہاں اس معشوقہ کے آنے کی امید قوی تھی۔ چنانچہ ایسا موقع بھی آ گیا وہ اس مندر کی پوجا کے لئے آئی، جب ان کے قدموں پر جھکنے لگی تو انہوں نے روک کر پوچھا، مجھے پہچانتی ہو۔ اس نے ان کو پہچان لیا اور جذب عشق کی ان کرامتوں سے متاثر ہو کر فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئی اور ان سے شادی کر لی۔

یہ حکایت کہاں تک قرین عقل ہو سکتی ہے؟ سوچنے کی بات ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ مثنوی کے مضامین سے اقتباس کر کے یہ سوانح عمری مرتب کی گئی ہے۔ ہم اس واقعے کے جملہ پہلو پر منطقیانہ بحث کرنی نہیں چاہتے کیونکہ یہ ہمارے موجودہ موضوع سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ہماری بحث صرف ان کی مثنوی اور ان کی خصوصیات سے ہے اور اس اعتبار سے قدامت کے باوجود ان کی مثنوی میں کافی جان ہے۔

افضل کی سوانح حیات کے ضمن میں جو افسانہ تراشا گیا ہے اس کہانی کو ہم بالکل غیر اہم نہیں کہہ سکتے۔ محبت ہونے کے لئے کسی عمر کی قید نہیں ہے اور نہ اس کے لئے کسی تناسب کی شرط ہے۔ عمر کی اس منزل میں جب کہ قوی نفسانی خواہشات سے مضمحل ہو جاتے ہیں کسی دوشیزہ سے الفت پیدا ہونا اگرچہ بوالہوسی ہی سمجھا جائے گا، مگر بخوبی ممکن ہے کہ کسی کی کوئی ادا ایسی دل کو بھا جائے کہ وہ اس کی نزدیکی کے بغیر اپنے دل کا آرام و سکون کھو دے اور اس کی نزدیکی کی طلب میں ہر وہ حرکت کر گزرے جو اس کے بس میں ہو۔ یہاں تک ایک حقیقت ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ع

''بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے''

سے زیادہ نہیں۔

افضل کی بکٹ کہانی، فارسی مثنوی کے خاکوں کی موجودگی میں تمام تر ہندی ماحول میں لکھی گئی ہے۔ عشق کی چنگاری پہلے پہل معشوق ہی کے دل میں بھڑکی ہے۔ وہ اپنی سکھیوں کو مخاطب کر کے اپنا افسانہ غم سنا رہی ہے۔

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی　　ہوئی ہوں عشق کے غم سوں دیوانی
نہ مجھ کو بھوکھ دن سے نیند راتا　　برہ کے درد سے سینہ بر آتا

اس مثنوی میں پورا ماحول ہندی ہے۔ یہاں ہولی کی بہار نظر آتی ہے۔ چنگ و رباب کی جگہ مردنگ مجیرے بجتے ہیں۔ گل و لالہ کی جگہ عبیر و گلال نے لی ہے۔ یہاں پپیہے کی جگہ ''پی'' ہے بلبل کا نغمہ نہیں، کوئل کی کوک ہے جھینگرے کے نالے ہیں ہنڈولے کی لانبی پینگیں۔ دو جانب سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہیں۔

پپیہا[1] پہہ پہہ نس دن پکارا　　پوکارت دادر و جھنگر چنگارا
اری جب کوک کوئل میں سونا ہی　　تمامی تن بدن میں آگ لاہی
سنی جب مور کی آواز بن سوں　　شکیب از دل شدہ آرام تن سوں
ہنڈولے جھولتے سب نار پہہ سنگ　　حسد کی آگ نے جار امرا رنگ

''فقہ ہندی'' میں عبداللہ الامیں

اس مثنوی کی اہمیت محض اس کی قدامت کی وجہ سے ہے۔ اس میں ادبی چاشنی نہیں ہے اور نہ ہونے کی گنجائش تھی، کیونکہ شرعی مسائل اس میں نظم کئے گئے ہیں اور فقہ کو ادب کے سانچے میں ڈھالنا، اس کو اصل مقصد سے دور کر دینے کے مترادف ہے۔ لیکن موضوع کی خشکی کے باوجود اس عہد کی زبان اور انداز بیان سے ہم متعارف ضرور ہوتے ہیں

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں صفحہ ۱۶۰

اور اس خشکی میں بھی جا بجا نم زمین مل جاتی ہے جس سے پیاس تو نہیں بجھتی مگر ٹھنڈک کا احساس ہلکی تسکین کا باعث ضرور بن جاتا ہے۔ ایسے روکھے پھیکے موضوع میں جتنا سپاٹ پن ہونا چاہئے تھا وہ بحر کے انتخاب نے کم کردیا ہے۔ اس کو طبیعت سے قریب کرنے کی یہی صورت تھی جس کی طرف شاعر کی نگاہ پہلی ہی توجہ میں گئی ہے۔ پھر بھی فارسی، عربی بحروں سے زیادہ ہندی بحروں کا اثر اس پر غالب ہے، اس لئے سادہ پڑھنے سے زیادہ ساز پر لئے اور دھن درست کرنے کے بعد موزونیت زیادہ نمایاں ہوگی۔ اردو والوں کی زبان ہندی بحروں پر بہت مشق کے بعد ہی رواں ہوسکتی ہے۔ مثلاً مقطع کے اس شعر کو لیجئے ؎

کتنے مسلے دین کے عبدی کہے امیں
فقہ ہندی زباں پر بوجھو کرو یقیں

یہ مثنوی عہد عالمگیر میں ۱۰۷۴ھ میں لکھی گئی ہے، جس کا ذکر مصنف نے اس شعر میں کیا ہے ؎

سن ہزار چوہتر بیچ ماہ رمضاں تمام
اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا نظام

اس لئے یہ مثنوی میرؔ کے والد علی متقی متولد ۱۰۸۲ھ سے بھی آٹھ سال بڑی ہے۔

''دردنامہ'' و ''محشرنامہ'' شیخ جیونؔ

یہ مثنویاں بھی مذہبی طرز کی ہیں۔ ان میں سے ''دردنامہ'' منظوم سیرت النبیؐ ہے۔ اہل تحقیق کی رائے میں اس کی تصنیف کا سن ۱۱۳۰ھ صحت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔ مصنف کے نام میں بھی اختلاف ہے لیکن محبوب عالم پر اس دور میں بعض شواہد کی بنا پر اتفاق کرلیا گیا ہے۔ کیونکہ ''دردنامہ'' کا ایک نسخہ رام پور میں ہے جس کی فہرست میں یہ عبارت مرقوم ہے۔ ''شاہ محبوب عالم جیون، معتقد قادریہ، متوطن قصبہ جھجر۔''

''محشرنامہ'' کا موضوع خود نام سے ظاہر ہے۔ اس کی حمد کا پہلا شعر

ڈاکٹر گیان چند[1] نے اسپرنگر کے حوالہ سے اپنی کتاب میں درج کیا ہے، جو ہندی دوہوں کی طرز پر ہے۔

اللہ مہدی پاک ہے جو جگ سرجن ہار
جن دھایا رصدق سوں سوئی اُترے پار

لیکن ''دردنامہ'' فارسی میں لکھا گیا ہے مگر اس میں عروضی قوانین کی پوری رعایت بالکل نہیں کی گئی ہے۔قوانی میں اخلاص کو افلاس کا ہم قافیہ لایا گیا ہے۔اردو کے قدیم شعرا میں اس طرح کا استعمال غالباً روا تھا اور شاید اسی بنیاد پر آج بھی مستند اساتذہ ضرورتاً ہم صوت قوانی کا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔چنانچہ جوشؔ نے بھی اپنی اس غلطی کو جو اس دور میں سراسر غلطی ہے ہم صوتی کی آڑ لے کر استعمال کیا ہے اور اس تصور کے ماتحت کہ ع

''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''

اپنے اس شعر پر نوٹ بھی دے دیا ہے کہ ''میں جائز سمجھتا ہوں'' مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم صوت قوانی املا کے اختلاف کی صورت میں نہ صرف متروک ہیں بلکہ عقلاً بھی درست نہیں ،قدما میں بھی اس کی کثرت نہیں ہے بلکہ خال خال ایسی مثالیں ملتی ہیں ''دردنامہ'' بھی اسی مرض کا مریض ہے۔لیکن ان چند نقائص کو نظر انداز کر کے مجموعی طور پر اس میں روانی اور دل پذیری ہے اور شاعر کے دلی جذبات کا پتہ چلتا ہے کہ پورے شغف سے مثنوی نظم کی گئی ہے۔

نسخہ[2] رام پور میں ابتدائی اشعار یوں مرقوم ہیں۔

جیوں میں پہل نام رحمان کا	پتوں گیان میں دھیاں بجان کا
سبھی ایک کرتار وہ پاک ہے	کھڑا جس کی قدرت سے افلاک ہے
وہی ہے کرن ہاری عالم خدا	نرنجن ، نرنکار ، سب سے جدا

اس دور میں جبکہ زبان اردو بالکل خام تھی۔رزم میں زوردار اشعار نکال لینا شاعر

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں صفحہ ۱۶۴ [2] اردو مثنوی کا ارتقا

کے اپنے زور طبیعت کا پتہ دیتا ہے۔ شیخ جیونؔ جنگ احد کی گھمسان معرکہ آرائی کی تصویر یوں کھینچتے ہیں:

ترنگوں کی پھر تنگ کھینچی لگام — بھئی دنگ اس جنگ کی دھوم دھام
دھمادھم گھماگم ہوئی پھیر کر — لیا ایک نے ایک کو گھیر کر
کہیں برچھیاں ترچھیاں ہاتھ میں — ہوئے مرد کے مرد جب گھات میں
کرے سیل کی ریل اوت کھیل کر — لیا مردنیں مرد کو پیل کر
شپاشپ چلے تیر پہ تیر زور — کھپا کھپ ہوئی پار سینخوہ پھوڑ

اس مثنوی سے اس بات کا پورا اندازہ ہوتا ہے کہ اب زبان پر فارسیت کا اثر غالب ہوتا جاتا ہے اور قدیم ہندی روش جس میں بحریں بھی ہندی ہی کی پسند کی جاتی تھیں، فارسی طریقہ بیان اور انداز فکر میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ اگرچہ ہندی کے ٹھیٹھ الفاظ موجود ہیں مگر اب وہ سنگھاسن کی جگہ تخت زریں پر متمکن ہیں۔

''طوطی نامہ'' میر جعفر زٹلی

جعفر زٹلی کو محض ان کی ''زٹلیت'' یعنی زٹل پن کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کے معقول کلام کا کافی حصہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں موجود ہے۔ اگرچہ ان کی شہرت کا زیادہ تر سبب ان کے مزاحیہ اشعار ہی ہیں۔ مثلاً:

کشتی جعفر زٹلی در بھنور افتادہ است
ایکوں ڈبکوں میکند در یک دودھکا پار کن

میرے خیال میں جعفر کے اس قسم کے اشعار محض مزاحیہ سمجھ کر مسکرا کے خاموش ہو جانا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ زبان میں جس وقت تبدیلی آ رہی تھی اور فارسیت اس قدر چھاتی جا رہی تھی کہ ملک کی موجودہ زبان کا حلیہ ہی بدلتا جا رہا تھا۔ فارسی کے پورے پورے جملے کے درمیان ہندی کے چند الفاظ بھی آ جاتے تھے اس وقت ان لوگوں کو جو ایک مستقل زبان بولنے والے

تھے کتنی الجھن محسوس ہوتی ہوگی اور کتنی نامانوس معلوم ہوتی ہوگی کہ یہ نہ تو خالص فارسی ہے اور نہ خالص ہندی۔ اس لئے انہوں نے مزاحیہ انداز میں بدلتی ہوئی زبان پر اپنے اشعار میں بھرپور طنز کیا ہے۔ اگر یہ مصرعہ ''مرم با یک دگر سنتے و کہتے'' قابل قبول ہے تو کیوں نہیں ع ''بلد نہ ثلد نہ جلد زحا'' صحیح اور فصیح مانا جائے۔ دوسرے اپنے نہج پر انھوں نے مزاحیہ پہلو کر کے گہرے طنز کا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ میر جعفر زٹلی فرخ سیر کے حکم سے اس بنیاد پر قتل کر دیئے گئے کہ انھوں نے فرخ سیر کے سکّہ کے منقوش شعر کو تبدیل کر دیا تھا۔ کیونکہ ''بادشاہِ بحر و بر'' کا دعویٰ اس کی حکومت کے ضعف کے پیش نظر کذب صریح سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ کہاں کمزوری کا یہ عالم کہ تخت گاہ میں تخت نشینی تک میسر نہیں ہوئی۔ عظیم آباد سے دور ایک باغ میں خیمہ لگا کر سر پر تاج رکھ کر بادشاہ بن بیٹھا اور کہاں یہ دعویٰ بلند ؎

سکّہ زد از فضل حق بر سیم و زر
بادشاہِ بحر و بر فرّخ سیر

جعفر زٹلی سے یہ بلند ہنگام دعویٰ برداشت نہ ہوا اور اس کے جواب میں یہ شعر لکھا ؎

سکّہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر
پادشاہِ بشہ کش فرّخ سیر

جعفر زٹلی میں بہت خوبیاں موجود تھیں۔ ان کے کلام سے ان کی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے، لیکن ان کی پُر مزاح طبیعت ان پر اس قدر غالب تھی کہ قوم ان کو اسی رُخ سے پہچان سکی اور ان کی سنجیدگی ان کے مزاح پر غالب نہ آسکی۔ چمنستان شعرا میں محمد اعظم شاہ کا قول نقل کیا ہے کہ ''ملک الشعرائی اک مقام رکھتے تھے مگر ان کی زٹل نے ان کو یہ مقام حاصل کرنے نہ دیا۔'' اور ہے بھی یہی بات کہ ان کا مزاح بڑھتے بڑھتے فحش گوئی تک پہنچ جاتا ہے۔

آج ہمارا دور فحش گوئی اور عریانیت کے لئے ''نیچرل شاعری'' اور ''فطری و نفسانی کیفیات کی عکاسی'' جیسے الفاظ کا جتنا بھی سہارا تلاش کرے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ فحش گوئی

اور عریانیت اس دور میں بھی پسندیدہ نہیں تھی جبکہ خود اعلیٰ طبقہ و معاشرہ فحشیات میں مبتلا تھا اور ہر فحاشی روا تھی۔ خلوت کی باتیں جلوت میں کبھی پسند نہ کی گئیں۔ بری باتیں تو بری ہیں، اچھی باتیں بھی جو پردۂ راز میں رکھنے کے قابل ہیں اور جن کو اسرارِ حق سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کا اظہار بھی پسند نہیں کیا گیا ہے۔ شمس تبریز کہتے ہیں۔

انچہ نتواں گفت اندر صومعہ باز اہداں
بے تحاشا بر سرِ بازار میگوید بگو

تو ناپسندیدہ باتوں کا برملا اظہار کب ہوگا؟ فحش باتوں کو کھلے لفظوں میں بیان کرنے کی وجہ محض قادر الکلامی کا نقصان ہے اور کچھ نہیں۔ مگر اعتراض ان پر ہے جو قدرت کے باجود جادۂ اعتدال سے گذر کر گمراہ ہو گئے۔ اس لئے جعفر زٹلی اور ان کے بعد انشا یقینی قابلِ گرفت ہیں۔ ان کی اسی بے اعتدالی کا اثر ہے کہ ان کے سنجیدہ کلام میں بھی غیر شعوری طور پر سوقیانہ اور بازاری الفاظ آجاتے ہیں۔ جعفر زٹلی نے متعدد اہم اور تاریخی مثنویاں لکھی ہیں۔ از اں جملہ ''ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالمگیری'' ہے۔ اس میں اورنگ زیب کے دکن کی معرکہ آرائیوں کا حال لکھا ہے۔ لیکن تحت شعور میں مزاح اور سوقیانہ الفاظ جو پڑے ہوئے ہیں بے ساختہ قلم سے نکل گئے ہیں۔

اورنگ زیب کی موت پر اس کا مرثیہ ''مرثیہ اورنگ زیب'' اور صفت جلوس اعظم شاہ بعد عالمگیر'' کے علاوہ مثنوی ''در وصف پیری''، ''شپش نامہ'' وغیرہ سنجیدہ اور کچھ مثنویاں ہجویات میں لکھیں۔ ایک مثنوی ''طوطی نامہ'' ہے جس میں طوطی سے مراد روح ہے۔ یہ تمثیلی انداز ہے، جس کے چند اشعار:

سنو اے طوطی روحانی من	نہ کر رغبت بہ رنگیں پنجرہ تن
بصد غفلت برائے آخر از وے	بعقلت (کذا) این پنجرہ تا کے
نہ تو رہتی نہ یہ پنجرہ رہے گا	بلا کر لال تجھ کو کیا کہے گا
جو پوچھے لال تجھ کو لال پیارا	کہ پنجرہ بیچ میں کیا کیا سنوارا

چہ خواہی داد اے طوطی جوابش | مکن امروز فکر ایں خطابش
نہ جاگی لال کے لو میں کبھی تو | نمی دانم کہ کیا انچھر پڑی تو
تجھے جب آئے گی بلّی دبوچے | پکڑ کے پنکھ پر اور ماس نوچے
تجھے کب کون اے طوطی چھڑاوے | پکڑ بلّی کے پنجے سے بچاوے

''تولدنامہ بی بی فاطمہ''

یہ اسمٰعیل امروہوی کی مثنوی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی مثنویاں ہیں۔ ادبی اعتبار سے تو ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اسمٰعیل، جعفر زٹلی کے معاصر اور عہد عالمگیر کے شعرا میں ہیں اس لئے ان کی مثنویاں تبرکات میں ہیں اور معمر و مُسن ہونے کی وجہ سے قابلِ احترام ہیں۔ ''تولدنامہ بی بی فاطمہ'' ڈاکٹر عبدالحق کی نگاہ میں شمالی ہند کی قدیم ترین بلکہ سب سے پہلی مثنوی ہے اس پر ان کا نوٹ ان کے رسالہ اردو میں شائع ہو چکا ہے۔ مگر حیرت ہے سب سے پہلی مثنوی انہوں نے اس کو کیسے قرار دیا، جب کہ افضل کی ''بکٹ کہانی'' موجود ہے اور وہ اس سے ناآشنا بھی نہیں ہیں۔

اسمٰعیل اگر چہ امروہوی ہیں لیکن ان کی زبان پر دکنی رنگ غالب ہے۔ کیا عجب یہ اسی ماحول میں لکھی گئی ہو۔ مثنوی کے دو اشعار نمونتہً درج کئے جا رہے ہیں۔

الٰہی تو صاحب ہے سنسار کا | ہمیں کوں ہے امید دیدار کا
ترا نام ہر دم کوئی لیوتا | ٹھکانا جنت بیچ اس دیوتا

مثنویات فائزؔ دہلوی

نواب صدرالدین خاں فائزؔ یہ بھی عہد عالم گیری کے شعرا میں ہیں فارسی کے ساتھ اردو کے بھی ممتاز شعرا میں ہیں۔ ان کے کلیات میں متعدد مثنویاں ہیں جن کی تعداد تقریباً سولہ سو تک چلی جاتی ہے۔ یہ مثنویاں مختلف موضوعات پر لکھی گئی ہیں چند ایک کے

سوا زیادہ تر موضوع اپنے گردو پیش ہی سے لئے گئے ہیں۔ جس سے یہ مثنویاں ماحول کی ترجمان بن گئی ہیں لیکن گردو پیش میں بھی ان موضوعات کو خاص طور مدنظر رکھا گیا ہے جہاں عشق کی سمائی بخوبی ممکن تھی۔ مثلاً ''تعریف پنگھٹ''، ''تعریف ہولی''، ''در وصف بھینگرن درگاہ قطب''، ''رقعہ بہ محبوب''، ''در وصف کا جھن''، ''در وصف تنبولن'' وغیرہ جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آدمی چلتے ہوئے تھے اور جدھر بھی جاتے تھے حسن طلب نگاہ اپنے شکار کی تلاش میں لگی رہتی تھی اور جہاں کہیں کوئی حسن نظر آ گیا جذبات عشق میں شورش شروع ہوگئی، پھر جو کچھ دل میں خیالات آئے وہ انھوں نے اشعار کی شکل میں کاغذ کے صفحات پر بکھیر دیئے۔ اس لئے ان کو عاشق صادق کی پوزیشن تو نہیں دی جا سکتی۔ البتہ شتر بے مہار عاشق ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ تنبولن نے ایک بیڑہ پان دکھا کر رجھایا۔ کہیں کوئی بھینگرن بان مار گئی، کبھی کسی جوگن کے اسیر زلف ہوئے، کبھی پنگھٹ پر تربت حسن سے شادکام ہوئے۔ غرض جہاں پہنچے طلب نگاہ کے ساتھ پہنچے اور تسکین نظر ہوتی رہی۔ عالم خیال میں محبوب کو رقعے پر رقعہ لکھتے رہے اور احوال دل کہتے رہے۔ لیکن اس نظر بازی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ جذبات محبت کی ترجمانی انہوں نے بالکل فطرت کے مطابق کی۔ تصنع اور بناوٹ سے دور رہتے ہوئے بالکل سادہ انداز میں اظہار خیال کا ملکہ پیدا ہو گیا۔ ایک بھینگرن کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:-

ایک دیکھی میں بھینگرن دل ربا	من ہرن، کنچن برن حوریں لقا
اچھپڑا اندر کسوں تھی خوب تر	حسن اس کا تھا بری سوں بیشتر

ایک پنگھٹ پر پہنچے تو اندر کی سبھا نظر آئی۔ منظر پیش کرتے ہیں:-

ہر اک پنہار واں کی اچھپڑا تھی	کنویں کے گرد اندر کی سبھا تھی
بیاں کیونکر کروں ان کی میں رفتار	کرو تقریر کیا پچن کی جھنکار
رواں تھے بھے چند راجا رے	زمیں پر سیر کرتے تھے ستارے
لے آتی تھی بجریا ایک سندر	لے جاتی اک گگریا سیس پر دھر

سیں کی رنگ رنگ لہنگا و ساری   کنارے ان کے تھی تا نکی کناری

یہ صحیح ہے کہ فائز نے عاشقانہ مزاج پایا تھا اور جدھر جاتے تھے ایک معشوق طرحدار ان کی پیشوائی کو خواہ کسی طبقے سے ہو آ موجود ہوتا تھا، مگر شاید انھیں اپنی فطری کمزوری کا احساس بھی تھا، اس لئے ''مناجات'' لکھ کر انھوں نے توبہ استغفار کر لی ہے۔ اسی طرح شاہ ولایت کی مدح لکھ کر سنجیدہ طبقہ کا بھی قرض چکا دیا ہے۔

مثنوی شاہ مبارک آبرو

آبرو نے خود اس مثنوی کا کیا نام رکھا تھا اور اس کے لئے کیا عنوان قائم کیا تھا، معلوم نہیں۔ تذکرہ نویسوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مضمون کی مناسبت سے ایک نام رکھ لیا ہے۔ ''مخزن نکات'' میں ''تعلیم آرائش خوباں روزگار'' سے تعارف کرایا ہے۔ مثنوی میں کوئی خاص بات نہیں۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ ایک نوخیز لڑکے پر نظر پڑی جو خوش رو تھا مگر لباس و پوشاک سے آراستہ نہ تھا ان کو خیال ہوا کہ اگر سنور جائے تو معشوق طرحدار بن سکتا ہے یہ پاس پہنچے، باتوں میں لگایا، جب اس کو معلوم ہوا کہ آبرو یہی ہیں تو کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے کہا میں حسینوں کا ذکر اپنے اشعار میں کرتا ہوں، تم حسین تو ہو مگر تم کو حسینوں کی طرح سج دھج کر اچھے لباس میں رہنا نہیں آتا۔ اس نے کہا، مجھے آرائش کا طریقہ سکھائیے۔ انھوں نے تو پہلے کنگھی چوٹی کا زبانی طریقہ سکھایا، پھر لباس، پوشاک کے اصول بتائے اور اس سلسلہ میں ایک مثنوی بھی لکھ دی تاکہ قواعد معشوقی منضبط ہو جائیں اور دوسروں کے لئے بھی ''عندالحاجت بکار آید'' کی مصداق ہو۔ تعلیم آرائش کے ساتھ کچھ کار آمد نصیحتیں بھی ہیں، مثلاً:-

جس کو تو جانے کہ عاشق زور ہے   غرق تیرے عشق میں سر پھوڑ ہے
اس ستی کچھ مانگنا درکار نئیں   آپ سیتی لا نہ دے وہ یار نئیں

معلوم نہیں اپنا خیال لکھا ہے یا کسی امرد پرست کی ترجمانی کی ہے۔ ان کی غزل کا ایک شعر ہے:-

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی
جہاں جاویں وہاں دو چار ہم کو تاک رکھتے ہیں

مثنوی سے ادبی نفع صرف اتنا ہوتا ہے کہ اپنے متقدمین کے مقابلے میں زبان زیادہ صاف ہے۔ معلوم نہیں حالات اور جذبات کے ماتحت اس مثنوی کے سوسے بالا اشعار لکھ کر اپنے قیمتی وقت کی بے قدری کی ورنہ غزل کی زمین میں آبرو اپنا مقام رکھتے ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناں کے معاصرین اور بے تکلف دوستوں میں ہیں۔ دونوں میں معاصرانہ چشمک بھی رہی۔

مثنوی عشقیہ

یہ مثنوی جعفر خاں زکی کی ہے۔ انھوں نے اور مثنویاں بھی لکھیں جن کا ذکر گلزار ابراہیم متذکرہ میر حسن، گلشن گفتار وغیرہ میں موجود ہے۔ میر تقی میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ کے حکم سے مثنوی ''حقہ نامہ'' لکھنی چاہی تھی مگر طبیعت حاضر نہیں ہوئی اس لئے دو شعر سے زیادہ نہ لکھ سکے۔ شاہ حاتم نے اس کی تکمیل کی۔

عشقیہ مثنوی وقت کے مطابق شعری خصوصیات سے بے مایہ نہیں ہے بلکہ دلچسپ تشبیہات و استعارے، صنعت ایہام، تلازمہ بندی کی خوبیاں بھی رکھتی ہے اور جذبات محبت سے بھری ہے۔

جلا جیوں پھلجھڑی مجھ ناتواں کو
شرر لبریز کر ہر استخواں کو

تشبیہہ و تلازمہ ومحاورات

صفا ان کی بنا گوں شو کی دیکھ آں — خجالت سے رہا موتی پکڑ کاں
چمکتے رنگ پاں سے داغ سارے — درخشاں جیوں شفق کے بیچ تارے
زبس گلبرگ لب میں نازکی ہے — کٹورے میں پیے ہے پھول کی مے

مثنویات شاہ حاتم

شاہ ظہور الدین حاتم دہلوی، ان کی متعدد مثنویاں ہیں۔ سراپا، ساقی نامہ، مثنوی، در وصف تمباکو و حقہ، در وصف قہوہ، مثنوی بہاریہ وغیرہ۔ شاہ حاتم کا دور دہلی میں غزل کے عروج کا دور تھا اور یہ مذاق روز بروز بڑھتا ہی چلا گی۔ یہاں تک کہ غزل کے میدان میں میر تقی میر جیسا شاعر پیدا ہوا۔ یہ بندگان میر کے پیش روؤں میں ہیں۔ شاہ حاتم کی مثنوی سراپا میں سراپائے محبوب کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ اس دور سے مثنوی پر بھی غزل کا انداز نمایاں ہونے لگا تھا۔ حاتم سراپائے محبوب کی تعریف میں قامت موزوں کا تعارف اس طرح کرتے ہیں۔

چمن میں دیکھ کر یہ قد و قامت ہوئی سرو صنوبر پر قیامت
گیا قمری کے دل سے سرو کا شوق ہوئی لونڈی گلے میں ڈال کر طوق

ساقی نامہ: شرابِ حقیقت کی تیزی۔

ہے اس بزم کی اس قدر تند مے
پیے جو کہے جل گئے جل گئے

زندگی کی ناثباتی:

یہاں بے خبر اب نہ لے نام عمر
لبا لب ہوا ہے ترا جام عمر

''در وصف تمباکو و حقہ'' : گزشتہ اوراق میں ذکر آیا تھا کہ زٹلی نے اس موزوں پر دو شعر لکھے اور مثنوی کی تکمیل شاہ حاتم نے کی۔ یہ وہی مثنوی ہے مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ خود زٹلی کے وہ دو اشعار کون تھے۔ شاہ حاتم کے تین شعر نقل کئے جا رہے ہیں۔

نہ حقہ میں صدائے سر سری جان کنھیا ہاتھ گویا بانسری جان
نہ نے پر سالوے برہاں پوری بوجھ یہ کالے پر تو کالی کینچری بوجھ
جلوس دست محبوباں ہے نیچہ جلیس و ہمدم خوباں ہے نیچہ

تمام مثنویوں میں ان کی معرکۃ الآرا مثنوی ''بزم عشرت'' یہ بہاریہ مثنوی ہے۔ مختلف عنوانات پر اس میں ساڑھے تین سو سے بالا اشعار موجود ہیں۔ ''سرگذشت حاتم'' میں ڈاکٹر زور ایک قلمی نسخہ کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف کی فارسی عبارت نقل کرتے ہیں جو مصنف نے خود لکھی ہے۔ ترجمہ اصل عبارت:

''میرا کلیات شاہ درّانی کے ہنگامے میں مع اثاث البیت کے لٹ گیا اس مثنوی کے آخر میں دو قطعات اور تھے جو اب مسودے میں نہیں ملتے۔ ان کے عنوانات 'مجلس رقص' اور 'خاتمہ' تھے۔ یہ تقریباً سو اشعار پر مشتمل تھے۔ کسی کے پاس اس کی نقل ہو تو پہنچا دے۔''

ہولی کے منظر کے چند اشعار لکھے جا رہے ہیں:-

مہیا سب ہیں اب اسباب ہولی — اٹھو یارو بھرو رنگوں سے جھولی
اِدھر یارو اُدھر خوباں صف آرا — تماشا ہے تماشا ہے تماشا
چمن میں دھوم وغل چاروں طرف ہے — اِدھر ڈھولک اُدھر آوازِ دَف ہے
ادھر عاشق اُدھر معشوق کی صف — نشے میں مست ہر یک جام بر کف
گلال ابرک سے سب بھر بھر کے جھولی — پکارے یک بیک ہولی ہے ہولی
لگی پچکاریوں کی مار ہونے — ہر اک سو رنگ کی بوچھار ہونے
کوئی ہے سانوری کوئی ہے گوری — کوئی چمپا برن عمروں میں تھوڑی

شاہ حاتم کے یہ چند ہی اشعار زبان کی شستگی، زور کلام، جذبات کی فراوانی، خیالات کی ندرت اور شاعر کے تجربات کو بڑی وضاحت سے پیش کر رہے ہیں اور اس کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ مثنوی انداز بیان میں غزل سے قریب ہوتی جاتی ہے۔

مثنوی فضائل علی خاں

یہ مثنوی ناپید ہے، مگر اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے مورخین کی نگاہ میں قابلِ لحاظ

تھی۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے 'شعر الہند' میں اس کا تذکرہ کیا ہے اور بعد کی مقبول عام مثنوی میر حسن موسوم بہ 'سحر البیان' کے لئے اس مثنوی کو بنیاد قرار دیا ہے کہ:

"نے جس عمارت کی بنیاد ڈالی تھی، اس کے کنگروں کو انھوں (میر حسن) نے اور بلند کیا۔"

اس مثنوی کے متفرق حصوں کے اشعار مختلف تذکروں، تذکرہ میر حسن، گلزار ابراہیم، تذکرہ مسرت افزا وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔

مثنوی کی بنیاد یہ ہے کہ فضائل علی کسی مطربہ پر عاشق تھے۔ جب الٰہ آباد پہنچے تو اس کی یاد ستاتی رہی۔ غم غلط کرنے کو وہاں ایک طوائف سے رو و رسم پیدا کی اور دل دے بیٹھے۔ خواب میں محبوبہ اوّل سے ملاقات ہوئی۔ اس نے اس بے وفائی کی شکایت کی۔ جب کواب سے بیدار ہوئے تو اس کا اسی قسم کا شکایت آمیز خط ملا۔ مثنوی لکھنے کا باعث یہی واقعہ ہے۔

صاحب گلزار ابراہیم اگر چہ اس مثنوی کو "بے نمک" کہتے ہیں لیکن میر حسن کی نگاہ میں اس کا وہ حصہ جو عورتوں سے تعلق رکھتا ہے بہت خوب ہے۔ اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ سحر البیان پر اس کا اثر ضرور پڑا ہے۔ شیوہ حسن و عشق کا بیان اس طرز پر کیا ہے:۔

یہاں تو ڈسے زلف کی ناگنی | نہ ہرگز یہاں بھاگنے سے بنی
یہاں خون کرتے ہیں مہندی کے ہاتھ | یہاں گھیر رکھتے ہیں دامن کے ساتھ
یہاں اونچی چولی میں کرتے ہیں بند | یہاں کھینچے بندوں میں ہیں لاکھ بند
یہاں اونچی چولی میں اٹکے ہے دل | یہاں پیچے بندوں میں لٹکے ہے دل
یہاں عید قربان دن رات ہے | یہاں ذبح کر ڈالنا بات ہے
یہاں ہیں جہاں گیریاں بادشاہ | یہاں ہاتھ باندھے کھڑے مہر و ماہ
یہاں اپنے پاؤں سے چلتے نہیں | یہاں کچھ لئے بن نکلتے نہیں
قیامت ہے یا مسکرانا تنک | غضب ہے یہاں چوڑیوں کی جھنک
یہاں تو لنک چال میں جی لگے | یہاں ایک سسکی میں سسکی لگے

پری رویوں کے جمگھٹ کا منظر یوں پیش کرتے ہیں:۔

کوئی ماہ رو اور کوئی مشتری	کوئی بچھڑا اور کوئی پری
کوئی برق جوں جھنجلاتی پھرے	کوئی دل ربا آشنائی بھرے
کوئی ریختہ گو کوئی شعر باز	کبیشر کوئی اور کوئی دل نواز
کوئی دیکھ زلفوں کو کھاتی ہے بل	کوئی ہر گھڑی بیٹھتی ہے سنبھل
کوئی سادی چولی اوپر کھولے بال	کسی کو کوئی مارتی تھی رومال

یہ مثنوی اس بات کی شاہد ہے کہ شاعر میں شاعرانہ صلاحیتیں بھرپور ہیں۔اتنی قدیم ہوتے ہوئے بھی ایک کشش رکھتی ہے۔زبان رواں ہو چکی ہے۔ادبی وشعری نکتے نظرانداز نہیں ہوئے بلکہ ان کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

مثنوی گوہر جوہری

یہ مثنوی شاہ آیت اللہ[1] شورش کی ہے۔ یہ اردو میں شورش تخلص کرتے تھے۔ان کا فارسی دیوان بہت پاکیزہ اور معیاری ہے۔مثنوی جوہری عرصہ دراز سے مفقود تھی اس کا ایک مخطوطہ آج سے تقریباً تیس پینتیس سال پیشتر دستیاب ہوا،اپنے تصنیف کے زمانہ میں اس کی شہرت کہاں سے کہاں پہنچی اس کے متعلق کوئی واضح بات نہیں کہی جا سکتی۔اس مثنوی کا سن تصنیف ۱۱۶۱ھ ہے جس کی وضاحت خود مصنف نے کر دی ہے۔ جو واقعہ تغیر وتبدل کے بعد اس میں نظم کیا گیا ہے اسی سے ملتا جلتا واقعہ مثنوی ''تصویر محبت[2]'' مصنفہ میر شمس الدین فقیر دہلوی میں موجود ہے۔ ''تصویر محبت'' ۱۱۵۶ھ میں لکھی گئی۔گویا ''تصویر محبت'' کی تصنیف کے چار ہی سال کے بعد ''مثنوی گوہری'' لکھی گئی۔دونوں میں واقعات اور ہیرو کے نام میں مماثلت ہے۔فارسی مثنویوں میں ممدوح کا نام رام چندر ہے اور گوہر جوہری میں رام راجہ۔

---

[1] آیت اللہ شورش عظیم آباد پٹنہ کی مردم خیز علمی بستی پھلواری شریف کے باشندہ تھے۔ بڑے پایہ کے بزرگ اور آبائی خانقاہ کے سجادہ نشیں تھے۔۱۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۱۰ھ میں وفات پائی۔

[2] عیارستان صفحہ ۱۸۴

دونوں مثنوی کا اختتام اس طرح ہوا ہے کہ معشوق کسی حادثہ کا شکار ہو کر مر جاتا ہے پھر ایک شعلہ متواتر کئی راتوں تک اپنے عاشق کا نام لے کر پکارتا ہے۔ اور ایک روز عاشق شعلہ کے قریب پہنچ کر شعلہ میں جذب ہو جاتا ہے۔ میر نے بھی اپنی مثنوی کا اختتام اسی طرح کیا ہے اور ہیرو کا نام پرسرام رکھا ہے۔ لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ مثنوی گوہر جوہری پہلے لکھی گئی یا میر کی ''شعلۂ شوق''۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جذب عشق کا کمال دکھانے کے لئے یہ حیرت انگیز صورت ''تصویر محبت'' کے بعد سب کو بھلی لگی اور اپنی مثنویوں کے اختتام کے لئے یہ صورت سب نے پسند کی۔ عظیم آباد پٹنہ کی ایک داستان عشق مشہور ہے جو اسی قسم کی ہے اور اس کی صداقت پر کچھ شہادتیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔ واقعہ کی تفصیل کسی مناسب مقام پر آئے گی۔

مثنوی گوہر جوہری میں واقعات دو بحروں میں بیان کئے گئے ہیں۔ درمیان میں بارہ ماسہ آتا ہے جو ''بکٹ کہانی'' کی بحر میں ہے۔ بقیہ مضامین مفاعیلن مفاعیلن فعولن کے وزن میں منظوم ہوئے ہیں۔

زمیں کوں ہے قبائے سبز در بر — سُمیں ایسے میں پیو میرے ہیں باہر
تجھے تو گرمی بازار ہے گل — مری آنکھوں میں آتش راز ہے گل

بارہ ماسے کا انداز بیان یہ ہے:

اساڑھ آیا لگا بادل گرجنے — اندھیری رات میں بجلی چمکنے
گھٹا ساون کی کاری جب پڑی جھوم — مرے بھی بیچ برہا آ کرے دھوم

جائزہ

افضل کی ''بکٹ کہانی'' سے حاتم اور ان کے دیگر شعرا کی مثنویوں کے اجمالی مطالعہ سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں کہ اردو میں مثنویوں کی ضرورت پہلے پہل صوفیا نے محسوس کی اور اس کو اپنے ارشاد و تبلیغ کا ذریعہ بنایا جیسا کہ دکنی مثنویوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ اس وقت ان مثنویوں کی حیثیت کلام موزوں سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک مقصد تبلیغ تھا جو پورا کیا جا رہا تھا۔ مگر اسی دور میں فارسی مثنویوں کی اتباع میں عشقیہ مثنویوں کا چلن بھی

شروع ہوا اور مثنویاں ادبی چاشنیوں سے لذت آشنا ہونے لگیں۔ اب زبان و بیان کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی۔ زبان میں صفائی کا خیال خاص طور سے رکھا جاتا۔ جذبات سیدھے سادھے انداز میں پیش کر دیئے جاتے تھے۔ چونکہ انداز فطری تھا اس لئے ان میں تاثیر بھی ہوتی تھی مگر نہ اتنی کہ دل اور دماغ دونوں متاثر ہو اور آہ کے ساتھ واہ کی صدا بھی بلند ہو۔

رفتہ رفتہ معاشرے کی چھاپ بھی مثنوی پر پڑنے لگی اور زندگی کے لوازمات، تفریح طبع کے سامان، دل چسپ واقعات اور مناظر فطرت کی تصویر کشی کو بھی مثنوی میں جگہ ملنے لگی۔ شاعرانہ بلندیٔ فکر اور صنائع و بدائع نے اس کے حسن کو اور بھی دوبالا کر دیا۔

میر و مرزا کو مثنوی کا وہ میدان ملا تھا جو نشیب و فراز سے تقریباً صاف ہو چکا تھا، ان کو رہی سہی کمی کو دور کرنے میں کچھ زیادہ زحمت کی ضرورت پیش نہ آئی اس لئے ہر رخ پر اپنے اشہبِ فکر کو بے تکان دوڑاتے رہے۔ مدح و ذم، عشق و محبت، اجتماعی اور شخصی زندگی کی طرب افزا اور حزن انگیز داستانیں نیز بالکلیہ نجی باتیں تک مثنوی میں اس طرح جگہ پا گئیں کہ کہیں تفریح طبع کا ذریعہ بنیں تو کہیں تاریخی شہادتیں۔

داستانی مثنویوں میں مافوق الفطرت باتیں جو قدیم سے چلی آتی تھیں اس کو یہ حضرات بھی نہ مٹا سکے اور یہی سمجھتے رہے کہ جب تک بعید از عقل اور دور از کار باتیں نہ ہوں وہ داستان داستاں ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے بعد ان کے متبعین بھی اسی ڈگر پر چلتے رہے۔

میرؔ کے بعد اردو مثنویاں

معاصرینِ میرؔ

سوداؔ

مثنوی نگاری کا مذاق اگر چہ شمالی اور جنوبی ہند میں عام ہو چکا تھا لیکن میرؔ و سوداؔ کے عہد تک اس میں وہ تنوع اور نگارنگی نہیں پیدا ہوئی تھی جو میرؔ اور سوداؔ نے اس میں پیدا کی۔ اب تک مثنوی یا تو ارشاد و تبلیغ کی غرض سے مذہبی رنگ میں لکھی گئی یا محض ذہنی تفریح کا ذریعہ عشقیہ مثنویوں کی شکل میں بنی رہی مگر میرؔ اور سوداؔ نے اس کو زندگی سے قریب کر دیا۔ اب مثنوی زندگی کی کہانی بھی سناتی، موسم اور فضا کا حال بھی بتاتی، ہجو و ذم کی شکل میں دل کا بخار بھی نکالتی اور مدح و ثنا کی صورت میں اظہار تشکر بھی کرنے لگی۔

سوداؔ کی تو اپنی ہجو گوئی کے لئے ایک وسیع میدان کی ضرورت تھی اور وہ ان کو مثنوی کے روپ میں مل گیا، مدحیہ قصائد میں تو وہ امام تھے ہی ہجو یہ مثنوی میں بھی انھوں نے مجتہد کا مقام حاصل کر لیا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر مثنویاں ان کے شاگردوں کی مثنویوں سے ایسی خلط ملط ہوگئی ہیں کہ اب تمیز مشکل ہوگئی ہے لیکن وہ مثنویاں جو بلا شرکت غیر ان کی ہیں، اور مورخین کا اس پر اتفاق بھی ہے۔ ان میں ''عشق شیشہ گر بہ زرگر پسر'' ''موسم سرما''

''در تعریف شکار آصف الدولہ'' ''ہجو پیل راجہ ترپت سنگھ'' ''ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال'' ''ہجو میر ضاحک'' وغیرہ ہیں۔

سوداؔ نے اگرچہ مثنویاں لکھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس میدان کے مرد ہی نہ تھے۔ مثنوی خواہ کسی قسم کی ہو، مگر وہ ایک مرتب واقعہ بیان کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر مناظر فطرت کو بیان کرتی ہے تو وہاں بھی ترتیب بیاں سے ایک واقعاتی مرقع کھینچ دیتی ہے۔ سوداؔ تخیل کے بادشاہ تھے۔ بلند فکری اور مبالغہ ان کی طبیعت کا خاص جوہر تھا، اس لئے وہ اپنی مثنویوں کو بھی اس سے نہ بچا سکے بلکہ جو رنگ بھرا اس میں مبالغہ کا ہی موئے قلم استعمال کیا۔ اس لئے تفریح طبع کا ذریعہ تو وہ مثنویاں ضرور بنیں لیکن وہ تصویر نہ پیش کر سکیں جو میرؔ نے اپنی سادہ بیانی سے شاہکار بنا کر پیش کی ہیں۔ ایک ہی قسم کے موضوع کو میرؔ و مرزا نے مختلف عنوان کے ماتحت پیش کیا ہے لیکن دونوں کے تاثر میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک ''بسیار خوار'' کی ہجو میرؔ بھی کرتے ہیں اور سوداؔ بھی، لیکن میرؔ کی اس ہجو میں بھی ایک اندرونی کسک محسوس ہوتی ہے اور سوداؔ کا قہقہہ اُبلا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں الفاظ میں وہ لینت اور نرمی بھی نہیں بلکہ ضلع بازی کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔

میرؔ	سوداؔ
اس کے آنے کی سن کے بازاری	جاوے بازار کو اگر وہ لئیم
کرتے ہیں سودوں کی خریداری	خلق سمجھے کہ پہنچی فوج غلیم
کوئی تختہ کرے ہے دوکاں کو	نان با، بنیے، کنجڑے، حلوائی
کوئی لاوے بلا گزریاں کو	کہیں آفت کدھر سے یہ آئی
کنجڑے ڈھانکے ہیں ساگ پات اپنا	جو ہے دکاں میں سو اس کو بیچے
تکتے ہیں بنئے داؤں گھات اپنا	جاں یارب ہماری اس سے بچے
کہ مبادا ادھر کو آجاوے	ہر کسی بنیے کی دکاں پر جا
سردے یکسر ہمیں نہ کھا جاوے	اپنی باتوں میں اس کو لے ہو لگا

جب مرے گا وہ بھوک کا روگی　　　　کام ہر وجہ اپنا کر لیوے
روح توشے کے روٹی میں ہوگی　　　　کلے بندر کی طرح بھر لیوے

چار کے کاندھے جب یہ جاوے گا
توشے کی روٹی کو بھی کھاوے گا

میرؔ نے اپنی ہجو میں بہت سی فنی رعایتیں ملحوظ رکھی ہیں۔ وقت نظری سے کام کیا ہے۔ لیکن ہجو کا مقصد کہ سننے والے بے ساختہ ہنستے بھی جائیں پورا نہیں ہوتا۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

جب مرے گا وہ بھوک کا روگی
روح توشے کی روٹی میں ہوگی

اور سوداؔ نے کہا۔

چار کے کاندھے جب یہ جاوے گا
توشے کی روٹی کو بھی کھاوے گا

کھلی بات ہے کہ مرنے کے بعد کوئی کھا نہیں سکتا بالکل خلاف حقیقت بات ہے۔ اس نکتے کو سمجھتے ہوئے میرؔ نے لطیف انداز میں خوب کہا ہے ع ''روح توشے کی روٹی میں ہوگی'' دقت نگاہی کی داد میرؔ کو ملے گی لیکن ہجو جو سراسر قہقہہ ہے وہ سوداؔ کے اس مصرع ہی سے پھوٹتا ہے ع ''توشے کی روٹی کو بھی کھاوے گا'' ہوسکتا ہے اس کی حریص روح توشے کی روٹی کو دیکھتے ہی پلٹ آئے اور جب اسے بھی صاف کر لے تو واپس جائے۔ یہ مبالغہ خلاف حقیقت سہی لیکن بسیار خواری کی انتہا کو ظاہر کر رہا ہے سوداؔ کا ''پیٹو'' طاقتور ہے۔ مرنے پر بھی بے بس نہیں۔ میرؔ کا ''پیٹو'' مر گیا، اور میرؔ ہی کی طرح کم از کم اس آخری روٹی کی حسرت ساتھ لیتا گیا۔ سوداؔ کی ہجو میں غیر معمولی مبالغہ ہوتا ہے مگر وہ مبالغہ درحقیقت ''لئیم'' کے منہ پر زوردار طمانچہ ہوتا ہے جو میرؔ صاحب جیسے نحیف و ناتواں سے ممکن نہیں اس لئے اس سلسلہ میں وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ سوداؔ کے خوانِ نعمت کے ریزے ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ اپنی دلیا میں ملا کر

چہیلا بناتے ہیں۔

عشق شیشہ گو بہ زرگر پسر

یہ مثنوی افسانہ در افسانہ ہے۔ اس عشقیہ مثنوی کی بنیاد کو سودا نے ابتداء ہجو کی اینٹوں سے استوار کیا ہے، پھر اس پر عشق و محبت کی عمارت کھڑی کی ہے۔ پھر آخر میں تکمیل عمارت کے بعد عشق الٰہی کو اس گھر میں جگہ دے دی ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایک ریا کار زاہد نے ریا کاری کی نیت سے حج کا ارادہ کیا راہ میں رہزنوں نے سب کچھ لوٹ لیا تو بغیر حج کیے راستے ہی سے واپسی کا ارادہ کیا۔ سودا نے کہا حضرت اگر بغیر کعبۃ اللہ گئے ہوئے ہم راہ سے واپس ہو گئے تو قوم کو کیا منہ دکھائیں گے۔ اس لئے بہتر ہے سفر جاری رکھیں اور حج کر کے ہی واپس ہوں۔ مگر زاہد نے شریعت کی آڑ لے کر زادارہ کی معدومی کو حیلہ بنا کر واپسی پر زور دیا۔ چنانچہ سب لوٹ گئے۔ راستے میں ایک جگہ پر منزل ہوئی۔ رات کا وقت تھا، زاہد نے کہا نیند تو آئے گی نہیں، بہتر ہے کہانی کہہ کر رات گذاریں۔ سودا نے ارشاد و تبلیغ کی نیت سے ایک عشقیہ کہانی گڑھ کر سنائی جس کا مقصد یہ تھا کہ محبت کھیل نہیں اس میں بہت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تب محبوب تک رسائی ہوگی۔ جب دنیا کے عشق کا یہ حال ہے تو عشق الٰہی کا کیا حال ہوگا۔

دلقت بچہ کار آید و تسبیح و مرقع
خود دار عمل ہائے نکو ہیدہ بری دار

سنو! حلب میں ایک شیشہ گر کا نوجوان اور نہایت حسیں لڑکا ایک زرگر کے ویسے ہی خوش رو لڑکے پر عاشق ہو گیا اور اس کی محبت میں ایک روز گھر سے نکل کھڑا ہوا گھر والے بہت پریشان ہوئے۔ نجومیوں نے بتایا کہ وہ ایک جنگل میں ہے۔ وہ نہایت خطرناک جنگل تھا۔ وہاں سے ڈھونڈ کے لاتے لیکن اس کی وحشت نہ گئی آ کر پا بہ زنجیر کیا گیا۔ مدت کے بعد پسر زرگر کو حال معلوم ہوا تو وہ خود آ کر اپنے عاشق سے ملا اور یہ داستان تمام ہوئی نتیجہ کی بات

جوزاہد کو سنائی تھی وہ یہ ہے۔

جو کوئی آپ کو اس طرح کھوئے
خدا کا وہ خدا تب اس کا ہوئے

سودا کا اپنا رنگ قصیدہ گوئی کا ہے۔ جہاں ہر مبالغہ جائز بلکہ شاعر کی بلندی فکر کی دلیل ہے۔ اس لئے ان کی مثنویوں میں بھی ہر جگہ یہی رنگ جھلکتا ہے۔ ''مثنوی پسند'' مثنوی میں دور از کار مافوق الفطرت افسانے جن، بھوت کی کہانی، انسان کی جنوں اور دیوؤں سے جنگ، پری کا عشق انسان سے اور انسان کی شادی پری سے گوارہ کر سکتے ہیں لیکن سودؔا کی بلندیٔ فکر، مبالغہ کی ندرت جو مقصود کے اعلیٰ مقام کو سمجھانے کا ایک ذریعہ ہے گوارہ نہیں کر سکتے اور اسی بنیاد پر سودؔا کی مثنویوں کو ''پایۂ مثنوی'' سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ بہر حال سودؔا کو مثنوی گویوں میں کوئی مقام ملے یا نہ ملے مگر انداز بیان دلپذیر اور دل خوش کن، بہت ہے۔ مومن کے کنوئیں کے ٹھنڈے پانی کی تعریف میں جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اگر چہ مبالغہ کے انداز میں ہے مگر اس کی خنکی کا انتہائی مقام ہمارے سامنے ضرور آ جاتا ہے۔

ڈگڈگا کر اگر کوئی پیوے
تا نہ اوڑھے لحاف کب جیوے

بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے مگر جاڑوں میں رات کی ٹھنڈک میں ٹھنڈا پانی پی کر دیکھئے لحاف کی نوبت آتی ہے یا نہیں۔ اس طرح کا بیان محض وقت کی انتہا کو بتانا ہوتا ہے نہ کہ امر واقعہ؟

شور شورے کا اٹھ گیا یک بار
ہو گیا سرد برف کا بازار
جس نے یک بار بھی پیا وہ آب
حشر تک زیر خاک ہے سیراب

اسی نہج پر ان کی مثنویاں ہیں۔آصف الدولہ کے شکار کی تعریف میں کہتے ہیں:

کیا دست و بیشہ جو شیروں سے پاک — پڑی شیر کے مارے کی یہ دھاک
رکھا نام پھیر ان نے از خوف جاں — کہ جس شخص کا نام تھا شیر خاں
درندوں سے صاف جب جنگل کیا — تو خیمے میں تشریف فرما ہوا
رہے دیکھ حیراں صغیر و کبیر — جب آگے سے اٹھ بھاگے قالین کے شیر
زمیں سے فلک تک جو پہنچا یہ ذکر — پڑی اپنی برج اسد کو بھی فکر

ایک رئیس کی کنجوسی کی اس سے عمدہ تعبیر نہیں ہو سکتی۔ایک رئیس کی ہجو میں لکھتے ہیں:

کرے سو عید گنبد گرداں
نہ ٹلے ان کے گھر سے پھر رمضاں

میر سوز

میر کے معاصرین میں ہیں۔شاعر اچھے تھے۔ان کی ایک ہی مثنوی ہے جس کا عنوان نہیں، مگر مثنوی عشقیہ ہے۔آزاد نے آب حیات[1] میں ان کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔لکھتے ہیں:

''ان کا کلام، صفائی محاورہ اور لطف زباں کے باب میں ہمیشہ سے ضرب المثل ہے۔ان کے شعر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی چاہنے والا اپنے چہیتے عزیز سے باتیں کر رہا ہے .... اضافت تشبیہ، استعارہ، فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔''

یہی انداز ان کی مثنوی کا ہے اس لئے گرچہ کم ہے مگر پسندیدہ ہے، عشق کی افتاد سے پہلے دل بہت باغ و بہار اور صحبت آشنا تھا، اپنی ہستی خود جان محفل تھی۔اس مضمون کے چند

[1] آب حیات صفحہ ۱۹۶ مطبوعہ لاہور

اشعار یہ ہیں:

ہے ہے اب ہاتھ سے جاتا ہے — مجھ کو اس کا غم کھاتا ہے
کیا اچھا بچھا دل تھا یہ — سب رنگوں میں شامل تھا یہ
ہنستوں میں بیٹھ کے ہنستا تھا — خوبوں میں پہلے دھنستا تھا
کرتا تھا سب سے رنگ رلیاں — باتیں کرتا بھلیاں بھلیاں

مثنوی کا اختتام عشق الٰہی کی تعلیم و تبلیغ پر ہوا ہے اس لئے نتیجہ خیز ہے۔ محض بے نتیجہ داستان عشق نہیں۔ اب سہو کاتب کہیئے یا بحر پر پورا قابو نہ ہونے کا الزام رکھتے بعض اشعار خارج البحر ہیں۔

جعفر علی حسرت

یہ بھی میرؔ کے ہم عہد ہیں۔ ان کی متعدد مثنویاں ہیں جو ان کے کلیات میں موجود ہیں ان کی ایک مثنوی طوطی نامہ[1] ہے جس کو ڈاکٹر ہاشمی نے مقدمہ کے ساتھ طبع کیا ہے۔ اشعار کی گنتی تو نہیں کی گئی۔ ضخامت سے اندازاً دو ہزار سے کم اشعار نہ ہوں گے۔

اس ''طوطی نامہ'' میں طوطا رام شہزادے کی داستان عشق نظم ہوئی ہے۔ مثنوی ادبی اعتبار سے کوئی مقام نہیں رکھتی لیکن معاشرتی اور تہذیبی بیانات بہت تفصیل سے آتے ہیں۔ ایک مقام پر تفریح اور چہل کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں۔

پھولوں کے ہار ہو گلے کے ہار — پھولوں کی چھڑیوں کی وہ طرفہ مار
کسی کو فرش میں کسی نے سیا — کفش رکھے کسی کے کوئی چرا
کوئی دہکاتی پیالے دے خالی — کوئی جھنجھلا کے دے اسے گالی
ایک نے دامن ایک باندھا — جو اٹھے تو اٹھی یہ تالی بجا

اس کے علاوہ ان کا ایک ''ساقی نامہ'' اور ہجو یہ مثنوی ہے جس میں کسی حکیم کی ہجو کی گئی ہے۔

---

[1] مقدمہ طوطی نامہ صفحہ ۱۱

بسمل فیض آبادی

یہ بھی آصف الدولہ کے درباریوں میں تھے جہاں میر ایک عرصہ تک ملازم رہے اور مثنوی لکھ لکھ کر داد درباری دیتے رہے۔ میر کے استاد فن ہونے میں تو دورائے کبھی قائم ہی نہیں ہوئی۔ ان کا اپنا مخصوص رنگ اتنا مقبول تھا کہ ہر باشعور اس رنگ میں کہنا اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتا تھا۔ غزلوں کے ساتھ میر نے مثنوی نگاری میں بھی اپنی انفرادیت کا سکہ دلوں پر بیٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے ان کے معاصرین نیز بعد کے آنے والوں نے بھی ان کی پیروی کو اپنی ناموری اور کامیابی وقبولیت کا ذریعہ سمجھا۔ بسمل فیض آبادی نے مثنوی ''حسن وعشق'' لکھی جو میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کا جواب کہی جاسکتی ہے۔ میر اپنی عشقیہ مثنوی کی ابتدا میں عشق کی اہمیت بیان کرتے تھے۔ ''حسن وعشق'' کا بھی وہی انداز ہے۔

قسم ہے نالہ نے کی تجھے عشق — قسم ہے نشۂ مے کی تجھے عشق
قسم ہے تجھ کو میری چشم تر کی — قسم ہے میری آہ بے اثر کی
قسم ہے میرے فریاد و فغاں کی — قسم ہے عندلیب بوستاں کی

اگر چہ یہ مثنوی ''سحرالبیان'' کے بعد کی تصنیف ہے لیکن درحقیقت میر کی پیروی ہی میں کہی گئی ہے کیونکہ اپنی ایک دوسری مثنوی میں وہ میر کے اتباع اور ان کے کلام سے استفادہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اپنی مثنوی ''پارسانامہ'' میں لکھتے ہیں:

یہ بسمل جو ہے شمع محفل فروز — لکھی کتنی بیتیں ہیں یہ سینہ سوز
جو دس پانچ ہیں میر کی داستاں — نہاں نہیں کیا کردیا وہ بیاں

قائم چاندپوری

مثنوی گوئی کی کثرت کے اعتبار سے قائم کا بھی ایک مقام ہے۔ اگرچہ فنی نقطہ نگاہ سے ان میں خامیاں بھی ملتی ہیں لیکن جو خامیوں کی طرف ڈاکٹر گیان چند نے اپنی

کتاب[1] کے صفحہ پر اشارہ کیا ہے، مثلاً ان کے بعض اشعار میں ''ع'' یا ''ہ'' ساقط ہو جاتی ہے جو ناجائز ہے ان کے کلام میں بھی موجود ہے۔ یہ خامی اس عہد میں بہت اہمیت نہیں رکھتی کیوں کہ فارسی کے قدیم اساتذہ کے یہاں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ البتہ قائم کے دور میں اس کا شمار غلطیوں میں کر لیا گیا تھا اور خلاف قاعدہ مان لیا گیا تھا۔ میر و مرزا بھی اس سے بچتے تھے، لیکن ''ع'' اور ''ہ'' کا اسقاط بے سند نہیں ہے۔ متاخرین نے حروف اصلی ہونے کی وجہ سے اس کو ناجائز قرار دیا۔

مثنوی ''جذب الفت'' یہ عشقیہ مثنوی ہے میر کی عشقیہ مثنویوں سے ماخوذ۔ البتہ واقعہ بالکل بے اصل نہیں ہے بلکہ ایک فارسی مثنوی ''قصہ ارہا فقیر'' جو پنجاب کے ایک عشقیہ واقعہ سے متاثر ہو کر عاقل خاں رازی نے نظم کی ہے۔ اس واقعہ کو لے کر میر کی عشقیہ روش پر چلنے کی کوشش ہے۔ طبقات الشعرا میں اس کی صراحت موجود ہے۔

''مثنوی شاہ لدھا کہ فقیرے تکیہ دار عاشق مزاج مجنوں منش در نواحی پنجاب بود''

ڈاکٹر نارنگ[2] نے بھی اپنی کتاب ''اردو مثنویاں'' میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ آزاد لائبریری علی گڑھ میں اس کا مخطوطہ بھی موجود ہے مثنوی کی ترتیب اور اٹھان بالکل میر کی عشقیہ مثنویوں جیسا ہے لیکن وہ بات کہاں؟ ع

''میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں''

پھر بھی اس کو اصل سے قریب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

میر کی ایک عشقیہ مثنوی میں ہے کہ ایک صاحب کسی شادی شدہ عورت کے دام محبت میں اسیر ہو گئے تھے اور وہ محترمہ بھی ان پر جان چھڑکنے لگی تھیں، لیکن مشکل یہ تھا کہ معاملہ رقیب روسیاہ یا ''غیر'' کا نہ تھا کہ کسی طرح دھکے دے کر راہ کا کانٹا ہٹایا جاتا معاملہ شوہر کا تھا کہ جیتے جی وصال محبوب ممکن ہی نہ تھا بجز اس کے کہ مر کر رہیں ہم آغوش ہوں، چنانچہ پاماں کار دونوں مر کر ''من تو شدم تو من شدی'' ہو گئے۔

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں [2] اردو مثنویاں

قائم کی مثنوی میں بھی ایک نئی نویلی دلہن جو پہلی مرتبہ اپنے شوہر کے ساتھ رخصت ہوکر اپنی سسرال جارہی ہے، راہ میں فقیر کے تکیہ میں قیام کرتی ہے۔ کسی طرح فقیر اور عروس دونوں کی نگاہیں چار ہوجاتی ہیں اور دونوں کے دل پر چھری چل جاتی ہے۔

دیکھا جو حسن یار طبیعت مچل گئی
آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی

پھر کیا تھا عشق کا سفر شروع ہوگیا۔ فقیر نے صحرانوردی اختیار کی اور عروس قید غم میں پابہ زنجیر ہوگئی۔ دونوں کا عشق اپنے منازل طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچا کہ فقیر جاں بحق ہوگیا۔ ایک مدت کے بعد عروس کا گزر اس راہ سے ہوا جہاں فقیر کی قبر تھی۔ یہ بے تابانہ زمین پر لوٹنے لگی یہاں تک کہ قبر شق ہوئی، فقیر کی لاش برآمد ہوئی اور عروس دھوئیں کی شکل میں تبدیل ہوکر فقیر کی لاش میں سما کر معدوم ہوگئی اور قبر کی زمین برابر ہوگئی۔

اہل نظر کی رائے[1] میں قائم کی مثنوی میں وہ خستگی اور برشتگی نہیں جو میر یا راسخ کی مثنویوں میں ہے۔

ان کی عشقیہ مثنویوں سے کہیں بہتر محاکاتی مثنویاں ہیں "در وصف ہولی" ایک مثنوی لکھی ہے اس میں ہولی کا منظر پیش کیا ہے۔ اگرچہ وہ زور نہیں جو ان کے دوسرے ہم عہد یا بعد والوں میں ہے لیکن جہاں تک ہے وہ غنیمت ہے۔

زبس ہر گلی میں ہے لڑکوں کا شور — ہے کیچڑ میں ہر راہ رو شور بور
کسی پر کوئی چھپ کے پھینکے ہے رنگ — کوئی قمقموں سے ہے سرگرم جنگ

مثنوی شدت سرما

یہ مثنوی سودا کی مثنویوں میں بھی ملتی ہے لیکن اہل تحقیق اس کو قائم ہی کی بتاتے ہیں۔ ایک دلیل تو اس کے مقطع سے دی گئی ہے کہ سودا کی الف دبتی ہے اور ایسی لغزش سودا

---

[1] اردو مثنویاں شمالی ہند میں صفحہ ۲۶۰

سے ممکن نہیں ۔

سودا آخر ہے سردی کا مذکور
شعر بھی گر جنک ہوں رکھ معذور

یہاں سودا کی جگہ اگر قائم رکھا جائے تو یہ عیب مٹ جاتا ہے۔ سودا کے کلیات میں آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے شاگردوں کا کلام اصلاح کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ ان میں کچھ کلام ان کے پاس بھی رہ گیا جو ان کے انتقال کے بعد غلط فہمی میں ان کے کلیات میں شامل ہو گیا۔

یہ مثنوی سودا کی نظر سے گزر چکی ہے۔ یہ بات تو ثابت ہی ہو جاتی ہے۔ اب اگر سودا کا پورا رنگ چھا گیا تو حیرت انگیز نہیں۔ شاگرد نے استاد کی مثنویوں کو مد نظر رکھ کر ہی مثنوی نظم کی ہوگی اس پر استاد کی اصلاح نے اور بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ مبالغہ آمیزی کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کا بہت حد تک جواب سودا کی مثنویوں کے سلسلے میں دیا جا چکا ہے۔ یہ مثنوی جس پر مبالغہ آمیزی کا عیب لگایا گیا ہے وہ بلاغت کی اکثر قسموں پر حاوی ہے۔ خصوصاً حسن تعلیل کے خوب خوب نمونے ملتے ہیں۔ پہلا ہی شعر ہے۔

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید ۔۔۔ صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
جاڑا لگنے کا حرف ہے تک ہے حرف ۔۔۔ لپٹی رہتی ہے ندے ہی میں برف

ان کی دوسری مثنویاں بھی اپنی طرز میں قابل ستائش ہیں۔

میر حسن اور ان کے معاصرین کا دور

ترقی یافتہ مثنویوں میں اوّلیت کا سہرا میر تقی میر کے سر باندھا جاتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ مختلف موضوعات پر انھوں نے صنف مثنوی کو آفاقیت عطا کر دی ہے، اپنے کمال فن اور نکتہ رس دماغ، ادبی دستگاہ سے اردو مثنوی کو اس حد تک پہنچا دیا کہ فارسی مثنویوں کے مقابلہ میں اس کا نام بھی لیا جا سکے۔ لیکن مثنوی کی وہ قبولیت جو ان کے بعد

کے مثنوی نگاروں نے حاصل کی اس نے میر کی مثنویوں کو بہت پیچھے کر دیا۔ خصوصاً میر کے فوراً بعد میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو جو قبولیت حاصل ہوئی اس نے اپنے تمام پیش روؤں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ سحر البیان کی قبولیت کے اسباب کیا کیا ہیں اس پر اہل قلم بہت کچھ لکھ چکے ہیں لیکن ان میں کوئی بات ایسی نہیں کہ اس سے پہلے کی مثنویوں میں نہ ملتی ہو یا ان خوبیوں سے یکسر خالی ہوں اس کے باوجود سحر البیان سب پر چھا گئی اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ع

''قبول خاطر و لطف سخن خدا دا داست''

میر کے بعد ان کی پیروی میں مثنوی لکھنے والوں میں سر فہرست چند نام آتے ہیں۔ راسخ عظیم آبادی، میر حسن، مصحفی، جرأت، انشاء۔ ان میں راسخ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ میر کے شاگرد بھی تھے۔

راسخ اور ان کی مثنویاں

راسخ عظیم آباد کے بلند پایہ شاعر تھے۔ کہتے ہیں کہ دہلی گئے تو میر سے بھی ملے تھے اور اپنا کلام بھی ان کو دکھایا تھا حقیقت حال بہت مشتبہ ہے لیکن اتباع میر سے انکار نہیں کیا جا سکتا..... ان کی مثنوی ''حسن و عشق'' اور ''جذب عشق'' میر کی مثنوی ''شعلۂ شوق'' اور ''دریائے عشق'' سے بہت ملتی جلتی ہے۔ بلکہ میر اور راسخ کی زندگی میں ایک دوسرے کی مماثل ہے۔ اس لئے دونوں کے مزاج میں بھی یکسانی ہے۔ اپنی خستہ حالی، ناقدری زمانہ درد و الم سے بھری ہوئی زندگی کی داستان دونوں جگہ ملتی ہے۔ راسخ بھی ناداری کا دکھڑا لئے ہوئے رئیسوں کے دربار میں نظر آتے ہیں۔ اپنی مثنویوں میں ان کی مدح و ستائش کرتے ہیں اور ان سے صلہ کے طلبگار ہوتے ہیں۔ عشقیہ مثنویوں کا جو پلاٹ تیار کیا ہے وہ اسی طرح ہے جیسے میر نے اپنی مثنویوں میں ترتیب دیا ہے۔ خیالات میں ایک دوسرے کے ساتھ بہت مطابقت ہے۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے:

راسخ	میرؔ
ہے شور ترا ہر انجمن میں	محبت ہی اس کارخانے میں ہے
رونق ہے تجھی سے ہر چمن میں	محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
(حسن وعشق)	(شعلۂ شوق)
خون ہو برسا چشم مژگاں سے	کہیں آنکھوں میں خوں ہو کے بہا
چمکا آنسو ہو چشم گریاں سے	کہیں سر میں جنوں ہو کے رہا
سینے میں ہو کے دل دھڑک اٹھا	دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں شعلہ ہوا بھڑک اٹھا	کہیں سینے میں آہ سرد ہوا

راسخ نے عشقیہ مثنوی کے علاوہ دیگر موضوعات پر جو مثنویاں لکھی ہیں وہ مفید اور کارآمد ہیں۔ان میں بعض تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں جیسے ''شہر آشوب پٹنہ'' کہ اس میں دور کے پٹنہ اور اہل پٹنہ کی پوری تصویر کھینچ دی ہے اور اس انقلاب طبع کی ذمہ داری ان سفید فام قوموں پر رکھی ہے جو باہر سے آ کر مسلط ہوگئی تھی۔ چنانچہ جملہ حالات لکھنے کے بعد لکھتے ہیں :

کسی کا قدم شوم آیا ہے یاں
کہ جس سے ہوا مفسدہ یہ عیاں

ایک مثنوی ''نورالانظار'' ہے یہ ایک طویل مثنوی ہے اور تصوف سے لگاؤ رکھتی ہے جو عمر ڈھلنے کے بعد انہوں نے لکھی تھی۔ تربیت باطن کا گنجینہ ہے۔

میر آثرؔ

ان کی مثنوی '' خواب و خیال'' ہے میر آثر، میر دردؔ کے چھوٹے بھائی اور ان کے مرید بھی تھے، یہ ایک طویل مثنوی ہے جس میں حقیقت سے مجاز تک سب کچھ ہے اور جو ہے اعلیٰ پیمانہ پر ہے جو کچھ کہا ہے بے ساختہ اور کھل کر کہا ہے۔ تکلفات کو بالائے طاق

رکھ کر ہر بات بے کم و کاست کہدی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے نقطۂ نگاہ سے اس کو کسی نے ''شرمناک''[1] کہا۔ اور کسی فنی نقطۂ نگاہ سے اس کو اردو کی اعلیٰ مثنویوں[2] میں جگہ دی۔ ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:

''جدید اردو مثنوی کی جب سے بنیاد پڑی ہے شاید ہی کوئی مثنوی زبان و سلاست اور روانی، فصاحت، شیرینی، روزمرہ کی صفائی، قافیوں کی نشست اور مصرعوں کی برجستگی، زنانے اور مردانے محاورات کے بے تکلف استعمال میں معنوی ''خواب و خیال'' کا مقابلہ کرسکتی ہے۔''

ڈاکٹر عبدالحق کی جچی تلی رائے کے بعد نمونے کے اشعار کافی ہوں گے۔ البتہ ایک خوش فہمی کا ازالہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ حبیب احمد صدیقی نے اس کو ''شرمناک'' کہا ہے، مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں ''معلوم ہوتا ہے کوئی لچا بدمست ہوکر کھیل کھیلا ہے۔'' ڈاکٹر گیان چند تو اس قدر خفا ہیں کہ ان کی مشیخت کا سارٹیفکٹ ہی چھین رہے ہیں۔ عمر بھر کی ریاضت اس مثنوی پر قربان ہوئی جاتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ''سرشام بھی جس کے یہ خیالات ہوں اس عارف کو کیا کہیں۔''

اثر نے جس وقت مثنوی لکھنی شروع کی ہے، ابتدا میں یہ بات کہدی ہے:

بعد حمد خدا نعتِ رسول
کچھ بکے ہے یہ اب ظلوم و جہول

اس سے یہ بات واضح ہے کہ اس میں جو واقعات از قسم عشق و محبت کے بیان کئے جائیں گے، ان کی حقیقت محض خیالی اور ذہنی اپج سے زیادہ نہیں ہے، اس لئے مثنوی کا نام بھی 'خواب و خیال' رکھا ہے۔ اس مثنوی پر انگلی رکھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ چند مقامات ایسے ہیں جہاں تکلفات کی

---

[1] رسالہ نگار نومبر ۱۹۴۲ء مضمون حبیب احمد صدیقی

[2] مقدمہ مثنوی ''خواب و خیال''

چادر اتار پھینکی گئی ہے اور اس موقع کے جذبات اور واقعات بے کم و کاست پیش کر دیئے گئے ہیں۔ آثر نے یہ کوئی نئی بات نہیں کی تھی۔ ان کے پیش رووں کے یہاں بھی ایسی مثالیں موجود ہیں، فرق اتنا ہے کہ یہاں وضاحت کچھ زیادہ ہے۔ کوئی بڑا سے بڑا صوفی، زاہد جب وہ شعر کہتا ہے اس میں وہ صرف شاعر ہوتا ہے۔

وہ جذبات کا سچا ترجمان ہوتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے اپنے انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ ایک شاعر کو خواہ وہ مولانا روم ہی کیوں نہ ہوں ہر وقت سبحہ بدست و مصلی بردوش دیکھنے کی تمنا عبث ہے اور شاعر کے فن کی ناقدری ہے۔

اس مثنوی کا نام ''خواب و خیال'' اسی مناسبت سے ہے کہ خیالات کی رو ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں جاتی۔ کبھی خیر کی طرف اور کبھی شر کی طرف، ابھی زمین پر ہے تو ابھی فلک پر، ابھی اپنے ہی گرد و پیش میں چکر لگا رہی ہے تو ابھی پورے معاشرے پر سرسری نگاہ ڈالتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچی۔ اس مثنوی کا بالکل یہی حال ہے۔ بہ نظر غور ملاحظہ کیجئے تو ہر طرح کے مضامین دینی و دنیوی یہاں موجود ہیں۔ آثر کے بعد بھی جو مثنویاں لکھی گئی ہیں ان میں بھی کھل کھیلنے کا سماں موجود ہے۔ اس میں شاعر موردالزام نہیں بلکہ وہ معاشرہ ہے جس کی تسکین قلب اور لطف طبع کے لئے مثنوی لکھی گئی۔ آثر تو کم از کم جا بجا خیر کی طرف ذہن کو موڑتے بھی جاتے ہیں بعد والوں نے تو یہ روایت بھی ملحوظ نہ رکھی۔

ایک خاص منظر کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں۔ آدمی کے آرام کے دو وقت خاص ہوتے ہیں۔ جاڑوں میں رات اور گرمیوں میں دوپہر۔ لیکن عاشق کے لئے کسی موسم میں چین نہیں۔

سخت دوبھر ہیں جاڑے کی راتیں — اور اس کی ہزارہا باتیں
اب نہ دن ہی کٹے نہ رات کٹے — کس طرح عرصہ حیات کٹے
رات کاٹے کوئی کہ دن کاٹے — بات بنتی نہیں ہے بن کاٹے
عمر کاٹے، کس کو بھاتا ہے — تس پہ دن رات کاٹے کھاتا ہے

میر حسن کی ''سحر البیان''

دبدبۂ خسرویم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی فگند

عشقیہ مثنویاں میرؔ سے پہلے اور میرؔ کے بعد بھی لکھی گئیں، لیکن جو قبولیت 'سحر البیان' کو حاصل ہوئی وہ دوسری مثنویوں کو حاصل نہ ہو سکی۔ میر حسن کے سامنے میرؔ کی مثنویوں کا خاکہ تھا لیکن انہوں نے اس کو حرف آخر نہ سمجھا بلکہ یہ محسوس کیا کہ ابھی اس زمین میں چمن بندی کی بہت گنجائش ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی اور واقعات کی تنظیم کی حیثیت سے بھی۔ اس لئے انہوں نے ایک مخصوص انداز اختیار کیا اور اسی راہ پر کامیابی سے چل پڑے۔

میرؔ کی عشقیہ مثنویاں اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صفر ہوتی ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ایک عورت کے حصول کے لئے تمام عمر مصائب کی سختیاں جھیلیں اور پھر بھی نہ حاصل کر سکے یہاں تک کہ مر گئے اس کے بعد جو تاثیر محبت کے واقعات رونما ہوئے وہ عقل سے بعید، فطرت کے خلاف۔ ''موت کے بعد دونوں کی لاشیں ایک دوسرے سے چپک گئیں اور اسی حال میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔'' زندگی میں شرم و حیا دامنگیر رہی اور مرنے کے بعد بے جان جسم کی یہ بے حیائی۔ لکھنے والے کے ذہنی توازن کی طرف سے مشتبہ کرتی ہے۔

میر حسن نے محنت کا پھل دکھایا ہے۔ بے نظیر نے سختیاں اٹھائیں تو اپنے در مقصود کو حاصل بھی کر لیا۔ وہ ''حاصل آں مردن بدشواری وایماں یافتن'' کا مصداق نہ بنا۔

''سحر البیان'' کے خوبیوں کی ایک طویل فہرست ہے مگر چند باتیں بہت اہم ہیں جن کی وجہ سے اپنے پیش رووں پر چھا گئی شستہ زبان، دل پذیر بیان، مناظر و محاکات یہ تمام ایسی چیزیں ہیں جو مل جل کر مثنوی کو بہت بلند کر دیتی ہیں اور یہ ''بے نظیر'' کی داستاں خود بھی بے نظیر ہو گئی۔ جس منظر کو اٹھایا ہے تصویر کھینچ دی ہے۔ جوانی اور جوانی کی تمام رعنائیاں اور رنگینیاں ایک شعر میں اس طرح جمع کر دی ہے۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

ایک منظر یوں پیش کرتے ہیں:

وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جا بجا	وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا
وہ نکھرا فلک اور وہ مہ کا ظہور	لگا شام سے صبح تک وقت نور

میر حسن اور ان کی یہ مثنوی اس قدر مقبول ہو چکی ہے اور اس موضوع پر اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ اب مزید گفتگو تحصیل حاصل ہے۔ اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی بعض خامیوں کی بھی نشاندہی کی جا چکی ہے۔ اس لئے اب اس کا کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل نہیں ہے۔ میر حسن کی اور مثنویاں بھی ہیں اس میں 'رموز العارفین' صوفیانہ مثنوی ہے اس کے علاوہ کچھ ہجو یہ اور معاشرتی مثنویاں ہیں۔

مصحفی

میرؔ کی پیروی میں مصحفیؔ سب سے آگے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بھی میرؔ کی طرح مختلف سماجی، اخلاقی اور عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں، جو انداز فکر میں میرؔ سے بہت ملتی ہیں۔ بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی چشمہ کی دو شاخیں ہیں جو دو سمتوں میں رواں ہو گئی ہیں۔ مثنوی ''بحرالمحبت'' میرؔ کی عشقیہ مثنویوں 'جذبۂ عشق' 'شعلۂ عشق' وغیرہ کا نقش ثانی نظر آتی ہے۔

میرؔ	مصحفیؔ
ایک جا اک جواں رعنا تھا	ایک جا اک جواں خوش ظاہر
لالہ رخسار سرو بالا تھا	تھا نپٹ فن عشق میں ماہر
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ	یعنی اک نازنیں گل رخسار
تھی طرف اس کے گرم نظارہ	ہوئی غرفے میں اس سے ہو کے دوچار

مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ علمی استعداد میں مصحفی میر سے بہت آگے تھے اس لئے ان کے قلم سے ایسے اشعار نکل جاتے ہیں جس تحمل اہل علم ہی کر سکتے ہیں عوام کے لئے بار ذہن ہوتے ہیں۔ سماجی اور معاشرتی مثنویوں سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر و مصحفی دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ یہاں بھی وہی خستگی مکاں کا رونا، کھٹملوں کی یورش، بے مائیگی کا گلہ وغیرہ جو میر کے ہاں ہے، یہاں بھی بھرپور حد تک موجود ہے۔ لیکن مصحفی کا نقش ثانی میر کے نقش اوّل سے کمتر نہیں ہے بلکہ کچھ آگے ہی بڑھ گیا۔ پھر بھی ع

"میر ہے میر تقی میر تنہا شاعر"

جرأت

انہوں نے خواہ مخواہ مثنوی لکھنے کی جرأت کی۔ تقریباً ۲۶ مثنویاں بڑی چھوٹی ملا کر لکھ ڈالیں۔ مگر بہتر تھا کہ یہ اپنی غزلوں ہی سے لگے رہتے اور مزے مزے کے شعر کہا کرتے

مسّی پھیکی، کاجل پھیلا، کان میں ٹیڑھا بالا ہے
جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا ہے

انشا

یہ شوخ طبع، ہنسوڑ، چنچل مزاج، بذلہ سنج، حاضر جواب اور بڑھتے بڑھتے پھکو باز شاعر سے سنجیدگی کی توقع کون کرے گا۔ ہنسنا ہنسانا، لوگوں کا مضحکہ اڑانا ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ مصحفی کو کیا کیا نہ بنایا۔ ان سے سنجیدہ مثنویاں کیا ہوتیں۔ اپنے مزاج کے مطابق جو بجو یہ مثنویاں لکھیں اپنے رنگ میں خوب ہیں۔ اہلیت و صلاحیت، علمی استعداد اور فنی مہارت اپنی جگہ مصحفی کے لئے تسلیم شدہ سہی، لیکن رواں دواں، بے تکلف زباں اور زورِ بیاں انشا کا حصہ ہے۔ خصوصاً جب وہ اپنے رنگ میں کہہ رہے ہوں تو ان کے معاصرین ان کی گرد تک نہیں پہنچتے۔ ان کے یہاں مزاحیہ مثنوی کی سیر کیجئے۔ ایک "مرغ نامہ" لکھتے ہیں اس کی حمد میں مرغبازی کا پہلو ملاحظہ ہو:

حمد ہے فرض اس کی وقت سحر — جس نے کاٹے ہیں مرغ روح کے پر
تن کے کھانچے میں کر دیا ہے بند — کہ وہ یک چند واں رہے خورسند

جس کی جولانی طبع اللہ میاں کو بھی کسی واسطے سے مرغ باز ثابت کرے اس کی شوخی کا عالم غیروں کے مقابلے میں کیا ہوگا؟

رنگین

انشا کے بعد رنگین کو نظر انداز کر دینا کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ بندہ خدا نے شاید مثنوی نگاری اپنا پیشہ بنا لیا تھا تقریباً چالیس مثنویاں لکھ ڈالیں۔ رنگین کی شہرت اگر چہ ان کی ریختی کی وجہ سے زیادہ ہے۔ لیکن ان کی سنجیدہ تخلیقات شعری کی تعداد چالیس سے تجاوز ہوگی۔

مثنوی نگاری کا سلسلہ یوں تو ہر دور میں جاری رہا لیکن یہاں صرف ان شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جو میر کے ہم عہد یا ان کے عہد سے قریب تر تھے۔ یوں تو مومن، داغ، ذوق، دیا شنکر نسیم، شوق وغیرہ بھی اپنے عہد کے مشہور مثنوی نگار ہیں مگر ان کو اور ان کی مثنویوں کو میر سے کوئی قریبی نسبت نہیں ہے۔ بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غزل کی طرح مثنوی کا دوسرا جدید دور ہے۔ اب زبان بدل چکی تھی، انداز بدل چکا تھا، یہ ہی نہیں، انداز فکر بدل چکا تھا اس لئے میر کے گرد و پیش کی مثنویوں کے ساتھ ان مثنویوں کا ذکر مناسب نظر نہیں آتا۔

میر تقی میرؔ کی مثنویوں کی تقسیم

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

قدرت نے میرؔ کو شاید غزل گوئی کے لئے پیدا کیا تھا، وہ اس باب میں فطری مناسبت لے کر آئے، غزل کی تاثیر اور لطافت کے لئے جن لوازمات کی ضرورت تھی وہ سب قدرت نے ان کی ذات میں ودیعت کر دی تھی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے خیالات قابل توجہ ہیں۔ موصوف اپنے مضمون "میرؔ کی مثنوی نگاری" کی تمہید میں لکھتے ہیں:

"میرؔ کی تخلیقات شعری کی یہ خصوصیت اہل نظر کی توجہ کی محتاج ہے کہ وہ غزل میں عموماً طول کلام کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، مگر مثنویات میں بیان کی طوالت کی بجائے اختصار کا میلان ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے قصیدے بھی اتنے طویل نہیں جتنے مثلاً سوداؔ کے ہیں۔ بعض اوقات ان کی مختصر مثنویاں ان کی طویل غزلیات کے قریب جا پہنچتی ہیں۔ ان کی عام غزلیات میں بعض اوقات مختصر مثنوی یا نظم مسلسل اور نظم و انتظام پایا جاتا ہے۔ غزل میں ان کو اپنی طویل گوئی کا خود بھی احساس ہے۔

آج رکتی نہیں خامے کی زباں رکھے صاف
حرف کا طول بھی تو مجھ سے گھٹایا نہ گیا

گو غزل کہی گئی قصیدہ سی　　عاشقوں کا ہے طول حرف شعار
عیب طول کلام مت کریو　　کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا''

ایک ''خوگرِ سخن'' کے جذبات واحساسات کے لئے غزل کی تنگ دامنی کافی نہ تھی اس لئے وہ قدیم شعرا کی طرح غزل کو چند اشعار میں محدود نہ کر سکے اور جب خیالات کی رو بڑھنے لگی تو زمان ومکاں کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں اور غزلوں نے قصیدے کی وسعت کو چھولیا۔ اکثر غزلیں تسلسل بیاں اور ترتیب کلام کی وجہ سے قطعات کی مثیل بن گئی ہیں۔ خیالات کی یہی وسعت تھی جس نے میرؔ کو مثنوی نگاری کی طرف مائل کیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ جو خاکہ قدیم سے مثنویوں کا چلا آرہا ہے وہ کسی مسلسل کہانی یا داستان کی شکل میں تھا اور اس میں کسی بھی دور از کار اور مافوق الفطرت مضامین نے اپنی خاص جگہ بنالی تھی۔ وہ قصہ قصہ ہی نہ تھا جس میں مافوق لفطرت مضامین سے رنگ آمیزی نہ کی گئی ہو۔ میرؔ نہ تو روایت سے بالکلیہ بغاوت کر سکتے تھے اور نہ جدت پسند طبیعت اس روش پر آنکھ بند کر کے چلنے کی اجازت دیتی تھی۔ اس لئے وہ نہ خود کوئی اپنی راہ نکال سکے اور نہ اسی ڈگر پر چل سکے۔ البتہ انھوں نے یہ ضرور کیا کہ زندگی کے حدود سے مثنوی کو قریب کردیا۔ اور اب مثنوی مافوق الفطرت داستانوں سے نکل کر گھریلو اور معاشرتی سچی داستانیں بھی سنانے لگی۔ اس طرح میرؔ کی مثنویاں چند قسموں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ میرؔ کی جملہ مثنویوں کی تعداد جواب تسلیم کی جاچکی ہے ۳۸ ہے۔ جن کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) عشقیہ مثنویاں (۲) واقعاتی مثنویاں (۳) مدحیہ مثنویاں (۴) ہجویہ مثنویاں

عشقیہ مثنویاں

میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کی تعداد ۹ ہے۔

یہ مثنویاں ان کے مطبوعہ کلام میں بھی موجود تھیں۔ بعض مثنویاں بعد میں دریافت ہوئیں اور بعد کے کلیات میں شامل کی گئیں۔ ان میں چند مثنویاں بہت مشہور ہیں۔ شعلۂ عشق دریائے عشق، اعجازِ عشق، مور نامہ، قصہ افغان پسر، عشق سرا۔

میرؔ کے نزدیک عشق کا مقصد جیتے جی کسی مقصد کا حصول نہیں ہے بلکہ ع
''اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی''

یہ کبھی بھی زندگی میں کامیاب نہیں ہوتا، البتہ مر کر اس کا اعجاز بالکل طلسماتی اور حیرت انگیز صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور وہ حیرت انگیز شکل یا تو خود میرؔ اپنی اپج سے بناتے ہیں، یا کسی پرانی داستان مستعار لیتے ہیں۔ ان کا بے نتیجہ عشق آہ وفغاں، نالہ و درد، گریہ وزاری، فریادو بیقراری، شدت ضعف، حواس باختگی میں زندگی گزار کر مر جانے کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے ان کا عاشق کبھی جیتے جی وصال محبوب سے شادکام نہیں ہوتا۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی روحیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور یہ ملاپ لازوال ہوتا ہے جس میں فراق وہجر کی کبھی کوئی کیفیت پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔

اصل یہ ہے کہ میرؔ کی ابتدائی تربیت تصوف کے ماحول میں ہوئی تھی جہاں عشق انتہائی پاکیزہ جذبہ طلب کا نام ہے۔ وہ نفس ونفسانیات سے پاک ہے اور ہر طرح کے غل و غش سے صاف، وہ ایک پاکیزہ جذبہ طلب ہے، جس کا تعلق بھی پاکیزہ ہستی کے ساتھ ہے۔ اس لئے میرؔ کا تصور جو عشق کے متعلق ان کے ذہن میں مرکوز ہے وہ بہت بلند ہے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں۔

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق ۔۔۔ حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق تھا جو رسول ہو آیا ۔۔۔ اس نے پیغام عشق پہنچایا
عشق عالی جناب رکھتا ہے ۔۔۔ جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق حاضر ہے عشق غائب ہے ۔۔۔ عشق ہی مظہر العجائب ہے

جہاں عشق کی بلندی طور کی چوٹیوں کو چھوتی ہو وہاں نفسانیت کا تصور بھی کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ عشق کو نفس سے وابستہ نہیں کرتے۔ انہوں نے عشق کا تصور ع ''عشق لیلیٰ نیست این کار من است'' سے قائم کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں احساسات کی شدت ملتی ہے مگر وصل کی لذت نہیں ملتی۔ وہ عشق کو ایک کیفیت خاص سمجھتے تھے جو کسی صورت میں

بھی نمایاں ہوسکتی تھی ۔ خواہ وہ ''افغان پسر'' ہو یا کسی شخص کی منکوحہ ۔ جذبہ عشق جو خمیر انساں میں جاری وساری ہے جب ابھرتا ہے تو کسی ضابطہ کا پابند نہیں ہوتا ۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

میر کی مثنویوں کو اگر فن کی کسوٹی پر پرکھئے تو بہت مایوسی ہوگی ۔ نہ ان کا اپنا کوئی پلاٹ ہے، نہ حسن زنانہ اور حسن مردانہ میں کوئی امتیاز ہے ۔ دونوں ہی پری وش ۔ ماہ تمثال، نازک اندام، نزاکت کی جاں، غارت گردی وایماں نظر آتے ہیں ۔ فرق صرف تذکیر و تانیث کا ہے ۔ یہ دونوں کبھی خوش قسمتی سے یکجا ہو جاتے ہیں تو گلہ وشکوہ میں وقت گزار دیتے ہیں ۔ مانا کہ وصل کا وہ مقصد جس کی تصویر کشی دوسروں نے کی ہے یقینی نہایت غیر شریفانہ بات اور بوالہوسی ہے جس کے لئے عشق کا لفظ استعمال کرنا عشق کی توہین اور عشق کا مضحکہ اڑانا ہے اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ''عشق عالی جناب رکھتا ہے'' لیکن دو انسانوں کے درمیان خواہ وہ مرد عورت ہوں یا دونوں ہم جنس ہوں محبت جنوں کی حد تک ہوسکتی ہے اور وصال کے بعد فطرتاً طبیعت میں شگفتگی آئے گی مگر میر صاحب کے یہاں یہ فضا بھی گھٹی گھٹی سی ہے ۔

''ان کی عشقیہ کہانیاں بالکل بے مقصد ہیں ہر چند خالی کہیں کہ ..... اگر چہ میر کی مثنویوں میں قصہ پن بہت کم پایا جاتا ہے ۔ انھوں نے صحیح یا صحیح نما واقعات بطور ہدایت کے سیدھے سادے طور پر بیان کئے ہیں ..... مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی بے حیائی کی باتوں سے پاک ہیں ۔''

میر کی عشقیہ مثنویوں میں نتیجہ تو حالی جیسا بلند فکر ہی نکال سکے گا ۔ ہر ذہن کی اتنی رسائی نہیں کہ کوئی معقول نتیجہ یا نصیحت اس سے حاصل کر سکے ۔ ہاں یہ بات ضروری ہے کہ وصال محبوب کے ساتھ راز درون پردہ کو انہوں نے فاش نہیں کیا ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی عشقیہ مثنویوں میں ایسے مواقع آتے ہی ہیں ۔ حرمانی و ناکامی پر ان کی

مثنویاں ختم ہوتی ہیں۔

یہ چند باتیں ہیں جو ضمناً میر کی عشقیہ مثنویوں کے ضمن میں آ گئی ہیں ورنہ یہاں تک سلاست و رونق، برجستگی و بے ساختگی، محاورات کا برمحل استعمال، تشبیہ و استعارہ کی ندرت، جذبات کی فراوانی اور ان کی لطافت و پاکیزگی کا تعلق ہے جو نمونہ میر نے اپنی عشقیہ مثنویوں میں پیش کیا ہے وہ لازوال ہے۔ میر کی عشقیہ مثنویوں کے متعلق اہل تحقیق کے افکار و آرا درج ذیل ہیں۔ شعرالہند میں عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

"......وہ مثنویات کے موجد اور عمدہ نمونہ ہیں ان میں قدرتی انداز ہے۔ انہیں کی بدولت مثنوی کو ترقی ہوئی۔ میر حسن اور شوق کو انہیں کا مقلد سمجھنا چاہئے......"

مجنوں گورکھپوری رسالہ ایوان جنوری ۱۹۳۸ء میں میر کی مثنویوں کے متعلق اپنی رائے میں خصوصیت کے ساتھ ان کی عشقیہ مثنویوں کے متعلق لکھتے ہیں:

".....غزل کے بعد اگر کسی صنف میں ممتاز ہو سکتے ہیں تو وہ مثنوی ہے بالخصوص عشقیہ مثنوی۔ اور وہ اس لئے کہ عشقیہ میں تغزل کا رنگ بڑی حد تک نباہا جا سکتا ہے۔"

عبدالباری آسی اپنے مقدمہ کلیات میں رقمطراز ہیں۔

".....میر کی عشقیہ مثنویاں نہایت صاف، رواں، آورد سے پاک و صاف ہیں۔ ان کے بیان کی سلاست اور روانی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قصداً کسی چیز کے بیان کا اہتمام نہیں کیا ہے بلکہ بے تکلفانہ جو قلم سے نکلتا گیا ہے لکھتے چلے گئے ہیں........

مثنوی کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں وہ بھی ان کے ہاتھ سے نہیں جاتیں تسلسل کا سرشتہ نہایت مضبوط ہے۔ مبالغہ سے پاک اغراق وغلو سے مبرا ہیں۔ تشبیہیں کم ہیں مگر جہاں ہے وہ بہت بلند ہیں۔"

میر کے معاصرین نیز ان کے بعد کے مثنوی نگاروں نے جو بلند پایہ مثنویاں لکھیں ان کے بعد اب میر صاحب کا احترام مثنوی نگاری میں ان کی استادی اور تقدم کی وجہ سے ہے۔

واقعاتی مثنویاں

میر کی واقعاتی مثنویوں میں حسب ذیل مثنویاں ہیں:

نسنگ نامہ، خواب و خیال، کتخدائی آصف الدولہ، ہولی، شکار نامہ، جنگ نامہ، کتخدائی بشن سنگھ۔ اس کے علاوہ جانوروں سے متعلق مثنویاں ہیں۔ کپی بچہ، موہنی بلّی، اور دربیان مرغ بازاں۔

نسنگ نامہ: ایک مرتبہ نسنگ صوبہ پنجاب کا سفر پیش آیا۔ راہ سفر میں ہمسفر ایک دوشیزہ پر میر صاحب کی نظر پڑی اور وہیں نخچیر محبت ہو گئے اور نالۂ و فریاد کرنے لگے، پھر جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل مثنوی میں ہے۔ مثنوی 'خواب و خیال' بھی واقعاتی مثنوی ہے مگر اس میں واقعات عشق اپنی ہی زندگی سے وابستہ دکھائے گئے ہیں۔

میر لکھنؤ میں آصف الدولہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ آصف الدولہ کی شادی، ان کا ہولی کھیلنا، سیر و شکار میں جانا، ان کا جنگ لڑنا، یہ سب میر صاحب کی آنکھوں دیکھی بات تھی جس کو انہوں نے مثنوی میں نظم کیا ہے۔

پھر ان کے گھر کے اپنے واقعات تھے یا شہر کا کوئی خاص ماحول تھا جسے انہوں نے اپنی مثنویوں میں جگہ دی ہے۔ موہنی بلّی، دربیان مرغبازاں وغیرہ اسی قبیل کی مثنویاں ہیں۔

مدحیہ مثنویاں

میر صاحب کے ممدوح صرف انسان ہی نہ تھے۔ وہ اگر جانوروں میں بھی کچھ انسانیت کی بات پاتے تو اس کی مدح میں بھی دریغ نہیں کرتے تھے چنانچہ ان کے بلّے اور

کتیا میں دوستی ہوگئی۔ میر صاحب کو یہ ادا بھائی اور اس کی مدح میں مثنوی ''در تعریف سگ و گربہ'' لکھی۔ اسی طرح مختلف جانوروں کی تعریف میں انہوں نے مثنویاں لکھی ہیں۔

ہجویہ مثنویاں

میر سودا کے مقابلہ میں ہجو تو لکھ ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہجو کے لئے بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کی ضرورت ہے اور وہ یہاں مفقود تھی۔ البتہ خفا ہو کر کہیں دل کے پھپھولے توڑے ہیں۔ کبھی اپنی تعلّی میں دوسروں کی تخفیف کرنی چاہی ہے اور دوسروں کی طرف سے ''کلہ چیرا'' جواب ملا ہے اور بلبلا کر رہ گئے ہیں۔ ان کی ایک مثنوی ''اجگر نامہ'' ہے جس میں تمام شعرا کیڑے مکوڑے ہیں اور یہ خود ''اژدہا'' ہیں کہ جب میدان میں آتے ہیں سب کو نگل جاتے ہیں۔ ایک محفل میں بے لگام یہ مثنوی پڑھ دی تھی، بھلا مشاعرے کی مجلس میں یہ اہانت کون گوارا کرتا فوراً جواب ملا۔

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اجگر کے کلّے چیر کر

ان مثنویوں پر تفصیلی گفتگو آئندہ ابواب میں آئے گی۔

میرؔ کی مثنویوں کے خدوخال

میرؔ کی مثنویوں میں کچھ ایسی بھی مثنویاں ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح خود میرؔ کی زندگی سے ہے۔ ان میں بعض مثنویوں کے متعلق اہل نظر کا خیال ہے کہ یہ ان کی آپ بیتی ہیں خواہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ''متکلم'' کا صیغہ استعمال ہوا ہے یا ان کی زندگی کے واقعی وہ سچے واقعات ہوں جن کا پتہ شواہد کی روشنی میں محققین نے لگایا ہے اور جس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ میرؔ نے اپنی جوانی کے رنگین دور میں کئی مرتبہ عشق کی چوٹ کھائی تھی۔ اس لئے آپ بیتی کی تاثیر اور حدیث دیگراں کے بیان میں نمایاں فرق ہونا ایک کھلی بات ہے۔

معاملات عشق

ان کی ایک مثنوی 'معاملات عشق' ہے جس کے اشعار کی زبان نہایت شستہ، واردات عشق کی تڑپ سے بھرپور اور بہت ہی پُر تاثیر ہے۔ ایک دوشیزہ جو کسی کی منکوحہ[1] تھی میرؔ صاحب سے اس کی راہ و رسم پیدا ہوگئی۔ رفتہ رفتہ ارتباط یہاں تک بڑھا کہ معمولی رسم وراہ محبت میں تبدیل ہوگئی اور دونوں طرف سے پینگیں بڑھنے لگیں لیکن کسی کی منکوحہ کسی سے محبت کر کے بھی کیا کرتی۔ نتیجہ میں ہجر کی دشوار منزلوں سے میرؔ کو دوچار ہونا پڑا اور جو ناکام تقدیر لے کر وہ اس دنیا میں آئے تھے ہر موڑ پر ان کے سد راہ بنی رہی۔ اس فراق میں جو کچھ ان پر گزری ہے بڑے پر اثر انداز میں لکھا ہے۔ فراق کی یہ سختیاں تو جھیلنی ہی تھیں کیوں کہ:

---

[1] 'عیارستان' قاضی عبدالودود صفحہ ۱۸۱

وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے
پر تصرف میں ایک اور کے تھے

میر کی اس مثنوی کی فضا بالکل پرالم نہیں ہے بلکہ خوشگوار ماحول بھی پیدا ہے۔ کوئی رکاکت اور عریانی بھی نہیں۔ ان کے اور معشوق کے درمیان لگاوٹ کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے پاؤں بھی پھیلاتا ہے اور یہ اپنی آنکھیں اس پر ملنے لگتے ہیں۔ کبھی وہ خود ادھر آتا ہے اور موقع پا کر شرارت سے خود ہی ان کی آنکھوں پر پاؤں رکھ دیتا ہے کہ لو اپنی دلی تمنا پوری کرلو۔

گاہ بے گاہ پاؤں پھیلاتے — میری آنکھوں سے تلوے ملواتے
چل کر آتے تھے جب کبھو ادھر — پاؤں رکھتے تھے میری آنکھوں پر

غرض اس طرح لطف کے دن کٹتے رہے ایک روز ایسا ہوا کہ وفور شوق میں جبکہ معشوقہ پان کھا رہی تھی تو میر صاحب نے التجا کی کہ اپنے منہ کا چبایا ہوا پان مجھے دے دو۔ پہلے تو وہ ہنس کر ٹال گئی لیکن جانے کیا اس کے دل میں آئی کہ ان کے حسب منشا اس نے پان چبا کر ان کو پان دے دیا، اور اگال ملتے ہی میر نہال ہو گئے۔

ایک دن پان وے چباتے تھے — سرخ لب ان کے مجھ کو بھاتے تھے
کہہ اٹھا میں اگر اگال مجھے — منہ سے دو تو کرو نہال مجھے
ہنس کے اس وقت مجھ کو ٹال دیا — پھر اسی رنگ سے اگال دیا

اس طرح کی چھیڑ خانیاں برابر ہوتی رہتی تھیں۔ لطف و مدارت میں کسی طرح کی کمی نہ تھی۔ مگر چھیڑ بھی "خوباں" سے چلی جاتی تھی۔ میر اس چھیڑ خانی کے متعلق کہتے ہیں۔

پر جو معشوقی آب و گل میں ہے
چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہے

اور یہ چھیڑ خانی بھی صرف اس لئے تھے کہ وصل کی بات ہمیشہ ٹلتی رہی اور دل کی حسرت نہ نکل سکی۔ بقول غالب۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

یہاں تک کی قضائے کار اچانک معشوق سے جدا ہونا پڑا۔ مگر حیرت ہے کہ وصل کی تمنا ہی دل میں کیسے پیدا ہوئی جب کہ وہ ''تصرف میں ایک اور کے تھے۔'' اس سے تو میرؔ کے مقابلے میں ان کی معشوقہ کا کردار نظر آتا ہے۔ مگر اس تصور پر خود میرؔ کے بیان سے پانی پھر جاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ناؤ کے سوار تھے۔ صرف موقع اور وقت کا انتظار تھا۔ چنانچہ یہ موقع بھی آ ہی گیا کچھ دنوں کے بعد پھر دونوں کو ہم سفر ہونے کا اتفاق ہوا اور ''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'' سفر عشق کی آخری منزل بھی آ ہی گئی۔

شوق کا سب کہا قبول ہوا یعنی مقصود دل حصول ہوا
واسطے جس کے میں تھا آوارہ ہاتھ آئی مجھے وہ مہ پارہ

پاکیزگی عشق کی یہاں میرؔ نے مٹی پلید کر دی جس کا داستاں انہوں نے سر داستاں کیا تھا۔

کچھ نہ پوچھو کیا ہے عشق حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق عالی جناب رکھتا ہے جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

مگر پرائی عورت پر کتنے دن قابو چلتا۔ وہ چلتی بنی اور ان کی تقدیر پھر انہیں ہجر کی خونخوار وادی میں چھوڑ گئی۔ ڈاکٹر زورؔ[1] تو اسی پر زور دیتے ہیں کہ یہ میرؔ کی آپ بیتی ہے حقیقت کا علم تو خدا ہی کو ہے لیکن اگر صرف صیغہ متکلم سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے تو محل تامل ہے۔

مثنوی خواب و خیال

یہ مثنوی اسم با مسمّٰی ہے کیونکہ جس عشق کا اس میں تذکرہ ہے وہ ''خواب و خیال'' سے آگے نہ بڑھ سکا اور سچ پوچھئے تو یہی وہ عشق ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ میرؔ کی اپنی کہانی ہے۔ اس کے تاریخی شواہد ہیں۔ اس عشق نے میرؔ کو سب کی نظروں میں رسوا کیا، وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور ہوئے۔ عشق کی گرمی، اس پر افلاس کی مار، ہر طرف کا سہارا

---

[1] روح تنقید صفحہ ۱۸۱ حصہ دوم

ٹوٹا ہوا آخر کار سچ مچ کا جنون ہو گیا۔ کافی علاج و معالجہ کے بعد صحت ہوئی۔ لیکن ''بہ شہرِ خویش باپری تمثالے کہ............ در پردہ بعشق طبع میل خاطر داشت'' سے وصال حاصل نہ ہو سکا۔ واقعہ کی تفصیل باب اوّل میں آ چکی ہے۔[1]

مختصر یہ ہے کہ میر جب دہلی سے تعلیم پا کر دوبارہ اپنے وطن اکبر آباد گئے تو وہاں کسی قرابت مند لڑکی پر عاشق ہو گئے اور بات آخر مشتہر ہونے لگی۔ ہر طرف سے نفرت کا اظہار ہوا اور آخر میں ان کو اکبر آباد چھوڑ کر دوبارہ دہلی آنا پڑا اگر یہاں بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی اس لئے ابکی ان کے مربی خاں آرزو کے یہاں پذیرائی نہیں ہوئی بلکہ ڈانٹے گئے۔ روز بروز پریشانیاں بڑھتی گئیں اور یہ دیوانے ہو گئے۔ اس وقت ان کا حال یہ تھا جدھر دیکھتے جلوہ محبوب نظر آتا اور وحشت و دیوانگی میں اور ترقی ہوئی۔ جن باتوں کو میرؔ نے اپنی خودنوشت سوانح میں پس پردہ لکھا ہے وہ مثنوی میں آ کر کھل گئی ہیں۔ اس لئے یہ مثنوی ''خواب و خیال'' اسی دور کی داستاں پرالم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی کی ابتدا ہی پریشانیوں اور محرومیوں کے ذکر سے شروع ہوتی ہے۔

زمانے نے رکھا مجھے متصل ۔۔۔ پراگندہ روزی پراگندہ دل
وطن میں نہ اک صبح میں شام کی ۔۔۔ نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی
اٹھاتے ہی سر پر پڑا اتفاق ۔۔۔ کہ دشمن ہوئے سارے اہل نفاق
جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ ۔۔۔ دکھانے لگے داغ بالائے داغ

آخر اکبر آباد چھوڑنا پڑا، اس وقت دل خوں شدہ کا جو حال تھا اس کو میرؔ اس طرح لکھتے ہیں۔

چلا اکبرآباد سے جس گھڑی ۔۔۔ درو بام پر چشم حسرت پڑی
کہ ترک وطن پہلے کیوں کر کروں ۔۔۔ مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دوبارہ دلّی آئے لیکن یہاں بھی حالات بدل چکے تھے۔ خاں آرزو کو بت پردہ نشیں

---

[1] بہار بے خزاں

سے عشق کی خبر مل چکی تھی۔ وہ بھرے بیٹھے تھے یہ جب دسترخوان پر آئے تو انہوں نے ان کو خوب جھاڑا۔ یہ بیتاب ہو گئے اور وہاں سے روانہ ہوئے۔ مگر عشق کا سایہ جو پڑ چکا تھا، وہ دور نہ ہوا اور یہ پاگل ہو گئے، نوبت بند و سلاسل تک پہنچی، اس جنوں میں عجیب عجیب کیفیت ان پر طاری ہوتی، کبھی چاند میں کوئی مہ پارہ نظر آتی کبھی علم خیال میں ان سے ہمکنار ہوتی۔ ان باتوں کا ذکر ''ذکر میر'' میں ہے۔ اس مثنوی میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا　　مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا
نظر رات کو چاند پر جا پڑی　　تو گویا کہ بجلی سی دل پر گری
نظر آئی اک شکل مہتاب میں　　کمی آئی جس سے خور و خواب میں
جو دیکھو تو آنکھوں سے لوہو بہے　　نہ دیکھو تو جی پر قیامت رہے
کبھو صورت دلکش اپنی دکھایئے　　کبھو اپنے بالوں سے منہ کو چھپایئے
گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو　　طرح دشمنی کی نکالے کبھو
کبھو چیں بہ آبرو کبھو ہنس کے بات　　کبھو بے وفائی کبھو التفات

غرض عالم خیال میں وہ بہت کچھ دیکھتے تھے۔ سراپائے محبوب میں ایک شعر غضب کا کہہ گئے ہیں۔

سراپا میں جس جا نظر کیجیے
وہیں عمر اپنی بسر کیجیے

اگرچہ یہ فارسی کے مشہور شعر۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

سے ماخوذ ہے مگر اردو میں اگر پوری لطافت شعری کے ساتھ کوئی شعر اس کا جواب ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہو سکتا ہے۔

میر کا یہ عشق خواب و خیال ہی رہا البتہ ہجر و فراق اور چند روزہ قرب محبوب کے

عالم میں جو حالات وواردات ان کو پیش آئے ہیں ان کو اپنی چند مثنویوں میں مختلف اوزان و بحور میں جداگانہ ناموں سے انہوں نے نظم کیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند کا خیال ہے کہ ـــ ''خواب[1] و خیال اس سلسلے کی تیسری کڑی ہے۔ معاملات عشق میں ابتدائے عشق کی کیفیات مزے لے لے کر بیان کی ہیں۔ اس کے بعد جدائی ہواتی ہے۔ جوش ہجر میں عشق سے قبل کے واقعات کا تذکرہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے یہ نظم ہجر سے دوچار ہونے کے بعد لکھی ہے اس لئے اس میں فضا غمگین ہے۔ خواب و خیال میں اور زیادہ حقیقت نگاری کرتے ہیں۔ اس میں درازی ہجر کے بھیانک اور وحشت ناک اثرات کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس نظم میں درد کی کسک ہی نہیں دل و جگر کی تڑپ کا بیاں ہے۔''

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :

''..... مندرجہ بالا تینوں مثنویاں میؔر کے عنفوان شباب کے معاشقے کی مختلف منزلیں پیش کرتی ہیں۔ اس میں شاعرانہ مبالغہ ہوسکتا ہے لیکن ان مثنویوں کا بیان نرا تخئیل ہی نہیں تجربے سے تعلق رکھتا ہے......''

میؔر صاحب کے معاشقے کے اس واقعہ کو صاحب تذکرہ ''بہار بے خزاں'' نے لکھا ہے۔ لیکن میؔر کی زندگی کے حالات بیان کرنے میں بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ اکبرآباد کے بعد سے لکھنؤ تک کے حالات کو بجائے تفصیل کے ایک جملہ میں ختم کردیا ہے ''.......بعد خانہ براندار یہابہ شہر لکھنؤ رسید......'' اس خانہ براندازی میں اکبرآباد سے لکھنؤ تک کی زندگی شامل ہے۔

''بہار بے خزاں'' کی روایت کو دیگر شواہد کی روشنی میں خواجہ احمد فاروقی، مجنوں گورکھپوری اور عبدالباری آسی تسلیم کرتے ہیں۔ قاضی عبدالودود کے اعتراضات

---

[1] اردو مثنوی شمالی ہند میں صفحہ ۲۱۳-۱۴

تاریخ نویسی کی بنیاد پر ہیں اس لئے وہ معاشقہ میر کے منکر نہیں مگر مضبوط اور مستحکم دلیل چاہتے ہیں ۔اور جب تک دو اور دو چار کی طرح ان کو واضح دلیل نہ مل جائے محض ''مشہور است'' سے مطمئن نہیں ہو سکتے ۔مگر صفدر آہ سخت خفا ہیں اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس واقعہ کی تغلیط پر کمر بستہ ہیں کہ اکبر آباد میں میر نے کوئی عشق نہیں فرمایا البتہ'' —— آگے چل کر ان کے معاشقے ہوئے ہیں...... '' چلو یہی سہی ،ہم کو تو ان مثنویوں کے بارے میں یہی کہنا ہے کہ یہ مثنویاں نرا تخئیل نہیں ہیں تجربے سے تعلق رکھتی ہیں ۔

ان تین مثنویوں کے علاوہ بھی میر نے عشقیہ مثنویاں کہی ہیں ۔مگر وہ صرف افسانہ ہیں داستانی مثنویوں کی پیروی میں کہی گئی ہیں ۔ان کا تعلق میر کی ذات سے اشارۃً کنایۃً بھی نہیں ہے ۔پرانے قصوں کو لے کر کچھ ردو بدل کے بعد مثنوی لکھی گئی ہے ۔ان میں ایک مثنوی ''دریائے عشق'' ہے اور دوسری ''شعلۂ شوق'' تیسری مثنوی ''افعال پسر'' ہے ۔یہ سب مثنویاں قدیم قصوں سے ماخوذ ہیں اور بعض فارسی مثنویوں میں بھی کچھ فرق کے ساتھ موجود ہیں ۔ان کو دیکھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر نے یہ قصے صرف اس لئے نظم کئے ہیں کہ شاعری ایک صنف ''داستاں سراں'' بشکل مثنوی ان سے چھوٹ نہ جائے اور مافوق الفطرت 'ہیجان انگیز' مضامین ان کے فن کے اظہار میں سمٹ جائیں ۔

اگر یہ مثنویاں وہ نہ بھی لکھتے تو وہ عشقیہ مثنویاں جو اپنی ذات سے وابستہ دکھائی گئی ہیں ان کے اظہار کمال کے لئے کافی زیادہ تھیں ۔کیونکہ جن عشقیہ جذبات کا اظہار ان لایعنی افسانوں کے ذریعہ کیا گیا ہے وہ خود اپنی پوری توانائی کے ساتھ ان کی اپنی عشقیہ کہانیوں میں موجود تھے ۔ان مثنویوں کے افسانوی حصوں کو اگر جدا کر دیا جائے تو پھر ان مثنویوں اور شعلۂ عشق میں کوئی فرق نہیں رہتا ۔

دریائے عشق

اس کی کہانی یہ ہے کہ ایک جوان رعنا ''دل پھینک'' کہیں رہا کرتا تھا ۔عشق مزاجی

کا یہ عالم تھا کہ کسی حسین پر نظر پڑی اور ان کا جذبہ عشق سر نکالنے لگا۔ راہ چلتے کہیں ناوک مژگاں کے شکار ہوتے، کہیں تیغ ابرو سے بسمل، کبھی کسی زلف گرہ گیر کے اسیر۔ غرض ان کا خمیر ہی عشق کے مادے سے تیار ہوا تھا ایک دن گھر بیٹھے بیٹھے جو دل گھبرایا تو سیر تفریح کی خاطر گھر سے نکل کر کسی باغ میں آئے مگر جی نہ بہلا، نہ گلوں کی رنگینی ونزاکت دل کو لگی نہ سنبل وریحاں نے اپنی طرف کھینچا، نہ سرو شمشاد ہی میں کوئی کشش نظر آئی جو دیر سے ان کی وارفتگی کو دیکھ رہی تھی، نظر چار ہوتے ہی یہ ڈھیر ہو گئے۔ اب ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' وہیں عالم تحیر میں دیر تک کھڑے رہے۔ اس نے ان کو یوں اپنی طرف تکتے ہوئے دیکھا تو فوراً اٹھ کر کھڑکی سے ہٹ گئی۔ ان پر ایسا عشق کا جن سوار تھا کہ ننگ و ناموس کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور مرن برت شروع کر دیا۔ یہ گھر کسی ہندو کا تھا اور وہ لڑکی بھی ہندو تھی۔ یہ دروازے سے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ بات مشتہر ہوئی، لڑکی کی بدنامی ہوئی۔ والدین نے اس کو بہت ڈانٹا۔ اس نے جواب میں کہا، میں کب اسے پسند کرتی ہوں۔ مگر بات پھیل چکی تھی اور اس نے مرنے کی قسم کھالی تھی۔ کسی کے دروازے پر فاقہ کشی کر کے مر جانا بڑے عیب کی بات ہے اس لئے گھر والوں نے چاہا پہلے اس کا فاقہ ختم کرنا چاہئے، جب بہت اصرار ہوا تو عاشق صادق آمادہ مرگ نوجوان نے یہ شرط رکھی کہ اگر اس کی محبوبہ اس کو خود آکر کھانا دے تو وہ کھا سکتا ہے۔ اس لئے بہ تقاضائے وقت والدین نے لڑکی سے کہا جا کر کھانا دیدے۔ لڑکی کھانا دینے آئی تو خود بھی بلائے محبت میں گرفتار ہو گئی۔

ایک روز وہ لڑکی اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ پڑھ کر جا رہی تھی راہ میں دریا سے گزرنا ہوتا تھا۔ جب سب مسافر کشتی میں سوار ہونے لگے تو عاشق بھی کشتی میں بیٹھ گیا بیچ دریا میں کسی طرح لڑکی کی جوتی گر گئی، عاشق جوتی نکالنے کے لئے دریا میں کود کر غرقاب ہو گیا۔ لڑکی تیر تھ کو گئی مگر بہت اداس رہی۔ واپس آنے کے بعد اپنی دایہ سے ایک روز اس نے کہا چلو دریا کی سیر کریں۔ کشتی میں بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا جوتی کہاں گری تھی۔ دایہ اس کے عزم و ارادے سے تو واقف نہ تھی۔ اس نے جگہ بتا دی یہ بھی وہاں کود کر غرقاب ہو گئی۔ جال ڈالا گیا

تو دونوں لاشیں چسپاں برآمد ہوئیں جو کسی طرح جدا نہیں ہوتی تھیں۔

اس کہانی کا ماخذ فارسی کی ایک مثنوی ''قضا و قدر'' ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں ناظم بنگالہ شائستہ خاں کا قاصد شاہی دربار میں تحفہ لے کر جا رہا تھا۔ راہ میں کسی بت کافر پر عاشق ہو گیا اور پھر اس کو اپنی کچھ سدھ بدھ نہ رہی۔ معشوق کے دروازے پر جم گیا پھر وہی کچھ ہوا جس کو اردو مثنوی میں تھوڑے رد و بدل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس فارسی[1] مثنوی کا پتہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے کو لگا اور انہوں نے ماخذ ''دریائے عشق'' کے نام سے ایک مضمون رسالہ اردو میں شائع کیا۔ اس مثنوی کا پہلا شعر ہے۔

امیرے بود بے مثل و یگانہ

بہ جود لطف مشہور زمانہ

دریائے عشق کی اٹھان مثنویات میرؔ کی دیگر عشقیہ مثنویوں کی طرح ہے۔ ابتدا میں عشق کی سربلندی پھر مدعا کی طرف گریز اور قصہ کی ابتدا۔

رتبۂ عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال ——— ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا ——— کہیں سینے میں آہ سرد ہوا
کہیں آنکھوں سے خوں ہو کے بہا ——— کہیں سر میں جنوں ہو کے رہا
کشش اس کی ہے اک اعجوبہ ——— ڈوبا عشق تو بار بھی ڈوبا

واقعات کے بیان میں میرؔ کا اپنا رنگ ہر جگہ جھلکتا ہے۔ بیان میں سادگی کے ساتھ جذبات کی فراوانی ہے۔ عاشق خود بھی طرحداروں اور جواں رعنا ہے مگر حسن طلب دل کہیں چین نہیں لینے دیتا۔ طلب معشوق میں گھر سے نکلا۔

تھا طرحدار آپ بھی لیکن ——— رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
ایک دن بے کلی سے گھبرایا ——— سیر کرنے کو باغ میں آیا

---

[1] رسالہ اردو ۱۵ء

نہ تسلی ہوا دل بے تاب — نہ تھما چشم تر سے خوں ناب

اسی معشوق طلبی میں اک کوچے سے گزر ہوا ۔

ایک غرفے سے ایک مہ پارہ — تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی — پھر نہ آئی اس خبر اس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

قصہ کوتاہ جملہ مراحل سے گزرنے کے بعد ڈوب مرنے کا وقت آگیا۔ میر صاحب نے بحر امواج کی روانی میں خاص طوفان اٹھایا ہے اور دریائے عشق کا ہمپلہ بنا کر پیش کیا ہے ۔

آب تھا کیا بحر تھا ذخار — تند، مواج و تیرہ وتہ دار
موج کا ہر کنایہ طوفاں پر — مارے چشمک حباب عماں پر
ہم کنار بلا ہر اک گرداب — لجہ سرمایہ بخش تیرہ سحاب
گزر موج جب نہ تب دیکھا — ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا

میر نے مثنوی کا خاکہ "قضا و قدر" سے اخذ کیا تھا اور عاشق کو غریق بحر رحمت کرنے کا تصور بھی وہیں سے قائم کیا تھا مگر ڈاکٹر عبداللہ نے اس ڈوب مرنے کی توجیہہ بہت فلسفیانہ انداز میں کی ہے اور ایک خاص پہلو اس میں پیدا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "[۱] __ انسان روح کو دریاؤں اور سمندروں کی وسعتوں سے خاص انس ہے۔ اس کی لانہائیت ان کی غیر محدودیت ہمارے تخیل کی دنیا میں بڑا ہیجان پیدا کرتی ہے میر کی مثالی عشق کے لئے دریاؤں اور سمندروں کی وسعت کی ضرورت تھی۔ اس اعتبار سے انجام کی یہ صورت میر کے ذہن کی موقع شناسی اور معاملہ فہمی کا قوی ثبوت ہے۔
> پانی کی گہرائی نے بڑے بڑے مفکرین کے احساس اور ان کے ذہن و نظر کو متحرک کیا ہے چنانچہ پانی سے اس دل بستگی کے ثبوت ان کے

---

[۱] "میر کی مثنوی نگاری" از افکار میر صفحہ ۲۶۹

کلام اور تصانیف میں ملتے ہیں۔ مرزا غالب کا یہ شعر بھی میر کے عاشق کے المیہ کا انجام کا تصور پیش کرتا ہے۔

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ڈاکٹر عبداللہ کی رائے میں میر کی یہی معاملہ فہمی ان کی مثنوی کی الم انگیزی کو برقرار اور لازوال بناتی ہے۔"

شعلۂ عشق

اس مثنوی میں جو واقعہ نظم کیا گیا ہے اگر از قسم کرامات الاولیا ہوتا تو عقیدۃً تسلیم کر لیتے۔ اگر پرستاں سے اس کا تعلق ہوتا تو یہ کہہ کر خموش ہو جاتے کہ جولانی طبع کی کرشمہ سازی ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ نہ مانتے بنتی ہے نہ انکار کرتے ہوئے۔ اس دور از عقل واقعہ کے ثبوت میں تاریخی شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔ جگہ، مقام، زمانہ کی تعین کی جاتی ہے، ایک نوشتہ پیش کیا جاتا ہے۔ مانئے تو کیسے مانئے انکار کیجئے۔ تو کیسے کیجئے اگر چہ پوری کہانی میں کوئی بات نہیں جو وقوع پذیر نہ ہو سکتی ہو۔ لیکن انجام کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اختصار کے ساتھ واقعہ یوں ہے:

ایک جواں رعنا عظیم آباد پٹنہ کا رہنے والا جس کا نام حسن تھا ایک روز سیر کرتا ہوا گنگا کی طرف جا نکلا۔ ایک مہاجن کی نوخیز لڑکی اشنان کر کے چلی آ رہی تھی۔ دونوں ہی اپنے حسن میں طاق تھے۔ آنکھیں چار ہو گئیں اور دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف کھنچ گئے۔ حسن کے دل میں یہ بات آئی کہ اس کے گھر آمد و رفت کی راہ نکالی جائے، چنانچہ اس نے پہلے اپنا نام تبدیل کیا اور بجائے حسن کے پرسرام نام رکھا اور سنسکرت میں مہارت پیدا کر کے ہندوؤں کے مذہبی علوم میں کامل دستگاہ حاصل کر لی اور اس طرح مہاجن کے گھر پنڈت بن کر اپنی راہ پیدا کر لی اور آمد و رفت شروع کر دی۔ اس گھر میں اتنا رسوخ پیدا کر لیا کہ

کچھ دنوں کے بعد جب اس لڑکی کی شادی ہونے لگی تو شادی کے مذہبی مراسم کی انجام دہی کے لئے پرسرام ہی کو پنڈت مقرر کیا گیا۔ٹھیک اس وقت جب کہ مذہبی رسومات ادا کئے جارہے تھے گھر میں آگ لگ گئی۔شعلے بلند ہوئے اور افراتفری مچی۔اسی عالم میں پرسرام اپنی محبوبہ شیام سندر کو اپنی گود میں اٹھا کر کھڑکی سے باہر کود گیا۔آگ ایسی سخت لگی تھی جس پر قابو نہ پایا جا سکا اور تمام املاک جل کر راکھ ہو گئے۔لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ دونوں بھی جل کر راکھ ہو گئے اس لئے تقدیر الہٰی پر صبر کر کے سب خموش ہو گئے۔

پرسرام لڑکی کو لے گھر آیا اور کچھ دنوں کے بعد ارادہ کیا کہ پھر اس کو اپنے ماں باپ تک پہنچا دے لیکن شیام سندر خود راضی نہیں ہوئی تو حسن نے اس سے عقد پڑھالیا اور مسرت کے دن دونوں گزارنے لگے۔اتفاقاً حسن ایک مرتبہ کسی میلے میں کشتی سے جارہا تھا کہ کشتی طوفان میں گھر کر ڈوب گئی۔یہ خبر اس کے گھر پہنچی کہ حسن دریا میں ڈوب گیا تو شیام سندر نے بھی اپنی جان دیدی۔مگر حسن ڈوب کر مرا نہ تھا، بلکہ ڈوبتا ابھرتا کسی طرح کنارے تک پہنچا گھر پہنچ کر شیام سندر کے جان دیدینے کی خبر ملی۔پھر جو حال اس کا ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔کچھ مدت کے بعد یہ معلوم ہوا کہ دریا میں آسمان سے ایک روشنی اترتی ہے اور وہ حسن کا نام لے کر پکارتی ہے۔حسن نے اپنے داستان حیات ایک رقعہ کی شکل میں قلمبند کر کے اپنی صدری کی جیب میں رکھ لی اور کشتی پر سوار ہو کر شب کے وقت اس شعلے کی تلاش میں نکلا اور اپنی صدری اتار کر کشتی میں رکھ دی چنانچہ جب رات گئی آسمان سے ایک روشنی اترتی ہوئی نظر آئی پھر پانی کی سطح پر پر درد آواز میں حسن کو پکارنے لگی۔حسن بے تابانہ پانی میں کود کر شعلے کی طرف بڑھا اور اس میں سما گیا۔تھوڑی دیر کے بعد دریا کے اندر سے دو روشنیاں نمودار ہوئیں ایک حسن اور دوسرے سے شیام سندر کی آواز تھی۔ساری فضا منور تھی۔کچھ دیر کے بعد رفتہ رفتہ روشنی مدھم پڑنے لگی اور ہر طرف گھپ اندھیرا چھا گیا۔یہ واقعہ بہ گران قالب مداح کے ذریعہ یا ان احباب کے ذریعہ جو اس کشتی میں سوار تھے مشتہر ہوا اور حسن کی صدری سے وہ رقعہ بھی برآمد ہوا جس میں حسن نے اپنے احوال عشق رقم کئے تھے۔

اس واقعہ کو مولانا شوقؔ نیموی نے اپنی مثنوی مولگداز ''حسن اور شیام سندر'' کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ اور خواجہ احمد فاروقی[1] نے بھی اپنی کتاب ''میرؔ، حیات اور شاعری'' میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے کہ یہ واقعہ محمد شاہ کے عہد میں عظیم آباد کے محلّہ چھوٹی پٹن دیوی میں وقوع پذیر ہوا۔ مثنوی شعلہ عشق کے قدیم مخطوطات میں یہ عبارت بھی لکھی ملتی ہے۔

''آغاز قصہ جانکاہ کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد درو بروے وضیع وشریف ظہور پیوستہ......''

شوق نیموی لکھتے ہیں کہ یہ ایک سچی داستان ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس گذرے کہ یہ واقعہ عظیم آباد میں پیش آیا[2]۔ عشق نے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ اس نوشتہ کو عبداللہ تائید عظیم آبادی نے بذریعہ خط ۱۲۰۶ھ مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے پاس بھیجا تھا۔ زبدۃ المنشات جو تائید عظیم آبادی کے خطوط کا مجمعہ ہے اور جس کو ان کے بیٹے تمنا نے جمع کیا ہے اس میں اس خط کی نقل موجود ہے۔

قاضی عبدالودود[3] لکھتے ہیں کہ

''ریاض المنشات'' خود تائید کا جمع کردہ خطوط کا مجموعہ ہے اس میں یہ خط نہیں ہے ''ریاض المنشات'' میں اس خط کا نہ ہونا خط کی تکذیب نہیں کرتا۔ کیونکہ تمنا نے اپنے مجموعہ خطوط میں تائید کے وہ خطوط بھی جمع کر دیئے ہوں گے جو ریاض المنشات میں نقل ہونے سے رہ گئے اسی لئے یہ خط زبدۃ المنشات میں ہے ریاض المنشات میں نہیں ہے۔ زبدۃ المنشات میں یہ عبارت بھی ملتی ہے۔

''ـــــ در مکاں عالی شاں آں مہاجن کہ قریب چوک بود بعد حادثۂ آتش زدگی بنام آں عروس اشتہار یافتہ ـــــ'' یہ ایک حقیقت ہے کہ پٹنہ چوک پر باڑے کی گلی کے پاس مہاجنوں کا ایک محلّہ سندر باڑہ اب بھی مشہور ہے اور وہ مہاجنوں ہی کا محلّہ ہے۔

مثنوی شعلہ عشق کے نام میں بھی اختلاف ہے۔ بعض میں محض شعلہ شوق اور بعض

---

[1] میر۔ حیات اور شاعری صفحہ ۲۲۸ [2] دیباچہ مثنوی سوز وگداز [3] عیارستان صفحہ ۱۸۴

نسخوں میں شعلہ عشق ہے لیکن قرینۂ غالب یہی ہے کہ اس کا نام انہوں نے ''شعلہ شوق'' ہی رکھا ہے کیوں کہ اکثر نسخوں میں یہی نام ہے۔ قاضی عبدالودود[1] صاحب نے سب سے پہلی اشاعت کا حوالہ دے کر اس کا نام شعلہ شوق ہی بتایا ہے۔ نسخہ رام پور میں بھی یہی نام ہے۔ علاوہ ازیں میرؔ اپنی مثنویوں میں کسی نہ کسی واسطے سے نام کی طرف بھی اشارہ کر دیتے ہیں چنانچہ اس مثنوی میں ایک شعر ہے جس میں وہ شعلۂ شوق ہی لائے ہیں۔

ہوا شعلہ شوق دل سے بلند رہا لوٹتا آگ میں جو سپند

پس مرگ محبت کا یہ نورانی انجام فارسی کی ایک مثنوی ''تصویر محبت[2]'' منظومہ میر شمس الدین فقیر دہلوی میں بھی موجود ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۱۵۶ھ بتایا جاتا ہے اس میں ممدوح کا نام رام چندر ہے۔ شاہ آیت اللہ جوہری کی مثنوی میں بھی شعلہ کا مضمون موجود ہے۔ قرینہ یہ ہے کہ جو رقعہ محمد شاہ کو بھیجا گیا تھا اس کا شہر دہلی میں ہوا اور فقیر نے فارسی میں نظم کیا۔ پٹنہ کا تو واقعہ ہی بتایا جاتا ہے۔ جوہری نے اپنے وطن میں سنا اور نظم کیا۔ جب میرؔ نے توجہ کی تو فقیر کا نسخہ ان کے سامنے تھا۔ اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے انہوں نے واقعات میں کچھ ترمیم و تنسیخ کر دی اور اپنے طور پر اس کو نظم کر دیا۔ میرؔ کا اندازہ یہ ہے کہ جب کوئی مثنوی لکھتے ہیں تو پہلے قصیدہ کی طرح عشق کی مختلف کیفیات اور واقعہ کے مختلف پہلوؤں کو ایک دوسرے کا مماثل بناتے ہوئے انجام کی طرف اشارہ بھی کر دیتے ہیں۔ ان کی عشقیہ مثنویوں میں تقریباً ہر جگہ یہی انداز ہے چنانچہ اس مثنوی کی ابتدا بھی اسی طرح ہے۔

محبت نے ظلمت کا کاڑھا ہے نور نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت ہی اس کارخانے میں ہے محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے
محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ
محبت کی ہے کارپردازیاں کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں
محبت کی آتش سے اخگر ہے دل محبت نہ ہوے تو پتھر ہے دل

---

[1] رسالہ معاصر نومبر ۵۹ [2] عیارستان صفحہ ۱۸۴

محبت لگاتی ہے پانی میں آگ　　محبت سے ہے تیغ گردوں میں لاگ

اس عشقیہ تمہید کے بعد قصے کی ابتدا ہوتی ہے۔

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا　　عجب اہل عالم کو جس سے ہوا

کہ واں اک جواں تھا پرسرام نام　　خوش اندام وخوش قامت وخوش خرام

میر نے واقعہ میں ترمیم و تنسیخ کی ہے کہ خود پرسرام کو کسی محبوب و مطلوب اور اس کے حسن کا دلدادہ بنایا ہے جو اس کو جان و دل سے چاہتا ہے۔ایک مدت کے بعد پرسرام کی شادی ہو جاتی ہے۔نئی دلہن کی الفت میں کئی دنوں تک نہیں آتا۔ پھر جب اپنے چاہنے والے سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ اپنے نہ آنے کی وجہ بتاتا ہے۔اس کا چاہنے والا اس کو عورت کی طرف سے متنفر کرتا ہے ان کو بے وفا ثابت کرتا ہے اور یہ مشورہ دیتا ہے کہ اگر شک ہے تو امتحان لے کر دیکھ لو۔چنانچہ پرسرام کے پانی میں ڈوب کر مر جانے کی جھوٹی خبر شیام سندر کو سنائی جاتی ہے اور وہ بے تابانہ گنگا میں جا کر ڈوب جاتی ہے۔پرسرام کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔پھر اس کو اس کا نام لے کر پکارنے والے شعلے کی خبر لیتی ہے اور وہ دریا پر شب کی تاریکی میں اس کی تلاش میں جاتا ہے اور اسی شعلے میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

لب آب وہ شعلۂ جاں گداز　　تڑپ کر بہت بازباں دراز

پکارا کہاں ہے پرسرام تو　　محبت کا ٹک دیکھ انجام تو

سخن مختصر وہ شعلہ چلا　　کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا

بہم گرم جوشی سے یکجا ہوئے　　کہ گزری تھی مدت بھی تنہا ہوئے

وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل　　کہے تو تسلی ہوئے جان و دل

میر کی واقعاتی مثنویاں

میر کی عشقیہ مثنویاں محض جولانی طبع کے حدود سے آگے نہیں ہیں اور ایسی دل خوش کن باتیں تو بہت لکھی گئیں۔میر سے پہلے بھی اور میر کے بعد بھی اور آج بھی کسی کی

طبیعت ترنگ پر آتی ہے تو کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا ہے لیکن ہماری نگاہ میں ان کی واقعاتی مثنویاں کہیں قیمتی ہیں کیوں کہ یہ نہ صرف میر کی زندگی کی سچی داستان سناتی ہیں بلکہ ماحول کا نقشہ بھی ہماری نگاہوں میں کھینچ دیتی ہیں۔ میر اگر ان مثنویوں میں زمانے کا تعین بھی کرتے جاتے تو آج یہ تاریخ کی قیمتی ورق ہوتیں مگر میر کے پیش نظر تاریخ نہیں تھی اور نہ شاید ان کو یہ خیال بھی پیدا ہوا ہوگا کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ ان قلم کی نکلی ہوئی باتیں خود میری زندگی کی تاریخی دستاویز بنیں گی تو شاید وہ تاریخ بھی دیدیتے مگر نہیں یہ ان کا مزاج ہی نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو ''ذکر میر'' ان کی زندگی کے حالات کے لئے حرف آخر ہوتی۔ مگر وہ شاعر تھے۔ ان پر جو گزرتی یا جو کچھ دیکھتے اس کو اپنے اشعار میں اپنی قادر الکلامی سے شاعرانہ انداز میں پیش کر دیتے۔ نہ وہ تاریخ مرتب کر رہے تھے نہ ان کو ایسا خیال گزرا۔ پھر بھی جو کچھ لکھ گئے وہ تاریخ کے طالب علم کے لئے بہت اہم ہیں۔ ان واقعاتی مثنویوں میں بعض سے اس وقت گفتگو کی جائے گی۔

ننگ نامہ

اس مثنوی میں بھی انہوں نے اپنی داستان محبت مزے لے کر چھیڑی ہے لیکن ہم اس سے الگ ہو کر اس کے دوسرے پہلوؤں کو نمایاں کریں گے۔ یہ مثنوی شاہ عالم کے دور حیات میں جب کہ وہ خودسر برآرائے تخت تھے لکھی گئی۔ میر نے ننگ[1] کا سفر ۱۱۶۶ھ میں کیا تھا اس کے قرب میں انہوں نے یہ مثنوی لکھی ہے اور شاہ عالم ۱۸۰۶ء[2] مطابق ۱۸۸۶ء تک حکومت کی۔ اس لئے یہ مثنوی شاہ عالم کے دور ہی میں لکھی گئی۔ چنانچہ اس کا ایک شعر بھی اس کی شہادت دیتا ہے۔

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم
ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

---

[1] ''میر و میریات'' صفحہ ۳۲۱ [2] اردو مثنوی شمالی ہند میں صفحہ ۲۴۲

اُس دور میں بادشاہ کی کمزوری، ملک کی پریشان حالی، دیہاتوں کا ابتر حال، گنواروں کی زندگی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اثنائے سفر میں ایک گاؤں کی سرا میں ٹھہرنے اتفاق ہوا تو وہاں کی تصویر کشی کی ہے، جس سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ شاہی کے باوجود ان کی مفلسی ضرب المثل ہو چکی تھی۔

ڈھونڈتے ڈھونڈتے سرا پائی	ایسے گھر چھوٹے دیسی جاپائی
رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان	جو کہا اس نے سب گئے ہم مان
کچھ پکانے کا جب سوال کیا	میں نے اظہار اپنا حال کیا
یاں جو لائے ہیں ہم کو اپنے ساتھ	زندگانی ہے میری ان کے ہاتھ
پہنچے ہے ان کے روبرو سے طعام	صبح کا صبح اور شام کا شام

لیکن میرؔ صاحب اس مثنوی میں اپنے ساتھ لے جانے والے کا نام نہیں بتاتے اور بتائیں بھی تو کیسے بتائیں۔ اس کی منکوحہ یا داشتہ سے تو عشق فرما رہے تھے "معاملات عشق" میں انہوں نے اپنے ایک سفر کے درمیان اپنے عشق کا واقعہ لکھا ہے۔ کیا عجب وہ یہی نسنگ کا سفر ہو۔ اگر چہ مثنوی "نسنگ نامہ" میں انہوں نے عشق کی کوئی بات نظم نہیں کی ہے۔

میرؔ صاحب کے جواب سے بھٹیاری برہم ہو کر کہتی ہے ؎

سن کے ایک دل سے اس نے کھینچی آہ	اور بولی کہ واہ صاحب واہ
ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے	چار پانچ آدمی ہیں ساتھ کھڑے
کچھ یہ کھائیں گے کچھ کھلائیں گے	ہم کچھ ان کے سبب سے پائیں گے
سو تو نکلے ہو کورے بالم تم	ہو گدا، جیسے شاہ عالم، تم
کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے بات	دیکھئے کس طرح سے گذرے رات
صدقے میں ایسے بھی اتارے کے	سو گئے بخت ہمارے کے

سرا میں رہنے کے لئے جو گھر ملا اس میں منجملہ اور خرابیوں کے ایک تکلیف وہ بات یہ تھی کہ ہر سمت سے کتوں کی یورش تھی جس سے رات کی نیند حرام تھی۔

دن کو وہ صورت طعام ہوئی　　رات کو نیند یوں حرام ہوئی
کتوں کے چار اور رستے تھے　　کتے ہی واں کتے تو بستے تھے
ایک نے پھوڑ باسن اکو نے　　کھود مارے گھروں کے سب کونے
ایک نے آکے دیگچہ چاٹا　　ایک آیا سوکھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا　　پھر پیا آکے تیل گر چھوڑا
گھر میں جھینگے اگر ہیں توڑ دیئے　　ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیئے
چھر چھڑاوے کان کو کوئی　　روے ہے اپنی جان کو کوئی
اک طرف سے چپڑ چپڑ کی صدا　　یعنی کتا ہے چکی چاٹ رہا
ایک کے منہ میں ہانڈی ہے کالی　　ایک نے چینی چاٹ ہے ڈالی
تیل کی کپی ایک لے بھاگا　　ایک چکنے گھڑے سے جا لاگا[1]

سفر تمام کر کے ''نسنگ'' پہنچتے ہیں۔ اس بستی کی زبوں حالی اس طرح پیش کی ہے۔

بستی دیکھی تو ایسی تھی آباد　　کہ بیاباں سخت سے دے باد
چار چھپر کہیں چماروں کے　　سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
اور جو چار گھر نظر آئے　　ان کی خوبی کھلے وہیں جائے
وہ بھی کوئی چمار تھے کوئی　　فاقوں سے زیر بار تھے کوئی
صورتیں کالی اور سوکھے سے　　سارے کنگال اور بھوکے سے

نسنگ کے بازاروں اور وہاں کے بنیوں کے اطوار کو اس طرح پیش کیا ہے۔

اور آگے گئے تو تھا بازار　　اس میں بنیوں کی تھیں دوکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا　　تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا

---

[1] میر نے اپنی نظم ''گھر کا حال'' میں بھی کتوں سے پریشانی کا حال لکھا ہے، ڈاکٹر زور کو شاید غلط فہمی ہوئی اور سرا کے ان کتوں کو بھی انہوں نے انہیں کتوں کا شریک سمجھ کر ان اشعار کو بھی اس نظم کا جزو سمجھا ہے۔
روح تنقید حصہ دوم صفحہ ۳۴۲

ایک کے سانواں اور تھوڑے چنے　　چھبڑوں من خاک دھول ایک کنے
چوتھا باقی رہا سو تھا کنگال　　ناؤں کو کہتے تھے اسے بقال
ایک کنجڑے کے چار گٹھی پیاز　　تس پہ اس کو ہزار فخر و ناز
کیا کہوں مرچ نہ ادرک تھی　　اس مچھندر میں کچھ بھی بھدرک تھی

پنساری کی شوخ چشمی:

اس سے جاکر جو مانگتے ہلدی　　زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے　　بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں　　میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں
مانگو اس سے مرچ یا دھنیا　　دیوے لچا وہی بتا دھنیا
لونگ چورا نفر سے منگوایا　　لال مرچیں کٹی ہوئی لایا

اس مثنوی میں میر صاحب نے جس طرح اپنے جملہ واقعات کی تفصیل بیان کی ہے اس سے ان کی واقعہ نگاری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور یہی رنگ ان کی دیگر واقعاتی مثنویوں کا ہے۔

مثنوی گھر کا حال

اس مثنوی میں میر نے اپنے خستہ حال مکان کی کیفیت اور اس میں اپنی داستان کرب والم بیان کی ہے۔ برسات کے موسم میں مکان کی بدحالی، ہر وقت اس کے گرنے کا امکان۔ لونی کی وجہ سے مٹی کا جھڑنا، ہر جگہ ٹپکنا، بہت تفصیل سے لکھا۔ صورت یہ ہوئی کہ بارش شدت کے ساتھ ہونے لگی، ہوا طوفانی چل رہی تھی۔ مکان ہر طرف سے ٹپکنے لگا۔ کہیں بھی اٹھنے بیٹھنے کی جگہ نہ رہی۔ دیواروں سے مٹی جھڑ رہی تھی۔ منڈیر ٹوٹ کر گر رہی تھی ایک سمت کی دیوار اتنی خراب ہو چکی تھی کہ اگر گر گئی تو گھر بھی بے پردہ ہو جائے گا۔ ایک طرف کی دیوار شکستہ ہو کر اس طرح پھٹ چکی تھی کہ کتوں نے آمد و رفت کی راہ بنالی تھی۔ اس پریشانی

میں ایک کمرہ جو کسی حد تک درست تھا اس کا بھی یہ حال تھا کہ کوئی داس کہیں سے چھوٹ چکا تھا، چھت کی کڑیاں ایسی خستہ ہو گئی تھیں کہ چڑیوں نے اپنا گھونسلہ بنا کر ارد گرد غار کر دیئے تھے۔ جا بجا سے بندش ڈھیلی ہو چکی تھی جس سے ہر وقت گرنے کا احتمال رہا کرتا تھا، اسی کمرے میں پناہ لینے کی ٹھہری لیکن اس کہنگی شکستگی کے ساتھ اس تنگ و تاریک کمرے میں جملہ قسم کے حشرات الارض بھرے پڑے تھے۔ برسات کا موسم، ہر جگہ مچھروں کی یورش، کہیں کنکھجورا دوڑ رہا ہے، کہیں چھت سے ہزار پایہ گر رہا ہے کہیں کوئی سنپولیا دوڑ رہا ہے، کہیں چھپکلیاں بھاگ رہی ہیں۔ ایک خستہ و شکستہ پلنگ جن کے بان جھنگر چاٹ چکے تھے کھٹملوں سے اٹا پڑا تھا۔ کئی دنوں اسی حال میں بسر ہوئی لیکن اس باد و باراں میں ہر آن جان کا خطرہ رہنے لگا تو مجبوراً ایک روز موسلا دھار بارش میں مکان سے نکلنا پڑا اور سب گھر بار کو لیکر میر صاحب نکلے اور کسی پڑوس کے مکان میں پناہ لی۔

یہ مثنوی میر کے افلاس اور تنگدستی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس مثنوی سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت میر دہلی میں متاہل زندگی گزار رہے تھے۔ میر جب کسی واقعہ کو نظم کرتے ہیں تو اس کی جزئیات کو بڑی تفصیل سے بہت مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اس مثنوی کا عنوان اگر چہ ''در ہجو خانۂ خود'' ہے لیکن یہ ہجو مکان کی نہیں بلکہ خود اپنی زندگی پر طنز ہے۔ پہلے ہی شعر سے دل کا کرب نمایاں ہے۔

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے
اس طرح خانہ ہم پہ زنداں ہے

اس مثنوی کو میر نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ اس کا عنوان ہے ''در ہجو خانۂ خود'' جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اس خرابی سے میں ہوا پامال

اس حصہ میں گھر کی پوری تصویر کشی کی ہے۔

گھر کیا تاریک و تیرہ زنداں ہے	سخت دلتنگ یوسف جاں ہے
کوچہ موج سے بھی آنگن تنگ	کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چار دیواری سو جگہ سے خم	ترنگ ہو تو سوکھتے ہیں مسہم
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق	سو شکستہ تر از دل عاشق
کونے پھوٹے ہیں طاق ٹوٹے ہیں	پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
دیکھے مرنا ہمیشہ مدنظر	گھر کہاں صاف موت کا ہے گھر
کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال	پڑڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار	تھر تھرادے بھبھیری سی دیوار

مدحیہ مثنویاں "جنگ نامہ"

میر جب لکھنؤ آئے تو دربار آصفی سے وابستہ ہو گئے۔ نواب کی نگاہ کرم شامل حال رہا کرتی تھی اکثر سفر و حضر میں ساتھ رکھتے تھے۔

رام پور کے نواب[۱] محمد علی خاں ۱۲۰۹ھ میں تخت نشیں ہوئے لیکن شراب نوشی کی کثرت کی وجہ سے فوجیوں نے ان کو تخت سے اتار کر ان کے بیٹے غلام محمد خاں کو تخت نشیں کر دیا۔ کچھ دنوں کے بعد محمد علی خاں قتل کر دیئے گئے۔ یہ سارے ہنگامے، بلوے ہوتے رہے مگر آصف الدولہ نے بجائے اس کے کہ اس بلوے کو ختم کرتے کچھ رقم لے کر خموش ہو گئے۔ مگر کمپنی بہادر کب چپ رہنے والی تھی وہ فوراً مقابلہ کو روانہ ہو گئی۔ آصف الدولہ کو فوج لے کر بلایا لیکن انہوں نے پہنچنے میں دیر کی۔ ابھی ان کی فوج تلہو میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی کہ انگریزوں نے روہیلوں کو شکست دیدی۔ اس اثنا میں آصف الدولہ بھی فوج سے جا ملے۔ میر اس سفر میں آصف الدولہ کے ہمراہ تھے۔ یہ فتح جس کے کرتا دھرتا انگریز تھے اس کا سہرا میر نے آصف الدولہ کے سر باندھا ہے۔ اس نظم میں فوج کی نقل و حرکت اور شکوہ ملتا ہے لیکن

---

[۱] تاریخ اودھ جلد ۳ صفحہ ۳۰۶ از نجم الغنی

جنگ کی شعلہ سامانی نہیں ملتی۔ یہ خبر میر کے بس کی بھی نہ تھی۔ میر ایک فرشی انسان تھے وہ بزم کا نقشہ کھینچ سکتے تھے جیسا انہوں نے آصف الدولہ کی ہولی اور کتخدائی میں پیش کیا ہے۔

''جنگ نامے'' میں جنگ کا منظر اگر کہیں ملتا ہے تو وہ یہ چند اشعار ہیں۔

تھے تلنگے روہیلے محو جنگ — لوتھوں سے ہوگیا تھا عرصہ تنگ

گورے کالے جدا جدا کیا تھے — دونوں مردم گیا سے یکجا تھے

توپ پر آں کر چلی تلوار — جھیل کر زخم لڑا موا سردار

جنگ مغلوبہ تھی گتھے باہم — مرتے تھے دونوں اور کے ستم

صاحب انگریز کے گرے اکثر — تھک گئے لڑتے مرتے ہم دیگر

تاک کر بارھ پہلو سے ماری — صف الٹ دی حریف کی ساری

میر نے اس جنگ میں آصف الدولہ کا کوئی خاص جنگی کارنامہ نہیں دکھایا ہے۔ البتہ چند شعر ان کی تعریف میں کہے ہیں۔

اکبے نواب، رامپور آیا — ناگہاں اس طرف خدا لایا

پہلے آتا تھا بہر سیر و شکار — بازی یکسر روہیلی ہے اس بار

گرد بھی فوج کی سپہر تلک — بن گیا ایک اور تازہ فلک

یہ نہ سمجھے وزیر کوہ وقار — ہے تحمل سے رہ میں دیر گزار

یہ مثنوی اپنے موضوع کے اعتبار سے ناکام ہے۔

شکارنامہ

یہ مثنوی بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے ناکام ہے۔ صید افگنی، تیر اندازی، نیزہ بازی، تفنگ زنی، مستقل ایک فن ہے اور اس کے کچھ اصول ہیں مگر اس طرح کا کوئی مضمون اس میں نہیں بجز اس کے ایک بڑی فوج ظفر موج جنگل کے جانوروں پر حملہ آور ہوئی اور غریب جانوروں کو جہاں پایا اور جیسے پایا مار ڈالا۔ نہ چرند چھوڑے نہ پرند۔ نہ درندے جو سامنے آیا موت کے گھاٹ اتر گیا جو بچ رہے جنگل چھوڑ کر نکل بھاگے۔ غرض جانوروں سے

جنگل خالی کر کے آصف الدولہ اس ہلاکت آفرینی کے بعد اپنی فتح مند فوج کو لے کر گھر واپس آئے اور مال غنیمت میں جانوروں کی لاشیں لائے۔

شمس العلماء نواب امداد امام اثرؔ عظیم آبادی جو خود بھی فن صید افگنی میں مذاق صحیح رکھتے تھے اس مثنوی پر معترض ہیں۔

"......[۱] یہ مثنوی ان حضرات کو جو فن صید افگنی کے ماہر ہیں کسی طرح لذت نہیں بخش سکتی........نہ ان سے کسی مسئلہ کی تحقیق ظہور میں آتی ہے۔ اگر صید افگنی شیر و شغال کی جان لیتی ہے تو بہت خوب ہیں...... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں محض مدحت سرائی میں لکھی گئی ہیں۔"

آصف الدولہ کی مدح میں جابجا اشعار ملتے ہیں۔

چلا آصف الدولہ بہر شکار — نہاد بیاباں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ — لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانوں سے جانے لگے — وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

اسی طرح دوسرے روز کی شکار کی روانگی یوں شروع ہوتی ہے۔

چلا پھر نواب گردوں شکار — اسد باؤ کے گھوڑے پر ہو سوار
روانہ ہوئی فوج دریا مثال — نہنگوں کی اب کھینچی جائے گی کھال

اس سفر میں میرؔ میانہ پر سوار ہو کر گئے تھے راہ میں لوگوں نے دیکھا تو مضحکہ اڑایا۔

سواری سے مجھ کو ندامت ہوئی — کہ چاروں طرف سے ملامت ہوئی
چڑھے چار کے کاندھے جیتے ہی جی — لیا انگل اس سودے میں نفع بھی

مثنوی لکھنے کی غرض و غایت میرؔ نے خود آخر میں ظاہر کر دی ہے۔

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ — امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہنامے کی فکر — کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر

---

[۱] کاشف الحقائق جلد دوم صفحہ ۳۰۳

گیا شہ جہاں نامہ لکھ کر کلیم | دل شاعراں رشک سے ہے دونیم
پئے آصف الدولہ میں نے بھی میرؔ | کہے صید نامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ، مشہور ہو | گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو
بہت کچھ کہا ہے کرو میرؔ بس | کہ اللہ بس باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا | خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو | بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

میرؔ کی مدحیہ مثنویاں نہ صرف انسانوں کی مدح تک محدود ہیں بلکہ وہ جانوروں کی تعریف میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان کی کتنی مثنویاں ہیں جن میں انہوں نے کتے، بلی، بندر کے بچے کی تعریف کی ہے اور وہ بھی اس لحاظ سے قابل توجہ ہیں کہ جانوروں کے فضائل حمیدہ کیا ہیں اور ان کو میرؔ نے کس خوبی سے بیان کیا ہے لیکن طوالت کلام کی وجہ سے قلم انداز کی جا رہی ہے۔

اب تک جن مثنویوں کا ذکر ہوا ان میں عشقیہ مثنویاں ہیں جن میں سوز و گداز اور واردات اور نیچرل نمونے تھے۔ یا پھر واقعاتی مثنویاں تھیں جو میرؔ کی ژرف نگاہی، وسعت مطالعہ اور نگاہ جزرس کی آئینہ دار تھیں یا مدحیہ مثنویاں تھیں جن کا اصل مدعا ممدوح کی تعریف ''ستائش کی تمنا''، ''صلہ کی پروا'' سے ہمکنار تھیں ان مثنویوں میں میرؔ کا مخصوص رنگ ''آہ آہ'' ان کی ''واہ واہ'' سے زیادہ نمایاں تھا۔ میرؔ اگرچہ کرب و الم سے بہت قریب ہیں بلکہ سراپا درد ہیں۔ لیکن جو مثنویاں انہوں نے بہاریہ اور طرب انگیز لکھی ہیں وہ بھی اپنے کمال کی حد کو چھو رہی ہیں۔ میرؔ کا ''ساقی نامہ''، ''راجہ بشن سنگھ'' اور ''آصف الدولہ کی شادی''، ''ہولی'' وغیرہ ایسی مثنویاں ہیں جن میں دل گرفتگی کا کہیں شائبہ بھی نہیں آنے دیا ہے بلکہ تمام تر شگفتگی ہر سمت سے ابلی پڑتی ہے اور محفل عیش بجی نظر آتی ہے خصوصاً ''ساقی نامہ'' سے زندگی کا حسین پہلو روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے، انداز بیان ایسا کہ اردو میں فیضی کی ''نل ودمن'' کہیے۔ مثنوی کا پہلا ہی شعر اس غضب کا ہے۔

ہے قابل حمد وہ سر انداز
جو سب سے ہوا ہے جلوہ پرداز

یہ ایک ایسی مثنوی ہے جس میں ''شباب وشعر، بہار ونغمہ، شراب وگل انگڑائیاں لیتے نظر آتے ہیں۔ اس کی زبان آب زلال کی طرح صاف وشیریں اور آب رواں کی طرح نرم رو ہے۔'' بہار کے بیان میں رنگینی اور شگفتگی خود اپنی بہار دکھا رہی ہے۔

ساقی جو کروں میں بے ادائی — معذور رکھ اب بہار آئی
گل باد صبا کے تا کمر ہے — داماں بلند ابر تر ہے
غنچہ کی گلابیاں بھری ہیں — تکلیف کی منتظ دھری ہیں
اطراف چمن کھلا ہے لالہ — ہر پھول شراب کا پیالہ
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی — اٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا — رنگ گل و لالہ زار چمکا
ہر شاخ سے شوخ جام در دست — نرگس سے کسی کی نرگس مست
وہ میوہ خوش رسیدہ بارے — وہ عیش دل گزیدہ بارے
آئینہ حسن خود پسنداں — زینت وہ عنبریں کمنداں
وہ آتش تیز آب آمیز — وہ عربدہ جو و فتنہ انگیز
وہ مقصدِ جاں نا امیداں — وہ رو سہی سفید رویاں

میر کا یہی بہاریہ انداز آصف الدولہ اور راجا بشن سنگھ کی شادی کی مثنوی میں بھی ملتا ہے۔

آ ؤ ساقی کہ بزم عشرت ہے — چشم بدور خوب صحبت ہے
اور مطرب لئے رباب و چنگ — کار ھ منہ سے نوائے سیر آہنگ
شادمانی سے ہو نوا پرداز — اہل محفل میں گوش بر آواز
لا کہاں ہے وہ لالہ رنگ شراب — جس سے مست نظارہ ہوں احباب

اس پری کو نکال شیشے سے   رنگ محفل ڈال شیشے سے

ان اشعار کو پڑھ کر کون کہے گا کہ میر قنوطی تھے۔

ہجویہ مثنویاں

یہ گفتگو گزشتہ اوراق میں آ چکی ہے کہ میر اس میدان کے آدمی نہ تھے۔ ہجو کے لئے جن عناصر کی ضرورت ہے وہ ان میں تھے ہی نہیں۔ شباب یا شگفتہ ماحول کی وجہ سے کچھ نہیں بول لینا اور بات ہے اور فطری شگفتہ مزاجی، ظرافت و بذلہ سنجی اور چیز ہے، یہ میدان سودا ہی کے ہاتھ میں رہا۔ ان کی معمولی مبالغہ آمیزی بھی دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور کذب صریح کے باوجود انساں ہجو کے اصل مقصد کو پالیتا ہے۔ سودا نے ایک ممسک کے گھوڑے کی ہجو میں لکھا ہے کہ گھوڑا ایک مرتبہ ایک نوشہ کو لے کر برات میں گیا تو اس وقت پہنچا جب نوشہ اور دلہن دونوں بڑھاپے کی آخری منزل کو پہنچ چکے تھے۔ ظاہر اس مبالغے کا مقصد یہ ہے کہ کسی ضرورت کے لئے اس گھوڑے کا استعمال اس کی ناتوانی کی وجہ سے جس کی تمام تر ذمہ داری اس کے کنجوس مالک پر ہے، بالکل بے سود ہے کیوں کہ اس کی رفتار کی وجہ سے کام کا وقت نکل جائے گا اور ناکامی ہوگی۔

لیکن میر جب کسی کی ہجو کرتے ہیں تو عموماً یہ ہجو کسی پرخاش کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بے اختیار ہو کر سخت وست پر اتر آتے ہیں اور مزاج کا اعتدال باقی نہیں رہتا۔ خود اپنے ہمچشموں کی ہجو میں اتنا بڑھ گئے ہیں کہ نہ انہیں اپنے منصب کا پاس رہا ہے نہ حریف کی شان و مرتبے کا۔

سودا جیسا ذی علم، فن شاعری کا مانا ہوا استاد، ہر اعتبار سے ذی وجاہت و احترام، خود میر کا معاصر و ہمچشم، معاصرانہ چشمک سے الگ ہو کر، ان کے کمال کا قدرداں۔ لیکن میر صاحب جب ان کی ہجو لکھنے بیٹھے تو ہمچشمی کے تمام حقوق بالائے طاق رکھ کر جس رکاکت پر اتر آئے وہ کسی طرح شایان شان نہ تھا۔ سودا کو کتے پالنے کا شوق تھا، اچھے قسم کے کتے پالتے تھے۔ میر نے ان کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی، اگرچہ اس کا عنوان مبہم

رکھا ''ہجو عاقل نام کسے کہ بہ سگان انسے تمام داشت'' مگر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ ہجو سودا ہی کی ہے کیوں کہ سودا نے اس کا جواب لکھا اور کھل کر میر صاحب کا اس کے عنوان میں نام دیا ہے۔ ''مخمس در جواب میر تقی کہ فی الحقیقت میر شیخ بودہ است'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا روئے سخن سودا کی طرف ہے اور اپنی مثنوی کے عنوان میں نام کی تبدیلی سے جو پردہ انہوں نے ڈالا ہے وہ محض پردہ شبنم ہے۔ میر لکھتے ہیں۔

ایک جو لچر کو رزق کی وسعت جو ہوگئی	تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہوگئی
کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش	چچڑی کی طرح شام سحر کتوں کی تلاش
ٹکڑا ہے جس کے ہاتھ میں یہ اس کا یار ہے	جیسے سگ سرائے سگ ہر سوار ہے
کتے کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا	دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا
رہتا ہے سخت شیفتہ کتوں کے بال کا	پلا یہ کہے تو کسی کتے کے دال کا

یہ ہجو ہے سودا کی؟ وہ بھی میر کے قلم سے!! اس ہجو سے سودا کی کمزوری پر اتنی روشنی نہیں پڑتی جتنی سودا کے تمول سے میر کی جلن، ان کی بد مزاجی اور دنائت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر گر سکتے ہیں۔ وہ ہجو نہیں لکھتے مغلظات بکتے ہیں۔ انہوں نے ایک قطعہ میں ایک خواجہ سرا کی ہجو کی ہے جس کو پڑھ کر شرافت انگشت بدنداں ہے، حیرت ہے ان ہزلیات کو کلیات میں کیسے جگہ دی گئی۔ سعدی نے مطائبات لکھے ہیں اور ان میں بہت کھل کھل کر باتیں کی ہیں لیکن ان میں نصائح ہیں اور اتنی چاشنی بھر دی ہے کہ دامان حسن کے دھبے ایسے ہلکے ہوگئے ہیں کہ ادھر نظر بھی نہیں جاتی۔ میر صاحب کی خواجہ سرا والی ہجو کا آخری شعر کسی شریف انسان کی زبان سے ادا نہیں ہوسکتا۔

سمجھے نہ سمجھے تو مرے......سے
میں تو نظیر اس کی کہی والسلام

اصل یہ ہے کہ میر صاحب کو جنوں ہو چکا تھا۔ اس لئے غصے میں اپنا توازن کھو دیتے لہٰذا ان کے ہجو یہ کلام کے اس ناپاک عنصر کو نظر انداز کر کے وہ خاص باتیں تلاش کرنی پڑیں گی

جو اس حیثیت سے قابل ستائش ہو سکتی ہیں کیوں کہ ہجو کا وہ لطیف انداز ہے جو سامع اور قاری دونوں کے دلوں میں شگفتگی کے ساتھ کسی خاص احساس کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس لئے ایسا لطیف پہلو میرؔ کے ہاں اس وقت پیدا ہو گیا ہے جب کہ انہوں نے خود اپنی ہی زندگی کے کسی خاص پہلو پر پھبتی کی ہے۔ گھر کے حال میں ایسے اشعار بہت ملتے ہیں۔ اس لئے میرؔ کا یہ انداز ان کی خاص ہجوؤں میں سے زیادہ ان کے مختلف کلاموں میں ملتا ہے۔ ہمارا موضوع چونکہ میرؔ کی ''مثنویاں'' ہے اس لئے ان کی ان مثنویوں میں جن میں طیش یا غم و غصہ نہیں، بلکہ صحیح معنوں میں ظرافت کا رنگ غالب ہے، ''مثنوی مرغبازاں'' پیش کی جا سکتی ہے کیونکہ اس میں مرغبازی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس میں ظرافت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ میرؔ صاحب نے اپنے اشعار میں جہاں تلازمہ سے کام لیا ہے وہاں واقعی حسن پیدا کر دیا ہے۔ اسی طرح محاورات و ضرب الامثال جا بجا اس خوبی سے استعمال کئے ہیں کہ اشعار میں ظرافت کی روح پھونک دی ہے اور اس مثنوی کو پڑھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے زوال خوردہ معاشرے پر بھرپور ضرب لگائی ہے۔

اگر چہ اس طرح کی بیہودہ مشاغل سے دہلی بھی خالی نہ تھی لیکن لکھنؤ پہنچنے کے بعد میرؔ کو ان محفلوں میں ضرورتاً شرکت کی نوبت آئی اور بہت قریب سے انہوں نے یہ تماشے دیکھے۔ اس لئے مرغ سے لے کر مرغ باز تک کی ہر حرکت سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کا موقع ملا اور انہوں نے اپنی مثنوی میں ان کو خوب خوب نمایاں کیا۔ ذرا بہادر مرغوں کا وصف ملاحظہ ہو۔

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
پر و پرزا درست یکساں ہے — مرغ تصویر کا بھی حیراں ہے
لات کی گھات گر جو مڑ جائے — نسر طائر کا رنگ اڑ جائے

رؤسائے مرغبازاں کا منظر قابل دید ہے۔

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں — مرغ مارے بغل میں آتے ہیں

پالی کا منظر اور تماشے کا اختتام۔

جمعہ منگل کو پالی کی ہے دھوم گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغبازوں کو ہے قیامت جوش جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے یہ پھڑ کنے لگے ان نے کی نوک یہ کڑ کنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج ساتھ اس کے بدلتے ہیں ج دھج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے ان کی صد رنگ بد زبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھلتے ہیں آپ کو تراتے ہیں لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے منہ میں مرغ کی منقار ایک کے لب پہ نا سزا گفتار
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پر بغل میں دابے مرغ لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

میر ان کا نہ ہووے گو قائل
مرغ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

میرؔ کی مثنویوں میں زمانے کے خدوخال

میرؔ اپنے یوم پیدائش سے روز وفات تک جس ماحول سے دوچار رہے وہاں بجز دردوالم کے راحت وسکون کا نام ونشان نہ تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے آٹھ دس سال بعد میرؔ کی پیدائش ہوئی اور یہی وہ دور ہے جبکہ حکومت مغلیہ کی فصیلوں میں رخنے پڑنے شروع ہوئے اور شاہ عالم کے عہد تک ان کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ آئے دن کی خانہ جنگیاں، حکومتوں کا الٹ پھیر، بادشاہوں کا نصب عزل، پھر ہر ایک کا حشر میرؔ کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ نادری حملے نے جو غارت گری مچائی تھی اور انسانی جانیں جس طرح تہ تیغ ہوئی تھیں ان کی بھیانک داستان زبان زد خاص وعام تھی۔ میرؔ کے کان میں بزرگوں سے سنا ہوا یہ شعر ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ نار کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

ابھی گونج ہی رہا تھا کہ درانی کے مسلسل حملوں نے اور بھی قیامت ڈھائی۔ دہلی بار بار لٹتی اور بستی رہی۔ مگر یہ بساؤ بھی کوئی پائیدار بساؤ نہیں تھا۔ گویا دریا کا طوفان تھا جو رہ رہ کر اٹھتا اور تھم جاتا۔ مرہٹوں کا زور اور ان کی غارتگری، سلاطین و امرا کی آویزش اور رسہ کشی، سپاہ ولشکر کی فاقہ مستی کی وجہ سے نوچ کھسوٹ یہ تمام چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے ملک میں وہ ابتری مچائی تھی کہ ملکی نظام اور خود حکومت و بادشاہی ایک کھلونا بن کر رہ گئی تھی۔ آج ایک بادشاہ دوسروں کی مدد اور چیرہ دستیوں کے بل بوتے کسی بادشاہ کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر

اورنگ حکومت پر جلوہ افروز ہوتا اور کل خود دوسروں کے ہاتھوں اسی بے رحمی کے ساتھ قتل ہوتا یا معزول کر دیا جاتا اور اس کی آنکھوں میں بھی سلائیاں پھیر دی جاتیں۔ اس طرح بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اندھا کرنے کے متعدد تماشے خود میر نے اپنے دور حیات میں دیکھے تھے، جس کی آخری قسط شاہ عالم تھے جن کی آنکھ میں صرف سلائی ہی نہیں پھیری گئی بلکہ غلام قادر روہیلہ نے خنجر کی نوک سے آنکھیں بھی نکال لیں۔ انہیں تماشوں سے متاثر ہو کر عبرتناک انداز میں ان کا دل بول اٹھا۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پاؤں کی
انہیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

یہ محض عبرتناک شعر ہی نہیں ہے بلکہ اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی سچی آنکھوں دیکھی تصویر ہے۔

جب نظام حکومت کی ابتری کا یہ عالم ہو تو پھر عمال حکومت کو بے راہ روی سے کون روک سکتا تھا۔ جو کچھ ان کے دل میں آتا بے روک ٹوک کرتے۔ نہ انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس اور نہ پرہیزگاری کا پاس جو کچھ ان کے دل میں آتا کرتے۔ چوری، رشوت ستانی، ظلم و تعدی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے، ان کا مطمح نظر ذخیرہ اندوزی اور جلب منفعت کے سوا کچھ نہ تھا۔ رحم و کرم اور انسانیت نام کی چیز سے وہ آشنا ہی نہ تھے ان کے استبدادی پنجے میں انسانیت چیخ رہی تھی اور کوئی اس کی داد و فریاد کو پہنچنے والا نہ تھا۔ وہ چند روزہ سلاطین جنہیں چند روز کے لئے اورنگ حکومت پر متمکن ہونے کا موقع ملتا وہ اپنی کمزوری، بے دست و پائی، یا اپنی نا اہلی کے سبب حکومت کے کاموں میں دخل انداز ہونے کی جگہ عیش کوشی ہی میں اپنی سلامتی دیکھتے تھے۔ اس لئے تمام قیمتی اوقات مئے نوشی اور رقص و سرور میں گزارنا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھتے تھے۔ جب خود بادشاہ کا یہ حال ہو، تو رعایا کا کیا پوچھنا۔ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اس میں نہ شہ و کوتوال کی تخصیص تھی نہ قاضی و مفتی کی۔ سب ہی ''پیالہ نوش'' ہو رہے تھے۔

خواجہ حافظ نے بھی اپنے دور کی اسی قسم کی تصویر کشی کی ہے۔ البتہ دونوں کے اسباب میں فرق ہے۔ حافظ نے اس کا سبب ''بادشاہ کی خطا بخشی'' اور ''جرم پوشی'' کو قرار دیا ہے۔

حافظ قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش
در عہد بادشاہ خطا بخش و جرم پوش

مگر یہاں سبب ''خطا کاری'' اور ''عیش کوشی'' تھا، اس لئے شعر میں ذرا ترمیم کرنی ہوگی۔

قاضی قرابہ کش شد و مفتی پیالہ نوش
در عہد بادشاہ خطا کار و عیش کوش

جب ملک میں یوں افراتفری اور لوٹ مچی ہو تو غربا کی پریشانیوں کا کیا پوچھنا ہے۔ نہ مال والے اپنے مال میں خوش تھے اور نہ کھال والے اپنی کھال میں مست۔ سب کو اپنی زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ اہل فن، بڑے بڑے صاحب علم و فضل، دستکار و ہنرمند، اپنے عزیز ترین نگر اجڑے اور لٹے ہوئے وطن (دہلی) کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ جس کو جہاں مقدر لے چلا، چل پڑے۔

دہلی لٹی تو لکھنؤ آباد ہوا۔ ع ''میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی''

آصف الدولہ کا عہد لکھنؤ کا سنہری عہد تھا، دولت کی فراوانی، اس پر آصف الدولہ جیسا سخی حکمراں، فضل و کمال کی قدر کرنے والا۔ خلقت ہر طرف سے ٹوٹی پڑتی تھی۔ ہر سمت سے باکمال کھنچ کھنچ کر لکھنؤ چلے آرہے تھے۔ دولت وہاں اپنے پورے محاسن و معائب کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اگر ایک طرف جود و بخشش کی گرم بازاری تھی، علم و ہنر پرورش پا رہے تھے، تہذیب اپنے ارتقا کی طرف گامزن تھی تو دوسری طرف مرغ بازی، کبوتر بازی جیسے لہو ولعب، جام و مینا کا مشغلہ اور شاہد پرستی کا عملی مذاق بھی عروج پر تھا۔

دہلی کی پامالی کے بعد اہل کمال کے لئے سانس لینے کی گنجائش کہیں تھی تو لکھنؤ ہی تھی اس لئے سب سے پہلے خان آرزو نے ترک وطن کیا اور نواب سعادت علی خاں کے

دربار سے وابستہ ہوگئے۔ پھر مرزا سودا آئے، میر سوز بھی دہلی میں نہ رہ سکے اور وہ بھی چلے آئے، صرف خواجہ میر درد رہ گئے۔ وہ ایک خدا رسیدہ درویش تھے۔ ان کا نظریہ ہی دوسروں سے جدا تھا۔ وہ سمجھتے تھے۔

ازیں مصائب دوراں منال شاداں باش

کہ تیر دوست پہلوئے دوست می آید

اس لئے اپنے گوشۂ عزلت میں قناعت کے ساتھ راضی بہ رضا جمے رہے اور پائے ثبات میں لغزش نہ آنے دی۔

میر جب زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد ایک مدت پر دہلی لوٹے تو عالم ہی دگرگوں تھا۔ روزی کا سہارا کیا ہوتا کہ کوئی ہم مذاق بھی درد کے سوا دوسرا نہیں تھا جس سے دل بہلتا۔ یہاں جب پہلی مرتبہ آئے تھے تو عالم یہ تھا کہ "شعرمی خواندم، عاشقانہ می زیستم، شبہا می گریستم، عشق با خوش قداں می باختم......... بزمے می آراستم خوباں راخواستم، مہمانی می کردم زندگانی می کردم.........."

مگر اب عالم یہ تھا "......... دوست روئے نیامد کہ با و نفس خوش آمدم، مخاطب صحیح نیافتم کہ صحبت دارم ....." اس لئے دہلی میں اب ان کے لئے جسمانی و روحانی دونوں ہی طرح کی اذیتیں جمع ہوگئی تھیں اور یہاں سے فرار کی راہ سوچ ہی رہے تھے کہ قسمت نے یاوری کی۔ لکھنؤ میں سودا کا انتقال ہو چکا تھا۔ آصف الدولہ اگرچہ میر کے شاگرد ہو چکے تھے مگر سودا جیسے بلند فکر و قادر الکلام شاعر سے دربار کا خالی ہونا ان کو پسند نہ آیا۔ ان کی نظر انتخاب میر پر پڑی اور خرچ بھیج کر ان کو دہلی سے لکھنؤ بلایا۔ میر تو دہلی چھوڑنے کے خواہش مند تھے ہی اس غیبی انتظام کو موہبت الٰہی سمجھ کر فوراً روانہ ہوگئے۔ دربار میں پیشی ہوئی۔ مدحیہ قصیدہ بھی پیش کیا اور وظیفہ بھی مقرر ہوگیا۔ چندے سکون کی صورت پیدا ہوئی۔ دہلی کی آبادی و ویرانی دونوں ہی کا تماشا دیکھ چکے تھے۔ اب لکھنؤ کی تمدنی زیورات سے آراستہ اور جگمگاتی ہوئی بستی ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس طرح کا جگمگاتا ہوا پرکیف

ماحول تو ایک وقت میں انہیں دہلی میں بھی مل چکا تھا لیکن دونوں میں بڑا فرق یہ تھا کہ دہلی کی سادگی میں پرکاری تھی جس کو میرؔ ''تہ داری'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر لکھنؤ میں انہیں وہ روحانی کیف نہ مل سکا جو انہیں دہلی میں مل رہا تھا اس لئے دہلی کی یاد ان کے دل سے نہ گئی اور ہمیشہ یہی تمنا رہی کہ کاش دہلی ہی میں رہتے مگر اب ''دہلی دور'' تھی اور لکھنؤ کی خاک میں انہیں پیوند ہونا تھا، اس لئے بقیہ زندگی گاہ شاداں گاہ نالاں وہیں بسر کی۔ میرؔ کا کلام ان کی زندگی اور ان کے ماحول کی سچی تصویر ہے۔

میرؔ کے کلام میں اگر زمانے میں خدوخال کی تلاش کی جائے تو کوئی صنف سخن اس سے خالی نہیں ملے گی۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ایسے مضامین سے بھرا پڑا ہے۔

ہنرمندوں کی ناقدری :

صناع ہیں سب خوار ازانجملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

دہلی کی تباہی یاروں کی نایابی :

دلی میں اب کی آکر ان یاروں کو نہ دیکھا
کچھ دے گئے شتابی کچھ ہم بہ دیر آئے

زمانے کی چیرہ دستی ہر وقت عزت و آبرو اور مال و دولت لٹنے کا خطرہ :

چور، اچکے، سکھ، مرہٹے، شاہ و گدا سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی ایک دولت ہے یہاں

لیکن جہاں عمومی ماحول میں یہ پراگندگی تھی وہاں کبھی کبھی یاراں رنگیں مزاج کو داد عیش دینے کے مواقع بھی ہاتھ آجاتے تھے۔ عشق کی سرمستیاں بھی اپنا رنگ دکھاتی تھیں، رقص و سرود کی محفلیں بھی آراستہ ہوتیں۔ شغل ناونوش بھی ہوتا۔ خوباں ماہ وش سے آنکھیں بھی لڑتیں اور پیمانہ نرگسیں سے مست بھی کر جاتیں۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی گلاب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　　پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے
اب جو نسیم معطر آئی شاید اس کے بال کھلے　　　شہر کی ساری گلیاں ہوگئیں گویا عنبر سارا آج
چشم مشتاق اس لب ورخ سے لحظہ لحظہ اٹھتی نہیں　　　کیا ہی لگے ہے اچھا ان کا مکھڑا پیارا پیارا آج

لیکن اس سلسلے کی واضح مثالیں جن میں شاعرانہ تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ان کے شہر آشوب ہیں یا پھر ان کی مثنویاں بھی ہیں جن میں ماحول کی عکاسی کی گئی ہے اس طرح ان کی واقعاتی مثنویاں زمانے کے خدوخال کو پوری طرح نمایاں کرتی ہیں۔ ہجو یہ مثنویوں سے اگر غصے اور مبالغے کے عناصر نکال دیئے جائیں تو اصل حقیقت تک ذہن کی رسائی ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم پہلے ایک طائرانہ نظر ان کی غزلوں کے بعد ان کے شہر آشوب پر ڈال لینا چاہتے ہیں۔ یوں تو ان کے اکثر و بیشتر اشعار ''شہر آشوب'' کے مضامین سے لبریز ہیں۔ لیکن ہم خصوصیت سے ان نظموں کو لیتے ہیں جن کو انہوں نے خود ''شہر آشوب'' کا عنوان دیا ہے۔ اس طرح کی نظمیں ان کے دیوان میں مخمس کی شکل میں تین عدد ہیں ''مخمس در حال لشکر'' حکومت کا ثبات وقیام لشکر کی درستی و دلجمعی پر ہے اور جب لشکر ہی کا یہ حال ہو کہ نہ تن پر کپڑا اور نہ پیٹ میں روٹی ہو تو پھر ملک میں جو ابتری نہ ہو کم ہے۔ میر اپنے دور کا حال لکھتے ہیں کہ تین تین سال کی تنخواہیں باقی تھیں۔ حالت یہ تھی کہ سپاہی اپنی تلوار اور دیگر اسلحہ جنگ بیچ کر یا گروی رکھ کر زندگی گزار رہے تھے۔ اس زمانے میں بہت زیادہ شعبے تو تھے نہیں جہاں لوگوں کو سرکاری ملازمتیں ملتیں، دست بدست جنگ کا دور تھا اس لے عموماً لوگ فوج میں بھرتی ہونا پسند کرتے، یوں ان کو اپنے شجاعت کے جوہر دکھانے کا موقع بھی ملتا تھا، اور ویسے بھی فوج کو مرفہ حال رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے لوگ عموماً فوجی ملازمت پسند کرتے تھے مگر جب خود فوج کا یہ حال ہو کہ نان شبینہ کی محتاج ہو وہاں کوئی آئے بھی تو کیا پائے؟ میر لکھتے ہیں۔

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش　　　آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آں کہ دیکھی یاں کی طرفہ معاش　　　ہے لب نان پہ سو جگہ پر خاش
نے دم آب ہے نہ چمچۂ آش

جس کسو کو خدا کرے گمراہ	آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ	جس کو دیکھو سو ہے بہ حال تباہ
طرفہ مردم ہوئے ہیں اکٹھے آہ

فوج میں جس کو دیکھوں سو ہے اداس	بھوک میں عقل گم نہیں ہے حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس	چیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں کہ سپاہ

کہاں تک تفصیل میں جایئے۔ خود شاہ عالم کی ناداری ضرب المثل بن گئی تھی جس کا اظہار ایک بھٹیاری کی زبان سے میر نے اس طرح کیا ہے۔ ''ہو گدا جیسے شاہ عالم تم'' شاہی محلوں میں ناداری اور فاقہ مستی نے گھر کر لیا تھا آٹھ آنے بھی کسی میں دینے کی صلاحیت نہ رہ گئی تھی۔ ملازمین میں شاہی ناداری سے تنگ آ کر گستاخی کی حد تک پہنچ جاتے تھے۔

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری	اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری
آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری	فوج رہے گی تو قحط کی ماری
کیوں؟ یہ جس جا رہے ہیں، واں تھا کال

اس شہر آشوب کے بعد ان کی مثنویوں کے بعد ان کی مثنویوں کو دیکھئے۔ یہاں درد والم کی جاں سوزی وجگر کاہی، ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کی رنگارنگی، عیش و عشرت کی بہار، ہولی و نوروز کے جشن، سیر و شکار کا لطف، شاہی و کتخدائی کی بہشت گوش و جانفزا شہنائیوں کے سریلے نغمے بھی سننے میں آئے ہیں۔ اگر کہیں میر صاحب کو کسی سے کچھ رنج پہنچے گا تو ان کا بگڑا ہوا حلیہ بھی لطف دے جاتا ہے۔ قوم کا عمومی مذاق مرغبازی اور بندریا کے ناچ کا تماشا بھی نظر آتا ہے۔ غرض زندگی اور معاشرے کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ شاعری کی گہری اور وسیع نگاہ کہاں تک پہنچ کر دم لیتی ہے۔

میر کے زمانے میں جوانوں کا میانے یا پالکی وغیرہ سے سفر کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہ سواریاں عورتوں یا معذوروں کے لئے تھیں۔ یا اظہار ریاست میں ہوادار وغیرہ سے

سیر وتفریح میں نکلا کرتے تھے۔ پھر انگریز آئے تو ہندوستانیوں کی دیکھا دیکھی کہاروں سے سفر کرنے لگے۔ لیکن عموماً نوجوان گھوڑوں کی سواری پسند کرتے تھے اور جیتے جی چار کے کاندھوں پر جانا پسند نہ تھا۔ لکھنؤ میں میرؔ کو آصف الدولہ کے ساتھ شکار میں جانے کا اتفاق ہوا، میرؔ کو سواری کے لئے میانہ ملا، یہ اس پر روانہ ہوئے۔ راستے میں ایک گاؤں سے گزر ہوا۔ وہاں کے نوجوانوں نے مذاق اڑایا۔ کوئی کہتا ذرا دیکھنا یہ فرنگی چوپالے کی رسم چھوڑتا یہاں کہاں سے آ گیا۔ کوئی کہتا جیتے جی چار کے کاندھوں پر یہ کون سوار ہے؟ کوئی طنز کرتا آج کل تو ہر شخص چار کہار رکھ کر صبح و شام اپنی ریاست کی نمائش کرتا پھرتا ہے۔ یہ سارے آوازے اور پھبتیاں ان کے کانوں میں پہنچتیں اور یہ دل ہی دل میں کٹے جاتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

وہیں بیچ آیا میانہ مرا
کوئی دیکھتا رنج اٹھانا مرا

سواری سے مجھ کو ندامت ہوئی
کہ چاروں طرف سے ملامت ہوئی

لگے کہنے آیا فرنگی کہاں
کہ چوپالے کی رسم چھوڑے ہے یاں

جسے دیکھو چار اس نے رکھ کر کہار
لگا ہونے ہر صبح اس پر سوار

چڑھے چار کے کاندھے جیتے ہی جی
لیا انگل اس سودے میں نفع بھی

اسی شکارنامے سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کس قسم کے شکار کا مذاق تھا۔ عام لوگ اور خصوصاً بادشاہ و امرا بہادرانہ شکار شیر، چیتا، ہاتھی، گینڈا وغیرہ کا شکار زیادہ پسند کرتے تھے۔ جب شکار میں نکلتے تو محض لذت کام و دہن کے خیال سے چرند میں ہرن، گورخر اور پرندوں کا شکار بھی کر لیتے تھے۔ درندوں کا شکار بھالے یا تلوار سے بہادری کی علامت سمجھ کر کیا کرتے تھے۔ میرؔ جیسے مرنجان مرنج شاعر سے کسی شاہنامے کی تو امید ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں آصف الدولہ کا ایک جنگ نامہ لکھا ہے لیکن وہ جنگ بھی آصف الدولہ نے ایسی لڑی تھی کہ لشکر تو بڑے کرّ و فر سے لے کر نکلے، مگر راستے میں ہی رک کر وقت گزاری کرتے رہے۔ جب حالات سازگار نظر آنے لگے تو آخر میں فوج میں شریک

ہو کر صلح کے معاملہ کو بحسن وخوبی انجام دینے میں کامیاب ہوئے۔ اس لئے اس جنگ نامے میں بھی جنگ کا وہ منظر نہیں ملتا جو کسی جنگ کے شایان شان ہو لیکن شاہنامے کی بحر اپنے شکارنامے میں استعمال کر کے زور کلام دکھانے کی کوشش کی ہے۔ شکار کی گرم بازاری کا منظر یوں پیش کرتے ہیں۔

گئے جانور دشت خالی ہوئے — بیاباں جھاڑ گئے تو کہے
نہ چیتل نہ پاڑھا، نہ ارنا نہ شیر — ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر
چکروں کے شیروں کے بھٹ بھٹ گئے — بیابان سے کر گدن ہٹ گئے
نہ فیلوں میں سُدھ بُدھ نہ شیروں میں زور — نہ چیتوں کو جا گہ نہ گوروں کو گور
نہ بوٹی کو چھوڑا نہ باقی ہے جھاڑ — پہاڑوں کو راہوں سے ڈالا اکھاڑ

شاید جنگ کا بخار جو دل میں رہ گیا تھا، ان غریب جانوروں پر نکالا گیا، یہ کوئی شکار ہوا، یا غریب صحرا نشیں، بے قصور جانوروں کا قتل عام؟

میرؔ کی مثنوی ''ننگ نامہ'' بھی اپنے زمانے کے خدوخال پوری طرح پیش کرتی ہے جس کا تفصیلی ذکر باب سوم میں آ چکا ہے۔ جس میں ضمناً شاہ عالم کی مفلسی 'بے بسی' اور برائے نام بادشاہی کا پرلطف انداز میں عبرتناک حال لکھا ہے۔

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم
ہو گدا، جیسے شاہ عالم تم

جب حکومت کمزور ہوتی ہے اور نظام عسکری میں اختلال ہوتا ہے تو ہر طرح کی برائیاں جڑ پکڑ کر خوب برگ و بار نکالتی ہیں۔ چوری، رہزنی، دفتری کاموں میں ابتری، عملوں میں جعل وفریب، رشوت ستانی اور وعدہ خلافی کا مادہ پوری طرح ابھر آتا ہے۔ آج کل جو دھاندلیاں کہ روز روز دفتروں میں نظر آتی ہیں، میرؔ کے دور میں بھی مذکورہ بالا اسباب کی وجہ سے تھیں۔ بلکہ طوائف الملوکی اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے بہت بڑھی چڑھی تھیں، جھوٹے وعدہ کر کے اہل حاجت کو پریشان کرنا جس سے ملنے کی کچھ توقع نہ ہو

نظر انداز کر دینا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ میر اپنی ایک مثنوی ''در مذمت کذب'' میں ان ہی حالات سے متاثر ہو کر سخت گوئی پر اتر آئے ہیں۔

واقعہ یہ تھا کہ ان کی تنخواہ کا پروانہ کسی منشی کے پاس تھا۔ ضرورت یہ تھی کہ افسر اعلیٰ سے دستخط کرا کے ان کے حوالے کر دے اور یہ تاریخ مقررہ پر اپنی تنخواہ بر آمد کر لیں۔ لیکن وہ ان کو مستقل سات ماہ تک دوڑاتا رہا۔ یہ غرض مند، زیادہ اصرار کی ان میں ہمت نہیں۔ ڈر سے افسر اعلیٰ کے پاس بھی نہیں جاتے تھے کہ درباری آداب سے واقف نہیں۔ مبادا کیا بے ادبی ہو جائے اور بندھی امید بھی منقطع ہو جائے اور منشی سے دفتر میں ملاقات ہوتی نہ تھی۔ بارے سات ماہ کے بعد ملاقات ہوئی، بہت تپاک سے ملے اور وعدہ کیا کہ بس اب کام ہو ہی جائے گا اور آپ کی فرد تخطی خود آپ کے پاس بہت جلد پہنچ جائے گی۔ آپ کو اب مزید زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس حکم امتناعی کے بعد اور بھی میر صاحب کی ان کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اس وعدے کو بھی ایک مدت مدید گزر گئی۔ مگر وہی ہنوز روز اوّل۔ آخر عاجز آ کر میر صاحب نے اپنے کسی عزیز کو یاد دہانی کے لئے بھیجا، ان سے بھی جلد دینے کا وعدہ ہوا مگر روز ٹال مٹول ہوتا رہا اور فرد دستخطی نہ ملنے کی وجہ سے میر صاحب اپنی تنخواہ سے محروم رہے۔ آخر کہاں تک ضبط کرتے۔ ایک مثنوی ''در مذمت کذب'' لکھی اور اپنے دل کا غبار نکالا۔ پہلے جھوٹ کی برائیاں لکھی ہیں، پھر اصل مدعا پر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے | شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹھ تو شعار ہوا ساری خلق کا | کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا
اے جھوٹھ تیرے شہر میں تابعیں کبھی | مر جائے کیوں نہ کوئی وے سچ بولیں کبھی

پھر مذکورہ واقعات کی تفصیل ہے۔ جس کا اختتام ان اشعار پر ہوا ہے۔

تب سے وے بھائی جاتے ہیں ہر روز صبح و شام | اب تک تو ملتوی ہے زمانے زدے کا کام
وہ دیکھتے ہیں وعدے کے بھی ہیں بہت قریب | پھر ترک شہر کیجئے گا کہہ کے یا نصیب

برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے وعید　　　　سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

میر نے دو شادیوں کے تہنیت نامے بھی مثنوی میں نظم کئے ہیں جن میں ایک راجہ بشن سنگھ پسر خورد راجہ ناگر کی شادی کے متعلق ہے اور دوسرا نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی کے موقعے پر نظم کیا گیا۔ جس میں شادی کی دھوم دھام اور خاص خاص رسموں کی نشان دہی کی ہے جس سے اس دور کے مخصوص رسم و رواج اور اس اہتمام و اصراف کا پتہ چلتا ہے جس کا عکس ہم آج بھی اپنے دور کی تقریبات میں پا رہے ہیں۔ راجہ بشن سنگھ کی شادی کی مثنوی کے سرنامے میں میر لکھتے ہیں:

"......در بیان کتخدائی بشن سنگھ پسر خورد راجہ ناگرمل کہ بر فقیر قصہا داشتند۔"

اسی مثنوی کے حک و اضافہ اور ترمیم کے ساتھ انہوں نے دوسری مثنوی آصف الدولہ کی تقریب شادی کے موقع پر لکھی جو ایک دوسرے سے بہت ملتی جلتی ہوئی ہے فرق صرف ہندو مسلمان اور ان کی مخصوص رسموں کا ہے۔

ہولی

دنیا کی تقریباً تمام قومیں عید نوروز مناتی ہیں۔ ہندوؤں میں ہولی کی حیثیت بھی نوروز ہی کی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں کی دلدہی اور اظہار یگانگت کے خیال سے ان کے تہواروں میں شرکت ہی نہیں کی بلکہ خود بھی اپنے محلوں میں اس قسم کا انتظام کر دیا اور خود بھی اس میں شریک ہوتے رہے۔ جس کام کا اہتمام شاہی اہتمام سے ہو اس میں کیا کیا تنوع اور حسن نہ ہوگا۔ لکھنؤ تو نظامت و لطافت میں مشہور ہے ہی پھر آصف الدولہ کے عہد زرّیں میں ہولی نے بھی خوب خوب رنگ دکھائے، پانی کی جگہ کیوڑے اور عرق گلاب نے لے لی، عبیر و گلال کے چھینٹے اڑنے لگے۔ مہوشاں پری رخ کی شرکت نے تکلفات کے تمام بند کھول دیئے۔ جوانوں میں ترنگ آئی، بوڑھوں نے بھی پھریری محسوس کی۔ جلسے جمے، رقص و سرود کی محفلیں آراستہ ہوئیں، حاکم و محکوم بے تکلفانہ ایک دوسرے سے بغل گیر

ہوئے۔ مہینہ بھر یہ رنگ رہا۔ خاص اس تقریب میں شرکت کرنے کے لئے آصف الدولہ کی والدہ محترمہ لکھنؤ بلالی جاتیں [1] اس تقریب میں وہ سماں باندھ دیا تھا کہ میر جیسا ترجمان دردو الم، پُرسوز اور محزوں شاعر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ میر جو ہمیشہ عالم عسرت ہی نہیں بلکہ عالم کشاکش میں بھی دہلی کے یاد کو دل سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان محفلوں اور جلسوں نے ایسا دل موہ لیا اور شگفتہ کر دیا کہ لکھنؤ کو دتی پر ترجیح دینے لگے۔

لکھنؤ دتی سے بھی بہتر ہے
کہ کسو دل کی لاگ ادھر ہے

کیا بچے، کیا بوڑھے، کیا جوان، سب ہی ایک حمام میں نظر آتے تھے، جہاں ''ماہوشاں زہرہ جبیں کا جلوہ جاں افروز'' اور بھی قیامت ڈھاتا اور کیف و مستی کی دبی ہوئی چنگاریوں کے لئے ''بادکش'' کا کام کرتا۔ میر ان تماشوں کو دیکھ کر چپ نہ رہ سکے اور بول اٹھے۔

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر
رنگِ صحبت سے عجب ہے خرد و پیر

رنگِ صحبت سے میر بھی پوری طرح متاثر ہوئے۔ وہ پیر ضرور ہو چکے تھے مگر ''پیر فرتوت'' نہیں ہوئے تھے کہ سارے احساس ہی فنا ہو جائیں۔ آخر ان کی زندگی میں بھی ایک منزل ایسی آچکی تھی ''...... شعری خواندم و عشق با خوبرویاں می کردم ....'' اس ہولی کی محفل نے ان کو پوری طرح شگفتہ کر دیا۔ ساقی سے عالم کیف و مستی میں عہد و پیماں ہونے لگے۔

آؤ ساقی قرار ہے باہم — کہ تماشا کناں پھریں خرم
زن رقاص پر نگاہ کریں — کسو سادے سے دل کی راہ کریں
کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ — کسو محبوب کو اٹھا لیں ساتھ
کسو خوش رو کے منہ پہ منہ رکھیں — کنج لب کا کہیں مزہ چکھ لیں
خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی — کسو نازک بدن سے ہم دوشی

---

[1] تاریخ اودھ جلد ۲ صفحہ ۲۷۴

کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست | جائیں گے تھوڑی دور دست بدست
کسو مہوش سے ہوویں گے گلباز | کھینچیں گے ایک دو دم اس کے ناز

اس مثنوی میں آصف الدولہ کے عہد میں محل سے لے کر خس خانے تک، شہر کے کوچہ و بازار سے لب دریا تک کی ہولی کے موقع کی پوری تصویر کشی کی ہے۔ ہولی کے جلسے، سوانگ، ہنسی، مذاق، بھانگ نوشی میں لوگوں کا عالم، ہر ایک پہلو کو اپنی حد تک پوری طرح روشن کیا ہے۔ رنگ پاشی کا منظر پیش کرتے ہیں ؎

چھیڑیاں پھولوں کی دلبروں کے ساتھ | سیکڑوں پھول کی چھڑی ہے ہاتھ
قمقمے جو گلال کے مارے | مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں | گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں
جشن نوروز ہند ہولی ہے | راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

میر کی مثنویاں جن میں انہوں نے زندگی کی داستان سرائی کی ہے اور جن کو آپ بیتی کا مقام حاصل ہے وہ بھی جگ بیتی ہیں۔ کیونکہ ایک میر ہی نہیں تنہا "پراگندہ روزی پراگندہ دل" تھے بلکہ اس منزل میں ان کے اور بھی شریک تھے، جن کو زمانے کے سنگین ہاتھوں نے اپنے چنگل میں جکڑ رکھا تھا اور خواری و ناداری کی مصیبت میں مبتلا تھے ؎

صناع ہیں خوار ازآں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

میر کی زبان

اس موضوع پر مختلف مقالہ نگاروں اور مصنفین نے خامہ فرسائی کی ہے۔ لیکن ان کی تمام تر توجہ لغات اور ذخیرۂ الفاظ کی طرف رہی ہے، جن میں ان الفاظ کا ذخیرہ پیش کیا گیا ہے جواب متروکات میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن عہد میر میں ان کا بے تکلف استعمال عوام و خواص میں ہوتا تھا یا قواعد کی ان تبدیلیوں سے گفتگو کی گئی ہے جو عہد میر میں پسندیدہ اور مستعمل تھیں مگر اب بالکل متروک بلکہ خلاف فصاحت سمجھی جاتی ہیں۔

مگر ''زبانِ میر'' سے میری مراد صرف وہ ذخیرۂ الفاظ یا محاورات ہی نہیں ہیں جو میر کے عہد میں رائج تھے بلکہ زبان اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ کس منزل میں تھی اور خاص اس خطے کی زبان جہاں میر کی پیدائش ہوئی اور جہاں میر نے نشونما پائی کیا تھی اور ملک کے دوسرے حصے، جہاں الگ الگ مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں، انہوں نے شمالی ہند، خصوصاً دہلی، کی زبان پر کیا اثر ڈالا اور کس قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

شاعری یا نثر نگاری خواہ کسی زبان میں کی جائے اس زبان کے ساتھ ساتھ شاعر یا مصنف کی ایک اپنی زبان بھی ہوتی ہے جس کو ہم انداز بیان بھی کہتے ہیں اور کسی شاعر کا کلام سننے کے ساتھ ہی بول اٹھتے ہیں کہ فلاں کی زبان صاف جھلک رہی ہے۔ ہماری مراد یہاں پر انھیں دونوں رویوں سے ہے یعنی وہ ملکی زبان جس میں شاعری کی گئی اور وہ انداز بیان جو شاعر نے اختیار کیا اور وہ محاسن جو کسی زبان کے ادب میں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے اس موضوع کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (الف) میر کی اردو زبان (ب) خود میر کا

انداز بیان اور اس کی خوبیاں یا خامیاں۔

عہد میر کی اردو زبان

میر کے عہد تک اگرچہ اردو زبان ارتقا کی اس منزل تک نہیں پہنچی تھی جہاں زبان اپنے تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا بے تکلف اظہار کرتی ہے لیکن شعر و شاعری کے عام مذاق نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا کہ یہ پوری طرح علمی زبان نہ بن سکی۔ صفدر آہ لکھتے ہیں:

''اشعار میر[1] میں زبان کی دلکشی میر کی اس حیرت ناک ذاتی صلاحیت کی وجہ سے ہے جو تاریخ ادب میں شاذ و نادر ادیبوں کو ملتی ہے۔ حقیقۃً میر کے عہد تک زبان بے حد ناہموار اور غیر متوازن تھی۔ ہندی اور فارسی کی قند تا محلول کے روڑے ظرف زبان میں صاف الگ الگ نظر آرہے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر دہلی کے خوش مذاق عوام شکر شیراز کو جمنا جل میں گھولنے کی کوشش کر رہے تھے کہ نادری حملے نے دہلی کو ہلا دیا......''

ہنگامہ آرائی اور بے اطمینانی کا دور کسی علم و فن یا ہنرمندی کی ترقی کا دور نہیں ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ دہلی میں زبان کا ارتقا رک گیا اور یہ سعادت لکھنؤ کو آصف الدولہ کے ہاتھوں نصیب ہوئی۔ کہ دس پندرہ سال کی مدت میں اردو زبان نے وہ صفائی، سلاست اور رنگ کا روپ نکالے کہ صدیوں سے بولی جانے والی ہندوستانی زبانیں اس کے سامنے شرمندہ ہوگئیں۔

ہندی زبانیں کیا تھیں؟ اس کی حقیقت خسرو کی زبان سے سنئے اس لئے کہ امیر خسرو کو باوا آدم مانا جا چکا ہے۔ اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' میں اس کی فہرست یوں رقم فرماتے ہیں:

سندی و لاہوری و کشمیر و گبر — دھور سمندر و تلنگی و گجر
معبری گوری و بنگال و اود — دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد

---

[1] میر و میریات صفحہ ۲۱۴

این ہمہ ہندویست زایام کہن　　　عامہ بر کارست　ہر گونہ سخن

امیر خسرؔو کی اس فہرست میں برعظیم ہندوستان کے ہر خطہ کی زبان کا ذکر ہے جن کو ہندوی کا نام دیا گیا ہے، ان میں ایک زبان دہلوی ہے، جو دہلی اور نواح دہلی کی زبان تھی جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور اسی کا نام امتداد زمانہ کے بعد اردو ہو گیا۔

اس زبان کی خاص خاص خصوصیتیں کیا ہیں۔ اس سے پہلے ہندوستان کی قدیم ترین زبان سنسکرت پر ایک نگاہ ڈال لینی ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی قدیم ترین علمی، ادبی اور مقدس مذہبی زبان ہے۔ صدیوں اس ملک پر ہر طرح کی حکمرانی رہی۔ علمی، اخلاقی، ادبی، مذہبی، سماجی ہر طرح کا فیض پہنچاتی رہی۔ اس ملک میں اس کی یونیورسیٹیاں قائم تھیں جن میں بیرون ہند چین و جاپان کے صدہا طلبہ تعلیم پاتے تھے جن کی مجموعی تعداد کئی ہزار تک پہنچ جاتی تھی جس کے آثار قدیمہ ہم کو نالندہ کے کھنڈرات میں آج بھی نظر آرہے ہیں۔ لیکن اتنی ترقیوں کے باوجود ہندوستان کی سرزمین میں یہ اپنی بعض صوتی دشواریوں کی وجہ سے اپنے صحیح لب ولہجہ کے ساتھ قائم نہ رہ سکی اور اس کے الفاظ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ''تت سم'' اور ''تدبھو''۔ رفتہ رفتہ اس زبان کا حشر یہ ہو گیا کہ مذہبی زبان کی حیثیت سے ایک محدود مذہبی حلقہ میں سمٹ کر رہ گئی اور امتداد زمانہ سے عمومی تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور مُردہ زبانوں میں شمار ہونے لگی اور اس کی جگہ خود اسی زبان میں تغیر و تبدل پیدا کر کے دوسری زبانیں ہندوستان میں عالم وجود میں آگئیں اور سنسکرت گویا معدوم ہو گئی۔

اس زبان کے مخصوص الفاظ جن میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا اور اب بھی اپنے قدیم املا اور لفظ کے ساتھ موجود ہیں ''تت سم'' کہے جاتے ہیں۔ چونکہ ان میں اکثر الفاظ اپنی صوتی خصوصیات کی وجہ سے ہندوستانی عوام کے لب و لہجہ سے ہم آہنگ نہ ہو سکے اس لئے ملک کے عوام نے خود اس میں تبدیلی پیدا کر لی اور ادیبوں نے اس کو نکھار کر ایک مستقل لفظ بنا دیا مثلاً ''راتری'' سے ''رات'' اور ''اکشی'' سے ''آنکھ'' وغیرہ۔ ان الفاظ کو ''تدبھو'' کہتے ہیں اور یہی وہ الفاظ ہیں جو کثرت سے روزمرہ میں، خواہ وہ فارسی رسم الخط

میں لکھے جائیں خواہ دیوناگری میں، استعمال ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری نے اپنے مضمون ''زبان میر کی خصوصیات'' میں ایک طویل فہرست ''تدبھو''[1] کی دی ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے چند ایک ہم بھی یہاں نقل کئے دیتے ہیں تاکہ قارئین کو خود اندازہ ہو جائے کہ ''تت سم'' کی کتنی گنجائش ہمارے لب ولہجہ میں ہے اور ''تدبھو'' کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

سنسکرت کے ''تت سم'' اور ''تدبھو''

تت سم	تدبھو	تت سم	تدبھو
اکشی	آنکھ	ستیہ	سچ
تت سم	تدبھو	تت سم	تدبھو
پرشویدن	پسینہ	وارتا	بات

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ''تت سم'' کے جتنے بھی الفاظ ہیں وہ سب ہمارے تلفظ سے بیگانہ ہیں بلکہ ان میں بھی بہت الفاظ ایسے ہیں جن میں نرمی اور گھلاوٹ ہے جیسے پریم، روپ، سمے وغیرہ۔ ایسے الفاظ میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی اور وہ زبانوں پر اسی طرح چڑھے رہے اور آج بھی استعمال ہوتے ہیں۔

اس طرح اردو زبان میں الفاظ کا وہی ذخیرہ ہے جو شمالی ہند کی عوامی زبان کا برسوں جمع کردہ اور نک سک سے درست کیا ہوا حسین سرمایہ تھا، قواعد جس کو زبان کی ریڑھ کی ہڈی کہتے ہیں وہ بھی بالکل وہی ہے جو ہندی زبان میں مروج ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اردو میں عربی، فارسی اور ترکی کے وہ الفاظ کثرت سے دخیل ہو گئے ہیں، جن میں معنی کی وسعت یا کوئی دوسرا حسن تھا۔ علاوہ ازیں فارسی کی خاص ترکیبیں ایک محدود حد تک لے لی گئی ہیں۔

یہ بات تو پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ میرؔ کے عہد تک اردو اس معیار پر نہیں پہنچی تھی جہاں آج ہے۔ نہ وہ معیار ہی اس کو حاصل ہوا تھا۔ جو معیار اس کو ناسخ کے دور میں حاصل ہوا۔

---

[1] علی گڈھ میگزین دہلی نمبر

لیکن جو مقام اسے مل چکا تھا اور اس دور میں شعرا اور ادبا اس کو قابل احترام سمجھ رہے تھے ان کی خصوصیات کیا تھیں؟

(۱) عربی اور فارسی کے الفاظ عوامی لب ولہجہ صحیح طور پر مستعمل نہ تھے، جیسا آج بھی ہمارے دور میں ہے لیکن اس دور کے شعرا اور ادبا اُن الفاظ کے استعمال کو غیر مستحسن نہیں سمجھتے تھے اور عندالضرورت بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ اگر چہ وہ آج ہمارے لئے بار گوش ہیں۔ لیکن اس وقت وہ غیر فصیح نہ سمجھے جاتے تھے۔ جیسے :

دستخط، دسخط۔ مسجد، مسیت۔ تسبیح، تسمی۔ دیوانہ، دوانہ۔ بیچارہ، بچارہ وغیرہ۔

(۲) ہندی اور فارسی الفاظ کے درمیان ''واؤ'' عاطفہ کا استعمال جائز تھا:

ع بہتیری باتیں ہوتی ہیں اخلاص و پیار میں

ع وہ جگر سوختہ و سینہ جلا میں ہی ہوں

(۳) عربی و فارسی الفاظ کی ''جمع الجمع'' اردو یا ہندی قواعد کے اصول پر 'واؤ نون' کے ساتھ بنا لیتے تھے۔ جیسے : طیوروں، اشرافوں، اکابروں وغیرہ جواب متروک ہے۔ لیکن خاص خاص حالتوں میں مخصوص الفاظ کے ساتھ جائز ہے۔ مثلاً جمع کے وہ الفاظ جو ہماری زبان میں واحد کے مقابلے میں کسی وجہ سے استعمال ہونے لگے ہیں۔ لفظ اولیاء جو 'ولی' کی جمع ہے مگر اس کا استعمال واحد کے مقابلے میں ہونے لگا ہے۔ ہم یوں بول جاتے ہیں ''آپ تو اولیا نظر آتے ہیں'' یا حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کا لقب اولیا ہو گیا ہے۔ 'اولاد' ولد کی جمع ہے، لیکن اردو میں واحد کے مقابلے میں مستعمل ہے۔ ''آپ کی کیا صرف ایک ہی اولاد ہے؟'' اس نہج کی جو عربی جمع کے الفاظ ہیں ان کو بہ قاعدۂ ہندی 'واو نون' یا 'ی نون' کے ساتھ جمع بنا سکتے ہیں۔ اولادیں، اولادوں، اولیاؤں وغیرہ استعمال کرنا روا ہے۔ لیکن جو جمع کے الفاظ اردو میں بھی جمع ہی کے مقابلے میں استعمال ہوتے ہیں ان کی جمع الجمع بنانی درست نہیں ہے۔ احبابوں کہنا درست نہ ہوگا۔

(۴) اردو زبان کے قواعد بھی اگر چہ برج بھاشا ہی کے قواعد کے مماثل تھے۔ مگر

اودھی زبان بھی اثر انداز ہوئی۔

اُردو یا (کھڑی بولی)	اودھی	برج بھاشا
ہم نے سمجھا	ہم سمجھیں	ہم نے سمجھو

اس اودھی میں اردو نے اس طرح ترمیم کی:

ع سمجھے تھے، ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی

علامتِ فاعلی کو حذف کر دینا، اودھی کے علاوہ یہ اصول دکنی زبانوں میں بھی رائج ہے۔ مراٹھی، گجراتی جو دکنی زبانوں کی معاون ہیں اس اصول پر کار بند ہیں:

ع اس دل کی مملوکت کو اب ہم خراب دیکھا

(۵) تئیں "سے" یا "لئے" کے معنی ہیں۔ یہ لفظ اگر چہ متروک ہو چکا ہے مگر معدوم نہیں ہوا ہے۔ اس کی اصل اودھی زبان کی "تے" ہے جو "سے" کے معنی میں بولا جاتا ہے، علامت مفعولی کی جگہ بھی استعمال کرتے ہیں۔

ع "کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں"

(۶) "کبھو" "کسو" کبھی اور کسی کی جگہ پر:

ع ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا

کھو کی جگہ کنھوں مستعمل تھی:

ع بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا

"کوئی" کا استعمال بھی "کسی" کے معنی میں ہوتا تھا:

ع میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

نیز "ایکوں" بھی "کسی" کے معنی میں بولتے تھے:

ع "ایکوں کی عید ایکوں کے گھر میں دہا ہوا

(۷) لیجئے، دیجئے کی طرح ہوجئے، دجئے کا استعمال بھی درست تھا:

ع "یا تو رہے بیگانے ہوجئے یا نا آشنا

یا ''ی'' کی تخفیف کے ساتھ لجئے، دجئے۔

(۸) پوچھنا کی جگہ پوچھیو :

ع بہت پوچھیو تم مری اور سے

''کرتا ہے'' کی جگہ ''کرے ہے گا'':

ع گل بار کرے ہے گا سامانِ سفر شاید

''پوچھتے ہو کی جگہ ''پوچھو ہو''

ع کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

(۹) اس کے علاوہ بہت الفاظ جن میں صیقل ہو کر صفائی آ بھی چکی تھی لیکن عندالضرورت اپنی اصلی شکل میں بھی استعمال جائز تھے:

کیدھر۔ کدھر، کیونکہ۔ کیونکر، لاگا۔ لگا، جاگہ۔ جگہ، لوہو۔ لہو، جد۔ جب جد ہی۔ جب ہی، کدھی۔ کبھی، تد۔ تب، اودھر۔ ادھر، پتھرے۔ پتھر، ماٹی۔ مٹی، کسو۔ کسی، جھونٹھ۔ جھوٹ، اونٹھ۔ اونٹ، بھیکھ۔ بھیک، انہوں کا۔ ان کا، کہو ہو۔ کہتے ہو، جنھوں کا۔ جن کا، کنھوں کا۔ کن کا، ہم جانا۔ ہم نے جانا ہوا، اس جہاں سیاہ۔ ہوا یہ جہاں سیاہ۔

(۱۰) فعل حال کے صیغوں میں : آتے جاتے، کھاتے کی جگہ آوے، جاوے کھاوے بولتے تھے۔

(۱۱) آ کر کی جگہ ''ی'' کے اضافہ کے ساتھ آئے کر، جائے کر بولتے تھے۔

(۱۲) علامت اضافت حذف کر دیتے۔ ''پالکی آگے'' یعنی ''پالکی کے آگے'' ''دوش اوپر''، ''دوش کے اوپر''، ''طویلے بیچ''، ''دال ساتھ'' بولا کرتے تھے۔ ''ایک تبسم فرصت ہے'' یعنی ایک تبسم کی فرصت ہے۔

(۱۳) برنگ، بساں، نمط، جوں، مثل یا مانند کی جگہ بولتے تھے۔

(۱۴) ہندی اور فارسی الفاظ کی ترکیب اضافی جائز تھی۔ ''پوشش چھینٹ''،

''صاحب آرتی'' وغیرہ ترکیبیں بے تکلف استعمال ہوتی تھیں۔

(۱۵) ''ا'' اور ''نوں'' کا اضافہ ہندی الفاظ کی جمع بنانے میں:

جمع مؤنث کے صیغے میں:

ع بار ہا وعدوں کی راتیں آئیاں

اسمائے صفات میں:

ع دل لے گئیں یہ باتیں تری پیاری پیاریاں

ضمائر میں:

ع مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ندا اور حروف مغیرہ کی صورت میں جیسے: اے ہمسفراں، بتاں کا عشق، آوارگاں کو، بلبلاں نے وغیرہ۔

(۱۶) تذکیر و تانیث میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو آج کے بالکل برعکس ہیں۔ دید، سیر، گلگشت، جاں، گشت، خلش کو مذکر بولتے تھے اور مزار، نشتر، خواب، گلزار، تغلط وغیرہ مؤنث تھے۔

(۱۷) فعل ماضی کے جملہ افعال کی جمع کی شکلیں:

ماضی مطلق، جمع غائب ـــــ کیا شکلیں خواب میں ملائیاں ہیں۔

ماضی بعید، جمع غائب ـــــ چہرے پر پرچھائیاں آئیاں تھیں۔

ماضی ناتمام، جمع غائب ـــــ وہ آنکھیں مارتیاں تھیں۔

ماضی احتمالی، جمع غائب ـــــ وہ آتیاں ہوں گی۔

ماضی تمنائی، جمع غائب ـــــ کاش وہ آتیاں۔

افعال و اسماء کے جمع کی یہ ساری شکلیں بقرینہ غالب دکنی ریختے کے ساتھ شمالی ہند میں آئی ہیں، ان میں بعض صورتیں دکن میں اب بھی رائج ہیں۔ شمالی ہند میں امیر خسروؒ بوعلی شاہ قلندرؒ، فرید الدین گنج شکرؒ کی زبان کے جو نمونے موجود ہیں، ان میں یہ صورتیں بالکل

نہیں ملتی ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ پنجاب کا اثر ہے مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو تو متقدمین کی زبان کے نمونے میں بھی ایسی کچھ مثال ملتی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دکنی ریختے کے ساتھ شمالی ہند میں یہ طریقہ رائج ہوا ہے۔[1]

عہد میر کی زبان ناپختگی کی اس منزل میں تھی کہ اس کا گمان بھی مشکل تھا کہ تھوڑی مدت کے بعد یہ دنیا کی ارتقا پذیر زبانوں سے ہمسری کا دعویٰ کر سکے گی۔ یہ محض میر اور ان کے معاصر اساتذہ کا فیض ہے کہ یہ خودرو پودا اتنے برگ و بار لایا۔ خصوصیت سے میر کی طبع رسا نے اس میں ایسی صنعت کاری کی کہ اپنی بے بضاعتی اور بے کیفی کے باوجود، اُن صناعیوں کی وجہ سے اس میں شیرینی، کیف اور دل گیری پیدا ہو گئی۔ اس لئے ایک نظر ہمیں اس طرف بھی ڈالنی چاہئے کہ میر نے ان ناتراشیدہ جواہر کو اپنی صناعی سے کس طرح نگینہ بنا دیا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میر کے بعد بہتیرے الفاظ ادبی زبان سے نکال باہر کر دیئے گئے اور ان کی جگہ نرم و نازک اور تراشیدہ الفاظ لائے گئے۔ لیکن جن کو نکال باہر کیا گیا، وہ جلاوطن نہیں ہوئے اور اُردو دنیا کی عوامی بولی میں مختلف الفاظ ملک کے مختلف حصوں میں اب بھی موجود ہیں اور بے تکاں بولے جاتے ہیں جس کا بہت بڑا نمونہ ہم کو خود بہار کی عوامی بول چال میں ملتا ہے۔ ''کون کہے ہے''، ''تم خود کہیو'' وغیرہ۔ اسی طرح تیئں، دیکھوں، ہوں وغیرہ یوپی کے قصبات میں موجود ہے۔

زبان کی شستگی کا سب سے پہلا زینہ الفاظ کی فصاحت ہے۔ میر کی نگاہ سب سے پہلے الفاظ کی فصاحت کی طرف جاتی ہے اور ہمیشہ وہ ''چرب شیریں'' الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس کے تجسس میں بھی رہتے ہیں۔ اور کچھ ان میں فطری صلاحیتیں بھی تھی کہ مختلف زبانوں سے مناسب الفاظ، جو موقع کے حسب حال ہوں، چُن کر اپنے کلام میں نگینہ کی طرح جڑ لیں۔ وہ اُردو، فارسی، عربی اور ہندی سے چُن چُن کر الفاظ نکالتے اور اس کو استعمال کرتے۔

---

[1] از میر و میریات

الفاظ کے انتخاب میں دو معیار مدنظر رہتا تھا ـــــ (الف) معنویت (ب) موسیقیت

معنویت

ایسا وسیع المعنی لفظ جو چند الفاظ کے استعمال کی ضرورت باقی نہ رکھے بس ایک لفظ کا استعمال بہتیرے الفاظ کی معنوی کیفیات پر حاوی ہو۔ میرؔ کا ایک شعر ہے ؎

مجلسوں میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع، کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

یہ مضمون میر دردؔ کے یہاں بھی بندھا ہے ؎

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

دردؔ کا یہ شعر بھی میرؔ کے شعر کی طرح بہت لا جواب ہے اور جملہ شاعرانہ خصوصیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ شعلۂ حسن کی بے پناہ جلوہ گری نے شمع کو ماند کر دیا ہے۔ چہرے سے ندامت و مایوسی کا ظہار ہو رہا ہے، شدت حسن کا بھرپور مظاہرہ ہے، مبالغے کی خوبیاں بھی موجود ہیں۔ مگر میرؔ کے شعر کی وہ کیفیت کہاں کہ ایک تجلّی میں سب آپے سے گزر گئے۔ کیا شمع، کیا پتنگ، سب بے حضور، یہ سب ایک پرتو میں ہو گیا۔

''پرتوے'' کا استعمال یہاں اتنا جچا تُلا ہوا ہے کہ جس کے بعد نہ کسی اضافت کی ضرورت رہی نہ کسی تفصیل کی۔ ''پرتوے'' میں پورا سراپا، زُلف و رُخ، خد و خال، قد و قامت اپنی تمام تر رعنائیوں اور جلوہ سامانی کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن درد کے شعر کا جوش اور ولولہ انگیز تاثر، جو دل کو جلوۂ محبوب کی طرف کھینچ رہا ہے اور قاری کی آنکھ چمک عالمِ تصور میں محسوس کر رہی ہے وہ میرؔ کی قنوطی بے حضوری میں معدوم ہے۔

مرادف الفاظ میں موقعے کا لفظ منتخب کرنا بھی میرؔ کا خاص اصول ہے ؎

ہر خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

اس شعر میں فلک کا لفظ آ سکتا تھا۔ لیکن فلک ایک بدنام لفظ ہے جس کے ساتھ جور و ستم کا تصور نمایاں ہے۔ یہاں عظمت و شفقت اور اظہار شرافت کی ضرورت تھی اس لئے ''سپہر'' کا لفظ ہی مناسب ہے[1]۔

موسیقیت

متناسب الفاظ کے ملنے سے کلام میں ہمواری اور ترنم پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے تمام فارسی، اردو کے اساتذہ کی نگاہ شعر کی خوش نمائی کے لئے مترنم بحروں کو تلاش کرتی رہی ہے۔ میؔر ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے، گیتوں کے رسیلے نغمے ان کے کانوں میں گھلے ہوئے تھے، وہ اپنی شاعری میں بھی وہی لحن لحن و نغمگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ آواز کی متوازن تکرار ایک صوتی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ موسیقی انھیں آوازوں کی متوازن ترتیب، اتار چڑھاؤ اور زیر و بم کا نام ہے۔ لحن کی تاثیر الفاظ کی پابند نہیں ہے، لیکن اسی لحن کو اگر الفاظ کی تاثیر سے دوآتشہ کر دیا جائے تو اس کی تاثیر کا کیا کہنا۔ میؔر نے طویل بحروں میں نظم لکھ کر جذبہ و نغمہ کو ایک دوسرے کا ہم آہنگ بنا کر شاعری اور اردو زبان کو بہت پر کیف بنا دیا ہے۔ اگر چہ دو سو برس کے بعد بھی اقبال یہ بتا رہے ہیں کہ ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ سوزِ دلِ پروانہ ہے

لیکن میؔر نے اسی الجھی زلف کو اس حد تک سنوار دیا کہ پریشانی و برہمی میں ایک عالم پیدا ہو گیا۔ ان کی پرانی اور متروک اردو میں وہ بناؤ ہے کہ آج بھی ہم اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور کیف محسوس کرتے ہیں۔

انھوں نے جو مترنم بحریں استعمال کی ہیں وہ صرف نغمے ہی کو نمایاں نہیں کرتی ہیں بلکہ اس کیفیت کا اظہار بھی کرتی ہیں جس کیفیت کے عالم میں ڈوب کر شاعر نے اپنے جذبات رقم کئے ہیں۔ بعض میں درد اشتیاق کی کیفیت ہے، کہیں حسرت و تمنا کا اظہار ہے، کہیں

---

[1] نقد میر

عشق و جوانی کی وہ باتیں ہیں جن کے متعلق سعدیؔ کا یہ جملہ ہی کافی ہے۔ ''در عالم جوانی آنچہ افتد چنانکہ دانی۔'' بڑی بحروں سے نمونۂ چند اشعار لکھے جاتے ہیں:

جو جو ظلم کئے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں

جھکی کچھ کہ جی میں چبھی کبھی ہلی تک کہ دل میں کھپی کبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اس کی ہے نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

اظہار حسن کے لئے تنگ پوشی کا مذاق عہد قدیم سے چلا آتا ہے۔ کہیں قبا تنگ ہوتی اور کلاہ کج اور کہیں چولی پھنستی اور موباف کھلتا۔ کسی لکھنوی شاعر نے کہا ہے۔

نمو کی فصل جوانی کی آمد آمد ہے
کہ جا بجا سے مسکنے لگی قبا ان کی

موباف کھل گیا ہے کسی گلعذار کا
آنچل لٹک رہا ہے عروسِ بہار کا

میرؔ صاحب لکھنؤ میں رہے۔ پھر اپنے معاصرین کا ساتھ کیوں نہ دیتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

چھلے ہیں مونڈھے، پھٹی ہے مہری، چسی ہے چولی پھنسی ہے مہری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی، ہمارا جی تو بتنگ آیا

لیکن جب اپنے مخصوص انداز میں آتے ہیں تو یوں کہتے ہیں۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھا تو کہے ہے کیا
جسے میر کہتے ہیں صاحبو! یہ وہی تو خانہ خراب ہے

میر نے جو چھوٹی بحریں اختیار کی ہیں اس میں شدت جذبات کا رنگ نمایاں ہے۔ انداز بیان ہی سے شاعر کی قلبی کیفیات نمایاں ہو جاتی ہے ۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے — ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر — جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

انداز بیان ہی دوستانہ گلہ بندی، نیازمندانہ شکایت اور شکست امید کا اظہار کر رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں میر کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

الفاظ کی نشست ہی جذبے کی شدت کو ظاہر کرتی ہے۔

میر اور میر کے معاصرین نے ایہام گوئی سے اجتناب کیا۔ اگر چہ ایہام بلاغت کی بڑی حسین صنعت ہے بشرطیکہ شعرا کو ابہام کی منزل میں نہ پہنچا دے، بسا اوقات شعر اس صنعت سے بہت بلند و لطیف ہو جاتا ہے۔ لیکن جملہ جذبات کی ادائیگی اس صنعت میں مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس لئے وہ شعرا جو وفور جذبات سے مغلوب تھے، ان کو یہ روش پسند نہ آئی۔ مظہر جان جاناں، میر درد، سودا اور میر جیسے شعرا نے یہ روش چھوڑ دی اور سادگی و پرکاری سے جذبات کے اظہار پر توجہ دی۔ جس مضمون کو باندھا اس میں تاثیر اور اثر انگیزی بھر دی۔ جس سے اشعار دل میں کھبنے لگے۔ دماغی تفریح کی جگہ دل آباد ہونے لگے۔ انہوں نے ویرانی دل کا مضمون باندھا اور اس ویرانے میں احساسات کی ایک دنیا بسا دی۔ خود میر کہتے ہیں ۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہے کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

ترک ایہام کے بعد جو پسند کی گئی وہ میرؔ کی اصطلاح میں "انداز" ہے۔ میرؔ نے اپنے تذکرۂ شعرا میں جو 'نکات الشعرا' کے نام سے منسوب ہے، شاعری کے لوازم میں لکھتے ہیں:

"ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں ہمہ صفت ہا است۔
تجنیس، ترصیع، تشبیہہ، صفائی، گفتگو، فصاحت و بلاغت، ادا بندی،
خیال وغیرہ ایں ہمہ درضمن ہمیں است وفقیر ہم ازیں وتیرہ محظوظم۔"[۱]

اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ "انداز" سے میرؔ کی مراد شاعری کے جملہ داخلی و خارجی محاسن ہیں۔ وہ کسی ایک صنعت میں شاعری کو محدود کرنا نہیں چاہتے، وہ افکار و جذبات کی وسعت کو تنگ کرنا نہیں چاہتے۔ اس لئے ہر صنف سخن کو اپنا کر ان تمام تاثرات و تجربات مؤثر بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جو فطرت انسانی کو اپیل کرتے ہیں۔ انہوں نے زبان کی ناہمواری کے باوجود اسی زبان کو اپنی فطری صلاحیتوں سے ہموار کر کے علمی، ادبی، اخلاقی، سماجی ہر طرح کے مضامین سے مالا مال کر دیا اور اسی ناپختہ مضامین کو اپنے افکار عالیہ اور خوش سلیقگی سے اتنا بلند کر دیا کہ ہر سمت سے صدائے تحسین و آفریں بلند ہوئی اور جس سے اس نے یہی سمجھا کہ یہ میری اپنی ہی بات ہے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

میرؔ کو خود بھی اس کا احساس تھا، چنانچہ اس مضمون کثیر در کثیر اشعار ان کے دیوان میں موجود ہیں۔

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا اس کا ہے
معتقد کون نہیں میرؔ کی استادی کا

نہ رکھوں گا نظمِ شاعراں حال پر اپنے
چلو ٹک میرؔ کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

۱؎ نکات الشعرا صفحہ ۱۸۷

کس نے سن شعرِ میرؔ یہ نہ کہا
کہیو پھر "ہائے کیا کہا صاحب"

میرؔ صاحب جب تک دہلی میں رہے گلی گلی میں ان کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ تمام خواص و عوام ان کا کلام سننے کے سخت مشتاق رہا کرتے تھے چنانچہ اپنے قطعہ میں کہتے ہیں:

یہ میر ستم کشتہ کسی وقت جواں تھا	اندازِ سخن کا ، سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پری پرچۂ ابیات تھا اس کا	منہ تکتے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا	ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک	آندھی تھا بلا تھا کوئی آشوب جہاں تھا

میرؔ کو اس پر بھی ناز ہے کہ میرا کلام تمام ہند میں شہرۂ آفاق ہے۔ خاص کر دکن میں جو اس وقت مرکز شعر و سخن ہو رہا تھا، میرا کلام وہاں بھی پہنچا ہوا ہے اور اہل سخن کو محظوظ کر رہا ہے۔

کچھ ہندی ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختے کا دوانہ دکن تمام
ملکوں ملکوں، شہروں شہروں، قریہ قریہ، دیہہ دیار
شعر و بیت و غزل پر اپنی ہنگامہ ہے گھر گھر آج
شعر ہمارے عالم کے ہر چار طرف کیا دوڑے ہیں
کس وادی آبادی میں یہ حرف سخن مشہور نہیں

چونکہ ان کو اس بات کا احساس تھا کہ ان کے اشعار پر خواص عوام سب ہی سر دھنتے ہیں اس لئے مضامین لطیف کو اس انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی کہ کلام میں سلیس و رواں زبان استعمال کی جائے۔ جو ذہن و دماغ سے بھی قریب ہو۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

ورنہ وہ خواص پسند زبان پر بھی پورا قابو رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی ترکیبوں سے آراستہ زبان بھی استعمال کی ہے اور اس سلسلے میں مرزا سودا بھی ان کے دوش بدوش ہی اور میر ہی کی وہ زبان ہے جس کو ابتداءً مرزا غالب نے اپنایا۔ میر کا یہ انداز ان کی خاص خاص غزلوں میں یوں نمایاں ہوا ہے :

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
ورنہ میں وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

جلوہ ہے مجھی سے لبِ دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبعِ رواں ہوں

پنجہ ہے مرا پنجۂ خورشید میں ہر صبح
میں شانہ صفت سایہ رو زلف بتاں ہوں

تکلیف نہ کر آہ مجھے جنبشِ لب کی
میں صد سخن آغشتہ بخوں زیرِ زباں ہوں

ہوں زرد غمِ تازہ نہالانِ چمن سے
اس باغ خزاں دیدہ میں مَیں برگِ خزاں ہوں

اک وہم نہیں بیش مری ہستیِ موہوم
اس پر بھی تری خاطرِ نازک پہ گراں ہوں

اس سلسلے میں بھی میر کا اپنا ایک خاص نظریہ ہے کہ شعر میں وہی[1] سادی ترکیب درست ہے جو زبان پر بار نہ ہو اور زبان ریختہ سے مانوس ہو سکے مگر اس کا احساس سلیقہ مند

---

[1] نکات الشعرا

شاعر ہی کو ہو سکتا ہے، غیر شاعر اس فرق کو محسوس نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ غیر معتدل فارسی ترکیبیں اپنی نامانوسیت کو ظاہر کر دیتی ہیں اور اسی بے اعتدالی نے اکثر شعرا کو ملعون کیا ہے۔

اصول بلاغت میں ''تنافر کلمات'' بڑا سخت عیب ہے۔ اس لئے میرؔ اپنی ریختہ میں اس کا پورا لحاظ رکھتے ہیں اور دوسروں کو اس عیب سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں اور جو عیب کے باوجود میرؔ پر حرف گیری کرتے ہیں ان کے متعلق کہتے ہیں۔

فہم حرفوں میں تنافر کا بھی یاروں کو نہیں

اس پہ رکھتے ہیں تنفر سب مری صحبت سے یاں

محاورات میں تصرف بھی جائز نہیں ہے۔ اس لئے وہ سجاد کے اس شعر پر معترض ہیں۔

میرا جلا ہوا دل مژگاں کب ہے لایق

اس آبلے کو کیوں تم کانٹوں پہ اینچتے ہو

کیونکہ محاورہ ''کانٹوں میں کھینچنا'' ہے نہ کہ ''اینچنا''۔

اس طرح میرؔ نے علم بلاغت و معانی کے جملہ اصناف کو اردو شاعری میں خوش سلیقگی سے برت کر اپنے دور کی ناپختہ زبان بننے کے لئے مستعد کر دیا اور اسی استعداد سے یہ زبان آج اس منزل پر پہنچی کہ سرمایۂ سخن سے مالا مال ہے۔

بلاغت و معانی کی کوئی صنف اس سے چھوٹی نہیں ہے۔ صنائع و بدائع کے جملہ لوازم سے آراستہ، دل میں کھینچنے والی شاعری، تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت و بلاغت، ادابندی ندرت خیال پر حاوی ہے۔ اگرچہ ''انداز میرؔ'' جس کے متعلق ان کا بیان ہے کہ ''بندہ ہم ازیں وتیرہ محظوظم'' میں یہ تمام چیزیں انھوں نے داخل کی ہیں۔ لیکن یہ خارجی محاسن ہیں جن میں میرؔ کی کوئی انفرادیت نہیں ہے۔ صفدر آہ[1] نے میرؔ کی شاعری کی چالیس خصوصیتیں لکھی ہیں لیکن ان میں اکثر و بیشتر ایسی ہیں کہ جملہ اساتذہ میں مشترک ہیں۔ مثلاً

---

[1] میر و میریات

تکرار الفاظ :

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری ان نیم باز آنکھوں سے

اس قسم کی اور بھی باتیں ہیں جو میرؔ کے علاوہ دوسرے شعراء اور اساتذہ کے یہاں بھی بھرپور انداز میں پائی جاتی ہیں اس کے لئے ایک ہلکی نگاہ ان کے کلام کے داخلی محاسن پر ڈال لینی ہے تاکہ ''اندازِ میرؔ'' کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

''اندازِ میرؔ'' کی عام خصوصیات کو ڈاکٹر عبداللہ چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

(۱) خلوص و صداقت۔

(۲) معمولات کی کامیاب مصوری۔

(۳) لب و لہجہ عام اور بول چال کا انداز۔

(۴) پیرایہ ادا کی مانوسیت۔

(۵) صوتی محاسن

خلوص و صداقت

جذبات کی ایسی سچی اور صحیح صحیح تصویر کشی جو سننے والے کے دل پر بھی وہی اثر ڈالتی ہے جو خود شاعر کے دل میں پیدا ہوئی ہے۔ میرؔ جب کسی جذبہ کا خواہ وہ احساس الم ہو یا کیفیت نشاط، ایسے انداز میں اظہار کرتے ہیں کہ سننے والے کے دل میں بھی وہی عالم پیدا کر دیتے ہیں اور یہی سب سے بڑی میرؔ کی خصوصیت ہے کہ ان کے کسی جذبے سے قاری کو بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنی دلی کیفیت ہے۔ میرؔ کا اپنا مخصوص رنگ درد و الم ہے۔ زندگی کی دوڑ میں شاہ و گدا کون ہے جو درد و الم سے دوچار نہیں۔ کہیں ''غم موجود'' ہے اور کہیں ''پریشانی معدوم'' سب ہی ایک اندرونی کرب سے کراہ رہے ہیں۔

رکھے رہتے ہیں دل پر ہاتھ اے میرؔ
یہیں شاید کہ ہے سب غم ہمارا

فرصت کم یاں رہنے کی ہے بات نہیں کچھ کہنے کی

آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

اظہار صداقت میں میر کے لب ولہجہ کو بھی بڑا دخل ہے۔ ان کا لہجہ کبھی عوامی ہوتا ہے، کبھی اس میں وہ خود اپنے دل سے مخاطب ہوتے ہیں، کبھی عہد کی ترجمانی کر کے اپنے ساتھ جگ بیتی بھی سناتے ہیں اور اپنی آفاقیت میں سب کو سمیٹ لیتے ہیں۔ زبان بدل چکی ہے لیکن میر کے لہجے کی دل گیری دوسو سال کے بعد بھی پورے آب و تاب کے ساتھ باقی ہے اور اپنی انفرادی شان دکھا رہا ہے۔ میر خود کہتے ہیں ؎

نہیں ملتا سخن میرا کسو سے

ہماری گفتگو کا ڈھب الگ ہے

ان کے لہجے میں ایک خاص موسیقیت ہے ؎

دل تڑپے ہے جاں کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا

مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں، مجنوں کیا ہم سا ہوگا

اس کے کاکل کی پہیلی کہو تم بوجھے میر

کیا ہے؟ زنجیر نہیں، دام نہیں، مار نہیں

تخاطب بالنفس کا انداز بھی میر کا مخصوص انداز ہے۔ جیسے انھیں اس خاکدان ہستی میں کسی سے بھی کچھ نہیں، وہ ہیں اور ان کے دل کی دنیا ہے۔ نہ کسی کو کچھ کہنا ہے، نہ کچھ سننا ہے۔ بس اپنے حال میں مست ہیں۔ اپنے دل سے اپنے دل کی باتیں ہیں۔ کوئی دردمند نہیں، کوئی ہم نفس نہیں، کہیں تو کس سے کہیں، سنیں تو کس سے سنیں۔ کوئی مخاطب صحیح نہیں ملتا۔ اس لئے جو کچھ کہنا ہے اپنے دل سے کہنا ہے۔ فضا بدلتی جا رہی ہے اور خطرات سامنے آتے نظر آ رہے ہیں ؎

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی

شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

شیون میں شب کے ٹوٹی زنجیر میر صاحب
اب کیا مرے جنوں کی تدبیر میر صاحب

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

شاعر کی نگاہ صرف اپنے ہی چاک گریباں پر نہیں رکتی بلکہ گردوپیش جو نظر آتا ہے وہ نالہ کناں ہے:-

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں
اس غم کدے میں آہ دل خوش کہیں نہیں

تو ہے بیچارہ گدا میر ترا کیا کہنا
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

اس حال میں محفل ناؤنوش کیا جمتی؟ شیشہ وشراب کی جگہ چشم سفید و اشک خوں نے لی تھی۔

چشم سفید و اشک سرخ آہ دل حزیں ہے یاں
شیشہ نہیں ہے، مئے نہیں، ابر نہیں، ہوا نہیں

اگر اسی حد تک بات رہتی کہ محفلِ عیش آراستہ نہ ہو سکتی مگر دو لقمے کا سہارا باقی رہتا تو صبر بھی آجاتا۔ عالم تو یہ ہو گیا کہ زندگی گزارنا بھی مشکل ہو گیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ۔

زندگی در گردنم افگند بیدلؔ چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

ایسی صورت میں دل کی گھٹن کا کیا پوچھنا ہے۔ زندگی سے دل تنگ آگیا۔ گھبرا کر بے ساختہ موت پیاری معلوم ہونے لگی۔ میر کہتے ہیں۔

اب جاں جسم خاک سے تنگ آ گئی بہت
کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھویئے

میر کی یہی حزنیہ شاعری جو آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں ہی ہے ان کی حیات دوام کا ذریعہ بنی ہے کیونکہ نالہ و درد کا اثر نغمہ سرور سے کہیں زیادہ ہوتا ہے اور ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکر اس بات پر متفق ہیں کہ حزنیہ اشعار قلب انساں پر بڑا گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ شبلی حزنیہ شاعری کو بہت عمیق ترین شاعری قرار دیتا ہے۔

شوپن ہار کا نظریہ ہے۔ ''خوشی غم مسلسل کا ایک معمولی وقفہ ہے۔'' یہ ایک حقیقت ہے جو رد نہیں کی جا سکتی اور نہ کوئی اب تک ایسا پیدا ہوا جو یہ ثابت کرتا کہ ''غم مسلسل خوشی کا ایک معمولی وقفہ ہے۔'' کبیر داس غم کو زندگی کی روشنی بتاتا ہے۔

راجا دکھیا، پرجا دکھیا، جوگی کا دکھ دونا
کہت کبیر سنو بھائی سادھو کوئی مندر نہیں سونا

غرض انسانیت پر غم کے بادل ہی چھائے رہتے ہیں، اسی میں کبھی کبھی خوشی کی پھوہار بھی پڑ جاتی ہے۔ اس لئے میر کی عمیق نگاہ نے کچھ اپنے اور کچھ ماحول کے حالات سے متاثر ہو کر اپنی شاعری کا موضوع ''درد والم'' ہی کو بنایا اور کچھ ایسے انداز میں مختلف پہلوؤں کو کرب آمیز انداز میں پیش کیا کہ اس کی گرفت میں ایک زمانہ آتا گیا، وہ زمانہ جو خلقت انسانیت سے لے کر خاتمہ انسانیت تک یکساں رواں دواں رہے گا۔

وہ وقفہ جس کا دوسرا نام خوشی ہے کبھی میر کو بھی میسر آیا۔ اگر چہ وہ ایک شگفتگی نا محسوس سہی۔ مگر اپنا رنگ دکھا گئی اور میر نے اس کی بھی ترجمانی کی ہے۔ کیونکہ اگر اس رخ سے ان کی شاعری محروم ہوتی تو وہ ''شاعر عہد'' نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ شگفتگی کا مضمون باندھتے ہیں تو پر مسرت زندگی جیتی جاگتی تصویر بن کر سامنے آجاتی ہے اور کچھ دیر کے لئے قاری اس بات کو بھول جاتا ہے کہ درد والم بھی ایک حقیقت ہے جس سے ہماری زندگی ہم کنار رہا کرتی ہے۔ اور یہی خود فراموشی ہے، جو میر کی نگاہ میں شان آدمیت ہے اور

جس پر وہ جان و دل سے نثار ہیں۔

مرتے ہیں ہم تو آدمِ خاکی کی شان پر
اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پر

یہ احساس ان میں شگفتگی پیدا کر دیتا ہے۔ پھر وہ زلف و رخ اور جام و بادہ سے کھل کر دل چسپی لینے لگتے ہیں۔ اور ان کے احساسات طربیہ میں بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ گل کی لچک میں قدِ یار کا جلوہ نظر آتا ہے۔[1]

شاخِ گل لچکے ہے تو جانوں ہوں
جلوہ گر یوں ہی یار ہوتا ہے

یا

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ کراب کی سی ہے

---

[1] ماخوذ از میریات

متون :-

مثنویات میر

مثنوی در ہجو شخصے ہیچمداں کہ دعوئے ہمہ دانی داشت

اس چرخ بے مدار کے کیا کیا کروں گلے
میرے جگر میں جیسے ستارے ہیں آبلے

تنکا سا اُن نے جور و جفا کر سُکھا دیا
پھر تِس پہ میرے رونے نے مجھ کو بہا دیا

اُس مجمع کمال کے گھر لے گیا یہ زور
جس کو تمام فنوں میں گویا تھا عبور

توحید گر کہے تو حق حق بہت کرے
ایسا بکے کہ بات تصوف میں ڈال دے

مصروف علم صرف کا تھا لیک اس سے حرف
پوچھو جو اسم آلہ سے تو بول اُٹھے کہ ظرف

یہ سُنکے تم ہنسو ہو تو وہ رو کے ایکبار
کہنے لگے کہ اپنا یہ صیغہ نہیں ہے یار

کرتا ہو بحث نحو میں جس دم وہ مار گیر
ہر نحو کا ہے لفظ فقط حرف یاد گیر

موضوع اپنا جانتا منطق کو تِس اُپر
محمول ابتدا ہی کو کہتا تھا بے خبر

وصف حذاقت اُس کا بیاں کیجیے تو کیا
تجویز کرتا دیکھ کے مبطون کو سُنا

فنِ بیاں میں کیسا ہے تشبیہ کس سے دوں
عالم کنایہ اس سے کیا ہے میں کیا کہوں

پوچھو مجاز کی جو حقیقت ہو لا علاج
کہنے لگے کہ رات سے بھیکا ملا مزاج

اور لفظ بھی مزاج ہے ناداں نہ ہے مجاز
معنے کہے تو اس کے کہے قصۂ دراز

پھر معنے پوچھے حکمت و جویاں مزاج کے
انواع یوں بیان کریے اسکے علاج کے

اسکی دوائیں کتنی مقرر ہیں طب کے بیچ
تعریض ایک ان میں ہے یعنی سیاہ کیچ

اس کا ضماد کرتے ہیں دو چار روز تک
پھر استعارہ دیویں تھوڑا کہ جائے پک

ہذیان معنی اس کا ہوا برطرف جہاں
پھر وہ مجاز مرسل اسے صبر کر وہاں

جمالی معنی یہ کہے آخر کو یہ کہا
تفصیل کرنے کا تو دماغ اب نہیں رہا

علم معانی سے جو کیا ایک دن سوال
کہنے لگا حقیقت عقلی تو ہے محال

لیکن مجاز عقلی کو ناداں یاد رکھ
یاں کون پوچھتا ہے دل اپنے کو شاد رکھ

ہے اب فصاحت اور بلاغت سو جانے دے
یہ دونوں عیب شعر میں اپنے نہ آنے دے

اک دن سوال علم قوافی سے میں کیا
کہنے لگا کہ قید نہیں اس میں مطلقا

تم آب قافیہ نہ کرو لفظ خاک کا
یا آتش اور اور باد کا زنجیر و تاک کا

لیکن مغایرہ ہو مقرر ردیف میں
آتا ہے یہ کچھ اپنے تو ذہنِ شریف میں

پھر شعر وصل و ہجر کے موزون تم کرو
عرصہ ہوا وسیع جواب چاہو سو کہو

دعویٰ بتاؤں کیا ہے انھیں فن شعر کا
معنی جو قافیہ کے کوئی پوچھتا تھا آ

بے علم کرتا قافیہ تنگ اسکی جان پر
دے مارتا تھا ہاتھوں کو وہ اپنی ران پر

کہتا تھا ہائے ہائے مرے بعد ہوگا کیا
ان احمقوں کے جینے کے پیچھے تو مر گیا

پھر تربیت سے انکی مجھے فائدہ بھلا
ٹوٹے ہے بکتے بکتے اُنھوں کیلیے گلا

مرجاؤں گا تو گور پہ میری نہ آئیں گے
دوکوزے آب کے بھی یہ ہرگز نہ لائیں گے

لیکن مجھے تو بخل نہیں ہے سنا عزیز
سنیو تو گوش دل سے اگر ہے تجھے تمیز

ایما اشارہ رہنے دے کہتا ہوں اب صریح
اول ہی لفظ کا نہیں ہے قافیہ صحیح

میں جو سنا ہے کافیہ چھوٹے کاف سے
پس پڑھنا تو غلط ہوا اب اس کا قاف سے

اوراس میں ایک نکتہ بھی کرتا ہوں میں بیان
پھر بولا ہائے ہائے نہیں کوئی قدر دان

ورنہ مرے دہن کو جواہر سے پُر کرے
یہ لعل اگلوں ہوں میں مجھے سر اوپر دھرے

پارے وہ نکتہ یہ ہے لگا کہنے کر خطاب
ہے ایک علم جفر میں بھی کافیہ کتاب

تصحیح صرف ہو چکی اب معنے اس کے سُن
ورنہ لگے ہے ذہن میں ان معنیوں کو گھُن

استادوں سے سنا تھا جو میں نے نہیں ہے یاد
اور اب جہاں کے بیچ نہیں کوئی اوستاد

ہر اک سے پوچھنے کو نہیں چاہتا ہے جی
لائق نہیں جو پوچھئے اب قافیہ روی

یہ کہکے آپ ہی بولا کہ کہنے کا کیا حصول
اس معنی کو کہے یہ مرے کیجیو قبول

اُس شخص کا جو حدث ہے آہ یہ ہے میرے یار
ہر چند اس کو گوزِ شتر جانے سب دیار

پر وید کر کہوں ہوں بنا بر میں احتیاط
حرف غلط تا نہ ہو معنی سے اختلاط

یا پھل ہے وہ سنا جو لگتا ہے جھاڑ میں
یا کاہِ خشک ہے جو اُگے ہے پہاڑ میں

گر پوچھتا کوئی کہ کسے کہتے ہیں روی
کہتا رَوی غلط ہے مجھے یاد ہے رُوی

پھر جاکے کھول جد کی اپنے کتاب کو
کہتا مرے قیاس میں آتا ہے ہو نہ ہو

انلب کہ اے عزیز وہ جنگل کی ہے جڑی
ہوتی ہے جسکی بیل ببولوں اُپر پڑی

اک دن بدیع میں جو اُسے امتحاں کیا
اک بار باز سامنے اُس نے وہاں کیا

کر جمع قلبِ مستوی و قلبِ بعض کو
کہنے لگا کہ عکس ہے اکثر کہاں ہے دو

حالانکہ تین صنعتیں کی جاتیاں بیاں
اور ایک سمجھا اُن کے تئیں ایسے ہیں کہاں

پوچھا جو اُس سے معنیِ ابہام کے تئیں
دینے لگا نشاں مجھے اک نام کے تئیں

یعنی تھا ایک وقت میں اک پہلوان زور
دو انگلیوں سے اُن نے اکھاڑے تھے شاخِ گور

بہرام گور اسی ہی کو کہتے ہیں سب عوام
در گور یہ تمام کہ کتنے ہیں ناتمام

تجنیس کا سوال کیا اُس سے ایک روز
کہنے لگا اس اسپ کو کہتے ہیں جو ہو یوز

نادان تونے اسپ مجنس نہیں سُنا
مشتق اسی سے جانے ہے جو ہے پڑھا گنا

لاتے جہاں ہیں شعر میں تجنیس شاعراں
مذکور اُن سے ہوتے ہیں گھوڑوں کے وصف واں

میں نے کہا کہ کہتے ہیں تم کو عروض داں
بحرِ رمل کی مجھ سے حقیقت کرو بیاں

بولا کہ تیری عقل سے آتا ہے بس عجب
دریا کا ایک نام ہے پھر کیا کہوں سبب

پھر میں کیا سوال بصد انکسار و عجز
بحرِ طویل بحرِ مدید اور بحرِ رجز

ان میں جو ہے گا فاصلہ مجھ کو بتایئے
کامل سے ملکے حیف ہے ناقص جو جایئے

بولا کہ تجھ کو عقل نہیں تا کجا کہوں
یوں تربیت میں تجھسے کی میں کبتلک رہوں

یہ تینوں رود خانے ہیں دہرِ بسیط میں
ملتے ہیں رفتہ رفتہ سبھی جا محیط میں

پھر آپ ہی آپ بولا کہ اک اور افادہ سُن
گر قابل اپنے ہونے کی دل میں رکھے ہے دُھن

بحرِ طویل ایک ہے دریا بہت بڑا
بحرِ خفیف ایک ہے پاس اُسکے آ بنا

تمثیل اُس کی ڈھونڈنے اب جایئے کہاں
جمنا کے پاس جیسے ہے ہنڈن تمہارے یاں

تشریح میں بھی ایک تھا وہ تلخ بے مثال
ہر استخواں کو کہنے لگا نیم کی ہے چھال

تاریخ داں تھا قطعِ نظر سب کمال کے
کرتا سخن ضرور ہے نبیوں کے حال کے

کہنے لگا تمھارے پیمبر کے عہد میں
تاریخ میں جو دیکھا تو عیسیٰ تھا مہد میں

یکبارگی غصا اُٹھے دجال کے اُپر
پھر تب سے مجھ کو علم نہیں ہے کہ ہیں کدھر

علمِ نجوم میں بھی بڑا تھا اُسے کمال
شاید کہ اس ستارے کا ہے گا حمل و بال

اکدن کیا سوال شہانِ سلف سے میں
پرویز کے اُنھوں میں خصوصاً سلف سے میں

اُس نے کہا کہ خوب کہا طرفہ نقل ہے — رکھتا ہے حافظہ میں اُسے جس کو عقل ہے
امرد تھا ایک اُن دنوں شیریں تھا اُسکا نام — یہ اسکی دشمنی میں موا یونہیں تلخ کام
یہ سُن کے مارا خسرو پرویز نے اُسے — بیدم کیا ہے کنجر پر تیز سے اُسے
ہے ماجرا یہی جو کہے کیا ہے کہہ — اور شعر جو زباں سے پڑھا اپنی سو ہے یہہ
از آب زر بہ خنجر شیرویہ نقش بود — کیں را نسب بہ تیشۂ فرہاد می رسد
گنتا تھا خوب آپ کو علم حساب میں — لیکن بیاں وہ کرتا نہیں جو کتاب میں
پھر طرفہ ہے یہ کہتا اگر ہے نہ چار طاق — پس کیوں لکھا لغت میں عناصر کو چار طاق
علم لغت میں عمر بھی اُس کی ہوئی تھی صرف — کرتا سوال اُس سے جو جا کر میں ایک حرف
مثلاً کہا کہ نخل ہے کیا اس کو کر بیاں — وہ در جواب اسکے وہیں کھول کر زباں
بولا کہ اک جزیرہ ہے سمت فرنگ کو — مارا تھا اُن فرنگیوں نے اس نہنگ کو
اب خاک سے نہنگ کی واں اک نہال ہے — شیرو پلنگ کا وہ سدا پائمال ہے
اسکے ثمر کو بعض تو کہتے ہیں تاڑ پھل — بے مغزوں کا جو فرقہ ہے کہتا ہے ناریل
کہتا ہے کوئی مکہ کا خُرما ہے اسکا بیج — اک کہتے ہیں فرنگ میں ہے ایک باد پیچ
جس کی صدا سے گوشِ صدف بحر میں ہے کر — صدمہ سے جس کے ٹوٹ گئی کوہ کی کمر
یہ کچھ لکھا ہے سارے لغت کی کتابونمیں — زبدہ ضریری شرح وقایہ کے بابونمیں
تحقیق اپنی یہ ہے کہ ہے نخل اصل حرف — تصحیف ہو گئے سے جو ہوتا ہے خ سے خرف
وہ نخل کیا کہ جانور و چار پایہ ہے — دُم اتنی لمبی ہے کہ وہی سر کا سایہ ہے
سوداگر اس پہ بار کریں ہیں چنار کو — اس پر بناتے ہیں گے رہوں میں منار کو
سر کے ہیں اُسکے بالوں کا بھی کرتے ہیں اچار — اس ہی کو کہتے ہیں گے مدائن میں سوسمار
یہ کہہ کے آپ ہی بولا ہاں ریش اور خش — آتا ہے جو کہ اپنے تئیں سو ہے پیش کش
کرتا تھا شہ کمانی میں اپنے تئیں دخیل — زاغِ کماں کو دیکھ کے کہتا کہ ہے یہ چیل
دعویٰ تھا علم تیر میں اس کو بہت بڑا — پر لے کے لیس ہاتھ میں ہوتا جو وہ کھڑا
پھر دیکھ بھال اس کو وہ کہتا کہ مجھ کو بھی — معلوم کیا ہے خوب و لیکن یہ ہے وہی
جب سوکھتا ہے اس کی سلاخوں کا کر خمیر — چاکوں اُپر کمھار بناتے ہیں لیس و تیر

غرہ تھا ڈھولک اپنی بجانے پہ اور کبھو　　آتا جو کوئی ہاتھ میں لے اس کے رو برو
اس پر لگا ٹکور تعجب سے پھر شتاب　　کہتا روئی بھری ہے بہت اس میں آئیں داب داب
آواز خوش کی اسکی گلوسوزی میں نہ بول　　گاتا تو باجتا تھا گلا جیسے پھوٹا ڈھول
لکڑی بھی پھینکتا ہے بہت خوب بج سے وہ　　ہوتا تھا کج بہت جو کھڑا ہوتا دھج سے وہ
شاگرد اس کا پوچھتا گر اس سے آن کر　　مونڈھے اُپر لگاتے ہیں جو وار تان کر
اسکو اگر کہیں تو کہیں کیا وہ سر اُٹھا　　کہتا کڑک وہی ہے جو تجھ کو دیا بتا
تھا گھوڑے کا بھی خوب مبصر وہ خرد لیک　　ایک میرے مہربان تھے گھوڑا تھا انکا ایک
گھوڑے کی آنکھ پر تھی رسولی پہ گندہ تر　　رہتی تھی اس کمیت کی وہ حائل نظر
تشریف لائے ذات شریف اسجگہ کہیں　　واں گھوڑوں کی رسولی کی تھیں باتیں چل رہیں
کہنے لگا ایک نظر مجھ کو بھی دکھاؤ　　یہ چشم ہے خدا سے کہ اسکا اثر نہ پاؤ
اس گھوڑے کے سوار کے پھر جی میں آگیا　　کھلوا منگایا تھان سے وہ اسپ انکھ مُندا
لاگا سئیس سامنے اسکے پھر آونے　　اور آنکھ اپنے گھوڑے کی اسکو دکھاوَنے
ہر چند انکھیاں پھاڑ کے دیکھے یہ ہر کہیں　　اسکو تو پھوٹی آنکھوں سے پر سوجھتا نہیں
یکچشم دیکھ کہنے لگا نوچ پوچ حلق　　گھوڑے کے موترا ہے رسوئی کہے ہے خلق
پھر اس نظر پہ طرفہ تو یہ ہے کہ رو کے خوب　　کہنے لگا کہ تب تو جہانمیں پڑی ہے ڈوب
شوخی کرے ہے ابلق ایام نابکار　　ورنہ پیادے مجھسے پھریں ایسے ہوں سوار
جو جو ہوئے ہیں چرخ سے مجھ پر ستم مدام　　جیتا رہا تو میر کروں گا گلے تمام

اپنی تو بدزبانی نہ تھی خامے کا شعار
پر یہ بھی ہے جریدۂ عالم میں یادگار

جنگ نامہ

اب کے نواب رامپور آیا　　ناگہاں اس طرف خدا لایا
آگے آتا تھا بہر سیر شکار　　بازی یکسر روہیلی ہے اس بار

گرد تھی فوج کی پہر تلک
بن گیا اور ایک تازہ فلک

جمع افغاں پسر تھے اس جا گہ
لیک سارے تھے جنگ ناآگہ

یہ نہ سمجھے وزیر کوہ وقار
ہے تحمل سے رہ میں دیر گزار

یعنی تخریب ایک آن میں ہے
روکشی ان کی کسرِ شان میں ہے

بے تہی سے وہ پیش جنگی کر
وانتے دے دے گرے ہراول پر

دیکھ کر لوگ تھوڑے ٹوٹ پڑے
پکے پھوڑے کے رنگ پھوٹ پڑے

جتھے تلواروں میں فرنگی سے
مرے مارے بہت کڈھنگی سے

تھا تہور نہ یہ شجاعت تھی
ساعتِ جنگ یا قیامت تھی

تھے تلنگے روہیلے محو جنگ
لوتھوں سے ہوگیا تھا عرصہ تنگ

گورے کالے جدا جدا کیا تھے
دونوں مردم گیا سے یکجا تھے

دیو کا بھی نہ ٹھہرے پا اس جا
تھا انھوں کا جہاں ثباتِ پا

سہل سردار سمجھا یہ مرنا
اللہ اللہ ترا جگر کرنا

توپ پر آن کر چلی تلوار
جھیل کر زخم لڑموا سردار

صاحب اک اور اسکی جا آیا
جن نے ایسی ہلاکو چنوایا

جنگ مغلوبہ تھی گتھے باہم
مرتے تھے دونوں اور کے رستم

صاحب انگریز کے گرے اکثر
تھک گئے لڑتے مرتے ہم دیگر

تاک کر باڑھ پہلو سے ماری
صف الٹ دی حریف کی ساری

لشکری سب سراں سمیت رہے
سبزہ جو کچھ ہوئے تھے کھیت ہرے

نعش پر نعش گر کے ڈھیر ہوئے
بھوکے مرتے کہ جی سے سیر ہوئے

پیچھے سردار تھا پٹھانوں کا
دیکھا جاتا جو ان نے جانوں کا

خواب غفلت سے چونک اُٹھا جاگا
دست پاچہ ہوا گیا بھاگا

مارے بھاگوں کو فوج نے لوٹا
مرگیوں میں سے بھی نہ اک چھوٹا

غارت از بس کہ لشکری لائے
نعشوں سے اشرفی روپے پائے

وہ جو بھاگا تھا معرکہ سے رئیس
بھاگا یوں جیسے پیش اسپ سئیس

ہوتے ہیں جو روہیلے ظلم شعار
لٹتے جاتے تھے شہر راہ گزار

رامپور میں بھی آکے رہ نہ سکا
وہ خدا گیر بات کہہ نہ سکا

بھاگا واں سے ہے لیکے کچھ اسباب
کہ لگا آیا لشکرِ نواب

لی پناہ اُن نے جاکے زیر کوہ
واں بھی تھا ساتھ کوہ کوہ انبوہ

تھا پہاڑوں کے آگے جنگل بھی
وہیں ناکہ پہ تھا یہ ڈنگل بھی

وہاں روہیلے ہوئے اکٹھے سب
بعد دوچار پنج روز و شب

عجز کی راہ سے کیا پیغام
ہم ہیں نواب کے کمینے غلام

بندے رہتے ہیں باوجود خطا
تم سے صاحب امید وار عطا

لطف کریے امیدواروں پر
رحم کریے گناہگاروں پر

ہم غلامی میں ہوتے ہیں حاضر
اب نہ خدمت سے ہووینگے قاصر

کسو صاحب کو ہو حضور سے حکم
مو جب طوع وہ ہے دورسے حکم

کہ مجھے اپنے ہاتھ لے جاوے
پاؤں کتنے کے عاجز آپاوے

ذات نواب ہے کرم سیرت
کہا صاحب کو تم بصد عزت

معرفت اپنے جاکے لاؤ اُسے
پاس خیمہ میں لا بٹھاؤ اُسے

یا کہ خیمہ جُدا کرو استاد
ہم اُسے وقت پر کریں گے یاد

لایا صاحب چنانچہ خود جا کر
پاس کرنا ہے تا نفر چاکر

سر میں اس کے خیال باطل تھا
آپ بھی وہ جوان جاہل تھا

گفتگو میں کجی لگا کرنے
ہوا موجود مارنے مرنے

چاہتا تھا کہ آپ کو مارے
بارے ہتھیار چھن گئے سارے

رفقاء کے تئیں نکال دیا
رنجہ کر ٹہلوؤں کو ٹال دیا

اُٹھ گئے جو حرامزادے تھے
ہو چکے دل میں جو ارادے تھے

عاقبت اس کو باندھ کر بھیجا
کہا پلٹن سے لکھنؤ لے جا

جمع تھے لوگ سو پریشاں ہیں
رہ گئے ہیں سو عجز کیشاں ہیں

جنگ نے صبح کے تئیں ہے نہ شام
آشتی کے ہیں اب پیام و سلام

۱۔ وہ شخص جس کا پیشہ غضب ہو

غالباً صبح آج کل ہووے　　ہر طرف جھمگی خلق ہووے

لے کے اب ملک و مال سب نواب　　راہ لیتے ہیں لکھنؤ کی شتاب

سال تاریخ کا تھا مجھ کو خیال　　لُطف کے رو سے کی ملک نے مقال

کاے سخن گستر و جہاں اُستاد　　فتح نواب سے کر اب دل شاد

میر کوئی غزل کہو اب تم　　۱۱۷۹
لذتِ شعر میں رہو خود گم　　۳۰
　　۱۲۰۹

مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی

آؤ ساقی شراب نوش کریں　　شور سا ہے جہاں میں گوش کریں

آؤ ساقی بہار پھر آئی　　ہولی میں کتنی شادیاں لائی

شادیاں بے شگوں سراسر ہیں　　کوچے سو شہر کے برابر ہیں

دست دستور ہے جو زر افشاں　　پھر جہانِ کہن ہوا ہے جواں

دونوں رستے عمارت خوش ہے　　تازہ کاری شہر دلکش ہے

اور بازاری رنگ لائے ہیں　　سارے رنگیں ستوں لگائے ہیں

جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے　　شہر ہے یا کوئی تماشا ہے

چشمِ بد دور ایسی بستی سے　　یہی مقصد ہے ملک ہستی سے

لکھنؤ دلّی سے بھی بہتر ہے　　کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہے

آئیں بستہ ہوا ہے سارا شہر　　کاغذیں گل سے گلستاں ہے دہر

ایسے گل پھول ہیں جو صرف کار　　راہ رستے ہوئے ہیں باغ و بہار

بستہ آئیں دکانیں ہیں یکسر　　جن میں سستی متاعِ لعل و گُہر

میوۂ نورس و رسیدہ بہت　　گل خوش رنگ و بوے چیدہ بہت

شب شادی کو لڑکے ہوں جو سوار　　ہیں صغیر و کبیر ہر نثار

تخت بہر زنان رقص کناں — پچنے رستوں میں بے چنیں و چناں

گل کاغذ سے شہر ہے گلزار — تو کہے آئی ہے بہار اے یار

ساقیا عیش کا ہو بزم آرا — سارے لوگوں میں جام مے کو پھرا

جس میں تہ پاوے اس پری کو دے — ورنہ شیشے کی شیشے میں رکھ لے

ہوگی مجلس جو مست آسائش — کون دیکھے گا لطف آرائش

آؤ ساقی قرار ہے باہم — کہ تماشا کناں پھریں خرم

زنِ رقاص پر نگاہ کریں — کسو سادے سے چل کے راہ کریں

کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ — کسو محبوب کو اُٹھا لیں ساتھ

کسو خوشرو کے منھ پہ منھ رکھ لیں — کُنج لب کا کہیں مزا چکھ لیں

خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی — کسو نازک بدن سے ہمدوشی

کہیں دو جام مے سے ہوں سرمست — جائیں گے تھوڑی دور دست بدست

مچلے بن جائیں گے کسو کو دیکھ — پھر منگیے کسو کے رو کو دیکھ

اب گلابی کو لیں گے بھر بھر ہم — باقی ساقی پئیں گے پھر کر ہم

کہیں آرائش آ کے دیکھیں گے — کاغذیں باغ جا کے دیکھیں گے

کسو مہوش سے ہوویں گے گلباز — کھینچیں گے ایک دو دم اُس کے ناز

آؤ ساقی مئے دو آتشہ دے — اسی مے کا بغل میں شیشہ لے

گرم ہو جو دماغ انساں کا — لطف آوے نظر چراغاں کا

جس طرف دیکھیے چراغاں ہے — شیشۂ شمع ہی نمایاں ہے

باغ سے روشنی ہوئی ہے زیاد — ہے یہ ہنگامہ تا جلال آباد

شمع و فانوس کا بہت ہے ہجوم — شمعی رنگوں نے کر رکھی ہے دھوم

لوٹیے اُن گلوں کی اب تو بہار — گو کسو کے گلے کا ہووے ہار

ابتو اودھم ہی مچ گیا ہر سو — دارو پی کر پھریں چلیں ہم تو

تارے سے ہیں چراغ چار طرف — آسماں پر زمیں رکھے ہے شرف

غنچہ غنچہ دیوں کو دیکھے جہاں — کسو نو گل سے رکھیں صحبت واں

کہیں نوبت کو چل کے سُنیے گا — نے کے بجنے پر سر کو دھنیے گا
نوبتی خوش سلیقے سارے ہیں — نے نوازوں نے جان مارے ہیں
آج نوبت کے بجنے پر ہے رنگ — عقل ہوتی ہے سُن نکوری دنگ
جھانجھ کے سُننے کی رہی ہے جھانجھ — صبح جوں توں کے ہم کریں ہیں سانجھ
بیچ میں ہولی آئی ہے ساقی — پھیرے سر خوش ہے تا کبے باقی
شیشہ شیشہ شراب اب پیچے — بلکہ خُم منھ لگا کے سب پیچے
سیر کریے کنارِ نہر و گشت — لالۂ و گل کھلے ہیں تا سر دشت
اُنھیں پھولوں کے انعکاس سے آب — تو کہے لالہ رنگ سب ہے شراب
سبد گل ہوئی ہے ہر کیاری — ایک ہے گل زمیں زمیں ساری
درمیاں ایک شجر نہیں بد برگ — ہے ہزارہ کہ لالۂ صد برگ
جوش لالہ سے تا اونج[1] و سنگ — شفقی ہو گیا ہوا کا رنگ
تخت کیونکر نہ ہو دماغِ خاک — دشت در دشت ہے گل تریاک
بھر لبالب ہیں آب گیر رنگ — اوراڑے سے ہے گلال کس کس ڈھنگ
پاس آتے ہیں مرغ گلشن بھول — تھے وے دلبر گلاب کے سے پھول
زعفرانی لباس تھے سب کے — رسم سے آئے صبح کو شب کے
پگڑیاں جامہ بھیگی سو سو ہیں — ان کو گلہائے تر کہیں تو ہیں
چھیڑیاں پھولوں کی دلبروں کے ہاتھ — سیکڑوں پھولوں کی چھڑی سے ساتھ
نغمے جو گلال کے مارے — مہوشاں لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں — گُل کی پتّی ملا اڑاتے ہیں
جشن نوروز ہند ہولی ہے — راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے
عشق ہے اے گروہ آتش زن — دونوں رستے چراغ ہیں روشن
ٹھاٹھ کیا روشنی کے باندھ دیے — شہر میں نام روشن اپنے کیے
دور دو تھے خیال و سوانگ آئے — گھوڑے دامن سوار کیا لائے
روشنی دار سے ہے پار تلک — گل کا کاغذ ہے فرق خار تلک

۱؎ اونج۔ ادرنگ

اور دولت سے لے کے تا سر آب / ہے چراغ اور شمع ہی کی تاب
پھر سرِ پُل تا عمارت نو / جلتے ہیں مجتمع دیے سو سو
ہاتھی رنگے گئے پڑی ہے دھوم / جیسے ابر سیاہ آئے جھوم
خیمہ استاد کر چکے شب باز / پتلیوں نے کیا خرام ناز
یاں کی صحبت کا تھا نمونہ سب / شاہ دستور حکم و کار ادب
آئے شکلیں بنا کے صورت باز / ڈوم ڈھاڑی بنے بجا کر ساز
نقل معقول کی سو حاجی بنے / بج کے عمامے سر پہ کتنے جنے
کوئی جوگی کوئی فقیر بنا / کوئی داڑھی لگا کے پیر بنا
کوئی بنیا بنا کوئی اوباش / نقل کرنی تھی اُن سبھوں کی معاش
کوئی شاعر بنا نہ جس کی نظیر / جیسے مستغرقِ خیال تھا میر
کوئی سپاہی بنے تھے کوئی تجار / کوئی زاہد ہوا کوئی خمار
جس کی تقلید کی سو ویسی طرح / اصل ہوتی نہیں ہے ایسی طرح
کرکے سعی و تلاش چاروں دانگ / خوب دیکھا تو ہے یہ عالم سوانگ
آؤ ساقی نہ رکھ خراب احوال / دیے جا جامِ بادہ مالا مال
چل سواری کا سیر بھی ہے بڑا / ایک عالم ہے دونوں رستہ کھڑا
جُل زر بفت پوش فیل نشاں / کوہ زر سا ہے پیش پیش رواں
کد خدا ہونے کو چلا دولھہ / بال و گوپال عظم سے جوں شہ
گل کی پاکھر پڑی ہوئی یکبار / ہاتھی آیا برنگ ابر بہار
زری پوشوں کا پیش و پس انبوہ / اللہ اللہ ری ان کی شان شکوہ
تور میں کتنے سونے کے سے پہاڑ / آگے روپے کی روشنی کے جھاڑ
موتی کرتے تھے ہر طرف سے نثار / تھا مگر فیل ابر گوہر بار
ہیں جلو میں زمینیاں حاضر / جاہ کے آسمانیاں حاضر
عمدہ سب ساتھ ہیں وزیر سمیت / شاعراں مدح خواں ہیں میر سمیت
تازی ترکی عراقی و عربی / کوتل آگے تھے خوش جلو میں سبھی

رہیں رکھ لو جہاں کہ منھ کے نرم
چھیڑے باد سموم سے ہوں گرم

آؤ ساقی پلا شراب ہمیں
روشنی کی نہیں ہے تاب ہمیں

روشنی بھی ہے کوئی ہنگامہ
سیر میں گرم ہوگیا جامہ

گرمی سے مشعلوں کے آئے تنگ
دودِ مشعل ہے جائے کاہی رنگ

دو طرف سیم بندی کردی ہے
سونے روپے سے راہ بھر دی ہے

شمعیں لاکھوں کنول میں ہیں روشن
زور پھولا ہے کاغذی گلشن

واہ آتش زناں آتش دست
دارو پی کر پھرو ہو کیسے مست

توپیں کیا ڈھالیں ہیں ستارونکی
کھوئی رونق فلک کے تاروں کی

تارے موقوف کچھ سا پہ نہیں
توپیں چھوٹیں مگر ہوا پہ نہیں

ماہ بھی چشم روشنی کے لیے
ہے چراغاں ستارگاں سے کئے

گنج چھوٹے ہیں یا کہ باڑ جھڑی
یا ہوائی ہے جگنیوں کی چھڑی

گل فشاں ہیں پڑی جو پھلجھڑیاں
کھلتیاں ہیں دلوں کی کلھڑیاں

چھوٹتے ہیں انار و مہتابی
رنگ ہیں دلبروں کے مہتابی

باؤ سے دو دیے ہوئے گر ماند
دگنیں مہتابیاں کہ نکلے چاند

آؤ اے مطربانِ سیر آہنگ
ساتھ اپنے لئے رباب و چنگ

ہو غزلخوان بزم عیش و طرب
پر نہ کریو خیال ترکِ ادب

منعقد مجلس شہانہ ہے
ادبِ آصفِ زمانہ ہے

آؤ ساقی مجھے قرابہ دے
در بغل شیشہ ساتھ اپنے لے

بحرِ بخشش کی لہریں اب آئیں
زرد گوہر کی کشتیاں لائیں

ہے بلند اس کرم کا کیا پایہ
دیتے ہیں خلعت گراں مایہ

طرہ ہائے زری و بادلہ تاس
تخت ہائے دوشالہ تحفہ لباس

بہت ان میں سے بہت نہ سئے
ایک دم میں سبھونکو بخش دیے

خاص ملبوس نوع نوع تمام
لے گئے شاد بھر کے مردم عام

کیا بچھا ہے فراخ دستر خواں
جسپہ ہے خلق یک جہاں مہماں

تورہ بندی ہوئی تکلف سے — کھانے نکلے نئے تصرف سے
لطف کے ساتھ نعمتوں کا وفور — زیرِ ہر جعبہ قاب ہے پر نور
عام تھا ان لطافتوں سے طعام — دیتے لیتے تھے ہر سحر ہر شام
کس کو اسباب یہ میسّر ہیں — ظرف سیمین جعبۂ زر ہیں
ہیں جو مہمان بادشاہ و گدا — حرص دونوں کی سیر ہے یکجا
عمر و دولت ہو اس کی حد سے زیاد — ہے اُسی سے جہاں نشاط آباد
آؤ ساقی غزل سرا بھی ہو — لذّتِ شعر سے مزا بھی ہو
کی فکرِ سالِ تاریخ آوازِ غیب آئی — ہم[۱] نے کبھی نہ دیکھی اس رنگ کدخدائی
آنکھوں کی روشنی تھی اپنی ہوئی دوچنداں — طالع نے چاندنی میں کیا روشنی دکھائی
ہو باد جس طرف کی آنکھیں اُدھر ہیں اُسکی — نرگس کا اس ہوا میں دیدہ بھی ہے ہوائی
بے گل رہے نہ یکدم بلبل کے آہ و نالے — محبوب سے کسو کو یارب نہ ہو جدائی
گل تک ہنسا نہ مجھسے بلبل نہ بولی ہرگز — کس کس کی بیدماغی بے یار میں اُٹھائی
ہم بھی رہے ہوا و جبتک جوان جاہل — کی عمرِ رفتنی نے بارے نہ بیوفائی
خواں زمانہ کے تو کیا جانیں دل لگی کو — لگتی ہے جسکے دل کو وہ جانتا ہے بھائی
ہے دامگاہ دنیا ہر جا فریب اس میں — دیتی نہیں دکھائی اپنی مجھے رہائی

گزری جو کچھ سو گزری یاری میں دلبروں کی
میر اب کسو سے تم تو کریو نہ آشنائی

مثنوی در بیان ہولی

ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر — رنگ صحبت سے عجب ہیں خرد و پیر
جشن نوروزی اہل ہند سب — ہے یہی تب محو عشرت ہینگے اب
شیشہ شیشہ رنگ صرف دوستاں — صحن دولتخانہ رشک بوستاں

۱ یعنی ۱۲۱۷ ہجری

اس چمن میں باغ پر گل سرخ و زرد ‏ نکہت گل جھاڑینگے واں آکے گرد
پھول گل آویں نظر دیکھو جدھر ‏ لالہ و صد برگ سب باغ نظر
دستہ دستہ رنگ میں بھیگے جواں ‏ جیسے گلدستہ تھے جوؤں پر رواں
زعفرانی رنگ سے رنگیں لباس ‏ عطر مالی سے سبھوں میں گل کی باس
رنگ افشانی سے پڑتی ہے پھُہار ‏ رنگ باراں تھا مگر ابر بہار
مرغ گلشن گلرخاں کو جان پھول ‏ بیٹھتے ہیں پاس آکر پھول پھول
قمقمے جو مارتے بھر کر گلال ‏ جسکے لگتا آن کر پھر منھ ہے لال
برگ گل ملواں اُڑاتے تھے عبیر ‏ تھی ہوا میں گرد تا چرخ اثیر
روشن الدولہ نے کی تھی روشنی ‏ کب ہوئی تھی لیکن ایسی روشنی
وہ چراغاں گرچہ تھے درگاہ تک ‏ تھے تماشائی گداؤ شاہ تک
راہ میں ترپولیے مینار تھے ‏ روشنی کے کوچہ و بازار تھے
گرم کچھ ہنگامہ یہ بھی کم نہ تھا ‏ اس روش کی دھوم کا اودھم نہ تھا
ابتو ہفت اقلیم کا عالم ہیں یاں ‏ دیکھو تو ہر جنس کا آدم ہیں یاں
ٹٹیاں دریا کے باندھیں دو طرف ‏ کیا چراغاں آسماں کی ہو طرف
تھا جہاں تک آب دریا کا بہاؤ ‏ واں تلک تھا اس چراغاں کا دکھاؤ
ایک عالم دیکھتا تھا دور سے ‏ رات دن تھی روشنی کے نور سے
کوچۂ و بازار و بام و در بنے ‏ روشنی کے دونوں رستہ گھر بنے
سوانگ کیا کیا بنکے آئے درمیاں ‏ پیکھنے کا سوانگ تھا سارا جہاں
آئے کس کس رنگ سے دامن سوار ‏ باد کے رنگوں جنھوں کا تھا گزار
ہاتھی آئے کوہ پیکر کیا بنے ‏ جیسے مدہ ماتے جواں ہوں انمنے
کیسی کیسی دیکھی شکلیں تازیاں ‏ سحر کرتے تھے کہ صورت بازیاں
ان دیوں کے عکس سے دریا کا آب ‏ آئینہ کے سطح کی رکھتا تھا تاب
کشتیوں میں جو دیے بھر کر چلے ‏ پانی میں شعلوں کے ریلے ہی چلے
منعکس تھے جو چراغاں تہ تلک ‏ آب کی وسعت تھی پر انجم فلک

کیا ہوائی چھوٹنے کا ہے بیاں ذو ذنب جیسے ستارے ہوں عیاں
جا ہی جو ہی چھوڑنا ہے یاد بود روشناں ذو ذوانب تھے نمود
گنج چھوٹے ایک سے روشن تھے جھاڑ دو طرف جس طرح سے جھڑتی ہے باڑ
اس روش سے تھے ستارے چھوٹتے ناگہاں جو ہوویں تار سے ٹوٹتے
دیکھے جاتے تھے چراغاں آب میں شعلے تھے لہروں کی پیچ و تاب میں
ہر دو جانب چُن گئے ناری انار گلفشانی سے انھوں کی تھی بہار
ماہتابی اک طرف سے جو دغی چاند سا نکلے ہوئے حیراں سبھی
آفریں صناع لوگو آفریں کیا لگایا باغ آکر کاغذیں
گُل کتر کر پھول گل ہی کر دیے رنگ تازے کاغذوں میں بھر دیے
متصل توپیں ستاروں کی دغیں لوگوں کی آنکھیں فلک سے جا لگیں
دیکھیاں کیا کیا نہ شعلہ خیزیاں تھیں ہوا میں سے ستارہ ریزیاں
نذر کو نواب کی اہل فرنگ لیکے آتشبازی آئے رنگ رنگ
عرصہ گلریزی سے گلشن ہو گیا چرخ ان تاروں سے روشن ہو گیا
داغیاں توپیں ہوائی ایک بار پھیلے تارے آسماں پر بے شمار
کیا ہوائی باد میں لہرا گئی تاری سانپوں کے سے من پھیلا گئی
کیا ہی آتش دستیاں دیکر گئے شعلوں سے پانی کی لہریں بھر گئے
رحمت اے آتش زناں کیا لاگ ہے تہ بساطِ آب دریا آگ ہے
لکھ غزل اب میر رنگیں تو کوئی سُنکے ہو محظوظ جس کو ہر کوئی

مثنوی دیگر

تھا کسی کا بچہ اک درویش پاس باش و بود اُس کی تھی مجھ دلریش پاس
اس قلندر نے بحسب احتیاج بیچنے اس کو نکالا لا علاج
میں نے اُس کو ایک جا دلوا دیا مول ٹھہرا تھا جو کچھ سو لا دیا

بوزنہ یا کوئی تحفہ دہر کا — عزت افزا بند ابن شہر کا
نام منوا اُس کا اب مشہور ہے — شوخی اُسکی ہر کہیں مذکور ہے
ہے ہنومانی نسب یہ باب دید — قایل وصف اس کے حضرت بوحمید
ہے جو لکھو بندری مشہور اب — اسکی جد مادری تھی بو العجب
اُس کے پردادا نے ہی یہ حرف دی — ایک دم لابہ میں لنکا پھونک دی
ایک چنچل ہے بلائے روزگار — ہاتھ رہ جائے تو پا سرگرم کار
ہے تو بچہ سا و لیکن دور ہے — پست اس کی جست کا لنگور ہے
کیا کوئی انداز شوخی کا کہے — ہو معلّق زن تو آدم تک رہے
اچپلاہٹ اسکی سب معلوم ہے — معرکوں میں چوک کے اک دھوم ہے
ہوتے ہیں قزّ ادکب دیکھے سے سیر — اچپلی اُس کی رہے ہے یاد دیر
حرکتیں دلکش ہیں سب انداز خوب — پرضروری ہے کہ ہاتھوں میں ہو چوب
ورنہ بوٹا سا جو قد ہے جھاڑ ہے — کنکٹا نچنا ہے کپڑے پھاڑ ہے
لونڈی باندی سبکو اس سے احتراز — ڈر سے اکثر بی بیوں کے دل گداز
یہ جو چاہے چھوٹے تو تدبیر کیا — رسی ڈوری لوہے کی زنجیر کیا
ربط اسے جس سے ہے اُس سے ربط ہے — مار کھانے پر بھی اُس کو ضبط ہے
جب وہ چھوٹے شور و ہنگامے رہیں — ابتو چھوٹا ابتو چھوٹا سب کہیں
چھوٹتا ہے گر پڑے کوئی بجوگ — بندروں سے ناچتے پھرتے ہیں لوگ
ہوتے ہیں اس جنس میں بھی ذی خرد — آدم و حیواں میں یہ برزخ ہیں بد
طنز ہے یہ بات اگرچہ ہے کہی — جو کرے انسان تو بوزینہ بھی
لیکن اس جاگہ تو صادق ہے یہ قول — سارے اُسکے آدمی کے سے ہیں ڈول
ہے تماشا آئینہ کے رو برو — عکس سے اپنے اسے ہے گفتگو
دیکھنا جھک جھک کے اسکا ہو نہ ضبط — آرسی بندر کا ہے مشہور ربط
گاہ بوسہ گاہ غر غر بولنا — گاہ آنکھیں موندنا گہہ کھولنا
آگے تھا اک بوزنہ شطرنج باز — چال سے اس کی نکلنا امتیاز

کہنہ قرادوں سے ہم کو یاد ہے
یہ اسی فتان کا داماد ہے
جان دیں بندر اگر دیکھیں چنے
رہتے ہیں چانول پڑے اُس کے گنے
آنکھ کب ڈورے ہے اُسکی ہر طرف
ہے یہ اپنے نوع کا فخر و شرف
الغرض منوا عبارت جاں سے ہے
نام اس دلکش کا منوایاں سے ہے
خوش رہے منوا تو خوش احوال میر
ورنہ آدم ہے جوانی میں بھی پیر

دہر میں یارب نہ یہ محزوں رہے
جسکا منوا ہے اُسے میموں رہے

مثنوی دیگر

ایک بلّی موہنی تھا اُس کا نام
اُن نے میرے گھر کیا آکر مقام
ایک دو سے ہوگئی الفت گزیں
کم بہت جانے لگی اُٹھ کر کہیں
ربط پھر پیدا کیا میرے بھی ساتھ
دیکھتی رہنے لگی میرا ہی ہاتھ
آئے ہے مجھ پاس یہ اُٹھ کر سویر
گربۂ زردِ فلک نکلے ہے دیر
یعنی وقتِ گرگ و میش آئے ہیں پاس
پھر مرا پہروں کیا ہے اُن نے پاس
چھیچھڑا ٹکڑا جو کچھ پایا کرے
فقر میرا دیکھ کر کھایا کرے
بختوں سے ٹوٹا ہے چھینکا بھی اگر
اُن نے اودھر کی نہیں مطلق نظر
دخل کیا ہے جھانکے یہ چھینکے کی اور
ٹکڑے کو دیکھے نہ گو بھوکی ہو زور
اس مروت پیشہ سے کیا ہے گلا
خوف سے آپھی گہے چوہا ملا
ایک بلّی کچھ گئی تھی آکے چکھ
یہ لڑی تو منھ پہ پنجہ اپنے رکھ
برسوں یاد آوے گی یہ پاکیزہ خو
آگے آئی ہی نہیں چلتے کبھو
لانگھے ہو جو گھر سے جاتے تد رہوں
چلتے چھینکا ہو کبھو تو کچھ کہوں
تھی جو ظاہر جوں کڑاہی تیرہ رنگ
پر تماشا کردنی تھے اُس کے ڈھنگ

شوق میں ہمسائیاں اُس کے رہیں ۔۔۔ جو گئی بھی ٹک تو مانگے سے کہیں
پھرنے کو تو پھرتی کیا دلّی نہ تھی ۔۔۔ پر جلے پانوں کی یہ بلّی نہ تھی
رفتہ رفتہ کوٹھوں پر جانے لگی ۔۔۔ پہروں پہروں میں یہ پھر آنے لگی
حاملہ ہو کر کئی بچے دیے ۔۔۔ ایک دو بھی سو نہ ان میں سے جیے
متصل ایسا ہوا جو اتفاق ۔۔۔ مرگ ان بچوں کی گزری سب پہ شاق
حفظ اس کی کوکھ کا لازم ہوا ۔۔۔ جھاڑے پھونکے کا ہر اک عازم ہوا
نذریں مانیں نقش لائے ڈھونڈھ کر ۔۔۔ نیل کے ڈوروں میں باندھے پیٹ پر
چھیچھڑوں پر بعضوں نے افسوں لکھے ۔۔۔ بعضوں نے تعویذ لے کر خوں لکھے
بی بلائی سے بہت کی التجا ۔۔۔ گربۂ محراب سے چاہی دعا
گوشت کی چیلوں کو پھینکیں بوٹیاں ۔۔۔ ماش کی موٹی پکائیں روٹیاں
لڑکیاں بٹھلائیاں کھاٹوں تلے ۔۔۔ اس طرح جوں دبکی بلّی کم ہلے
دیتے ٹکڑا منھ کو ہر اک کھولتے ۔۔۔ اور بولی بلّیوں کی بولتے
صدقے اترے چھیچھڑے جو ڈھیر ڈھیر ۔۔۔ گربۂ لاوہ نے کھائے ہو کے سیر
کیں مناجاتیں دل شب لا تعد ۔۔۔ گربۂ زاہد سے بھی چاہی مدد
بو ہریرہ کے تئیں مانا بہت ۔۔۔ بلیوں کو بھی دیا کھانا بہت
مدح جس بلّی کی کرتا تھا عبید[1] ۔۔۔ تھی دعا گوئی میں وہ بے مکر و شید
خواجہ عصمت کرتے تھے طاعت جہاں ۔۔۔ ایک بلّی بیٹھی تھی آکر وہاں
صبحدم ہوتی وہی گرم سجود ۔۔۔ گہ قیام اس کے تئیں تھا گہ قعود
چاہی ہمت اس سے اُٹھ کر ہر سحر ۔۔۔ کچھ تو باطن نے کیا اُس کے اثر
پانچ بچے اُس نے اس نوبت دیے ۔۔۔ بارے سب وے قدرت حق سے جیے
کیوں نہ ایسی ہووے امداد سترگ ۔۔۔ بی بلائی بو ہریرہ سب بزرگ
اک توجہ رکھتے تھے ظاہر کی اور ۔۔۔ آرزو بر لائے یہ باطن کی زور
اپنی ماں کے رات دن سینے لگے ۔۔۔ پانچوں بچے دودھ کچھ پینے لگے
دودھ کتنا جو کہ بس ہو سب کے تئیں ۔۔۔ میں بھی منگوانے لگا کچھ شب کے تئیں

[1] مراد عبید زاکانی جس کی تصنیف اسی قسم کی موجود ہے جس میں بلی اور چوہوں کا ذکر ہے۔ عبید زاکانی ایک ظریف اور ہزال شاعر تھا۔

دودھ پی کر گائے بکری کا چلے
روز و شب لوگوں کی آنکھوں کے تلے

دیر میں میں نے جو یہ ٹک غور کی
بلّیاں پانچوں ہیں یہ اک طور کی

دو مہینے تک بہت تھی احتیاط
کتے بلّی سب سے موقوف اختلاط

کوئی کتا آگیا ایدھر اگر
لوگ دوڑے شیر سے منھ پھاڑ کر

در سے نکلیں سب ہوئے بازی کے گرم
زرد زرد اُن کی دُمیں منھ نرم نرم

لچھے ریشم کے سے چندیں رنگ خال
کچھ سفید و کچھ سیہ کچھ زرد و لال

آنکلتی تھیں جدھر یہ پانچ چار
وہ طرف ہو جاتی تھی باغ و بہار

ایک عالم عاشق و بیتاب تھا
اُن کی خاطر بے خور و بے خواب تھا

لے گئے ایک ایک کر سب تین تو
مُنّی ، مانی ، رہ گئیں مجھ پاس دو

مُنّی کی پھر ایک صاحب نے پسند
تھی بھی نازک ایسی ہی طالع بلند

مانی کچھ بھاری تھی نکلی برد بار
رہ گئی یاں فقر کو کر اختیار

بوریے پر میرے اُس کی خوابگاہ
دل سے میرے خاص اس کو ایک راہ

میں نہ ہوں تو راہ دیکھے کچھ نہ کھائے
جان پاوے سُن مری آواز پائے

سب سے آن پہونچے در تلک
دیکھے میرے پانوں سے لے سر تلک

آنکھ سے معلوم ہو مشتاق ہے
بلّی یا اعجوبۂ آفاق ہے

بلّیاں ہوتی ہیں اچھی ہر کہیں
یہ تماشا ہے بلّی تو نہیں

گرد رو باندھے تو چہرہ حور کا
چاندنی میں ہو تو بکّا نور کا

گرم شوخی ہو اگر یہ مثل برق
بجلی میں اُس میں نہ کچھ کر سکیے فرق

یا پری اس پردے میں ہے جلوہ گر
اُٹھتی اودھر سے نہیں ہرگز نظر

کیسی ہے بلّی ولایت کی ہو زور
خوب دیکھو تو ہے اُسکے صدقے حور

ربط ہے اپنے بھی جی کو اُسکے ساتھ
بیٹھے ہی تو پیٹھ پر میرا ہے ہاتھ

ایک دن جا کر کہیں ٹک سو گئی
مانی مانی سارے گھر میں ہو گئی

بلّی کا ہوتا نہیں اسلوب یہ
ہے کبودی چشم یک محبوب یہ

دیکھے جسدم یک ذرا کوئی اسکو گھور
چشم شور آفتاب اس دم ہو کور

حسن کیا کیا مانی کے کرے بیاں | ہو جہاں جبتک یہ ہووے درمیاں
خوبی منی کی نہ کوئی کہہ سکے | دیکھے اُس کو تو نہ اُس بن رہ سکے
داغ گلزاری سے اُسکے تازہ باغ | اس زماں تیرہ کی چشم و چراغ
کیا دماغ اعلیٰ طبیعت کیا نفیس | کیا مصاحب بے بدل کیسے جلیس
یہ نفاست یہ لطافت یہ تمیز | آنکھ دوڑے ہے نہ ہو کیسی ہی چیز
اسکو گر کعبے میں یہ ہو شوخ و چست | ہے کبوتر مارنا واں کا درست
چوہا چڑیاں اُن نے کچھ کھایا نہیں | حج کو جانا اُسکے تئیں آیا نہیں
محبِّ ہُرّہ جو کہ ہے ایمان میں | ہے اسی بلّی کی شاید شان میں
تھا بہت منّی کا جنا آرزو | سو جنی دو بلّیاں یہ ماہرو
خال ہیں ان پر بھی ماں کے سے عیاں | پردہ خوبی اور محبوبی کہاں
موہنی اور سوہنی ہے ان کا نام | پھرتی ہیں پھندنا سی دونوں صبح و شام
نیلے دھاگے گردنوں میں ہیں پڑے | لوگ آنکھوںمیں ہی رہتے ہیں کھڑے
حفظ ابھی بلّوں سے انکا ہے ضرور | رہیو ان دونوں سے چشمِ شور دور
دیکھے اُن کی اور جو ٹک کرکے خشم | کاڑھ کر دیں بلیوں کو اس کی چشم
قصہ کوتاہ موہنی آگے موئی | یک قیامت جان پر اس بن ہوئی
صبر بن چارہ نہ تھا آخر کیا | بلّی ماروں میں اُسے گڑوا دیا

شاد وہ جس کے رہیں قائم مقام
وائے اس پر جس کسو کا لیں نہ نام

مثنوی در تعریف سگ و گربہ کہ در خانہ فقیر بودند و باہم ربط داشتند

سگ و گربہ ہیں دو ہمارے ہاں | دو ہیں قالب اور اُن کی ایک ہے جاں
رنگ گربہ سے شیر نر ہے داغ | آنکھیں اس کی اندھیرے گھر کا چراغ
کھائے نہ جو نہ ہو وہ مادۂ سگ | بھوکھا بیٹھا رہے قیامت لگ

کب مروّت سے جائے کھانا چکھ / لڑے بھی ہے تو منھ پہ پنجہ رکھ
سارے ہمسایوں پر ہے یہ معلوم / موش کی نسل ہو گئی معدوم
چوہا کیا ہے جو سامنے آوے / گھونسوں سے بھی یہ شیر بھڑ جاوے
اُن نے جو ماریاں ہیں گھونسیں ٹھونس / موش دشتی ہوا ہے کونے گھونس
گھونس جب فکر ہی میں مرتی ہو / موش دشتی پہ کیا گزرتی ہو
کوئی چھچھوندر جو بستی میں یاں ہے / سو وہ چوہوں کی مرثیہ خاں ہے
ایک دن گھر میں ایک گھونس آئی / اپنے پاؤں اجل اسے لائی
گھونس کیسی بتاؤں غیرت سونس / طاق ہے جسکے آگے طاقت سونس
یا کوئی مادہ خوک آبستن / یا کسو کھوے کی برادر زن
پھرتی پھرتی جو صحن میں خوشحال / پائے دیوار بیٹھی سر کو نکال
کہیں اودھر یہ شیر جاتا تھا / پھیرتا منھ پہ پنجے آتا تھا
پڑگئی اس کی اس پہ چشم کبود / نیلا پیلا ہو تاؤ کھا جوں دود
پنجہ جھنجھلا کے اُن نے گزرانا / بارے کچھ گھونس نے اُسے جانا
پر اُسے خوف جاں نہ آیا کچھ / غالب آیا نہ اُس کا سایہ کچھ
ٹھک ٹھکایا پھر اُن نے جانا تو / کیونکہ تھا یہ تو شیر کا خالو
پھر تو بگڑی ہے دونوں میں آکر / چوٹ ہوتی تھی داؤ پا پاکر
غصہ خرموش کو بھی آن چڑھا / اتفاق اُس جگہ تھا ایک گڑھا
دونوں لڑتے ہوئے گرے اُس میں / کیچ کا گاہتے پھرے اُس میں
ناخن اُس شیر کا کچھ ایک گڑا / شور محشر گڑھے کے بیچ پڑا
شور کیسا محلّے چونک اُٹھے / سگ بازاری بھونک بھونک اُٹھے
یاں تو گھر بیچ کیا ہے کیا ہے پڑی / گھونس بلّی نے چھچھڑے کردی
کھڑے موچھوں کے بال انگڑاتا / شیر نکلا گڑھے سے گھبراتا
لیک جی سے تھا سب بدن خالی / کیونکہ سر سے بلا بڑی ٹالی
گھونس کے وارثوں کی کیا ہے تاب / کہ قدم کو رکھیں وہ حتی الباب

کوئی چھچھوندر اب اس پہ روتی ہے
کہ تری لاش خوار ہوتی ہے

تو جو تھی ساری قوم کی سردار
سو اٹھایا ہے زخم دامن دار

ہم بہت غم میں تیرے روئیں گے
بل کے بل اب خراب ہووینگے

فخر ہے اپنی نسل کا یہ شیر
جن نے گھونسوں کے کردکھائے ڈھیر

سنا ہے موش گربہ کا قصہ
وہ جو ہے عبید کا حصہ

جس کو باندھا عبید زاکانی
لگتی تھی اسکی وہ سگی نانی

گربہ تا بود فاسق و فاجر
ق
صید او یک بُدے سے بسا لاتا

ایں زماں پنج می گیرد
کہ شدہ مومن و مسلمانا

در تعریف مادہ سگ

ہے جو وہ مادہ سگ تماشا ہے
دوڑ پڑنے کے وقت باشا ہے

کسی کے لقمے پہ نہ منھ ڈالا
سگِ اصحاب کہف کی خالا

نہیں کتوں سی خواریاں کے یہ
ہے سگوں میں عزیز خاں کے یہ

دے ہرن کو بھی جلدی میں جُتا
ہے گایاں سگ لوند کیا کتا

اُڑتی چڑیا انھیں نے ماری ہے
استخوان سگِ شکاری ہے

یہ جو غصے میں آوے تو ہے غضب
اسکے مارے ہوئے ہیں ہارے سب

منھ میں دیتے ہیں اسکے جب مشعل
طرفہ دم لابہ کرتی ہے اچپل

منھ میں اپنے لیے فتیلے سے
سگِ لیلےٰ کے ہے قبیلے سے

باہم اس کتے بلّی کا یہ ربط
کوئی دیکھے نہ ہووے اُس سے ضبط

کبھو جاتا جو ہے یہ کوٹھے پر
لگی رہتی ہے اس کی چھت سے نظر

اور سے دشمنی جانی ہے
اسکی یہ باؤلی دِوانی ہے

دونوں شوخی سے مار سہتے ہیں
سگ و گربہ کی چال رہتے ہیں

مرثیہ خروس کہ در خانہ فقیر بود

کئی برس سے ہمارے کنے تھا ایک خروس
خروس عرش کی اولاد سے و لے افسوس

پھرا جو اُس سے یکا یک زمانۂ کج باز
قضا نے اس کو کیا ایک بار مرغ انداز

دیا کرے وہ اذاں دونوں وقت صبح و شام
بجا ہے مرغ مصلّی رکھیں گر اس کا نام

نہیں ہے مرغ چمن میں جہاں کے ایسا آج
برنگ کلہ تاجِ خروس سر پہ تاج

جو بیٹھے چھانھ میں پرواز پر سے مرغ خیال
کھڑا ہو دھوپ میں تو رشک مرغ زریں بال

کبھو جو صحن میں گھر کے وہ اشرف الطیّار
پھرا ہے کیس کو ڈالے تو مرغ آتش خوار

نہ بطخیں ہیں شناگستری میں اس کے مدام
بزر گداشت کریں مرغ سبزوار تمام

رہا ہمیشہ سے وہ مرغ مستعد جنگ
طرف نہ اس کے ہوئے بجگی میں قاز و کلنگ

جب اُن نے گانٹھ کے اک لات حلق پر ماری
شترِ دلی کی شترِ مرغ نے کئی باری

نہ اس کے سامنے کوئی کھڑا رہا مرغا
حواصل اس سے بگڑتا تو تھا وہ کیا مرغا

بجز کنارا نہ سیمرغ کو بنا چارا
کہ فیل مرغ کو بکری کی طرح سے مارا

ہمیشہ گربہ و سگ سے تھی روک ٹوک اُسے
جہاں سے لے گئی آخر یہ نوک جھونک اُسے

خصومت اُسکی تھی یک مادۂ سگ سے شام و سحر
کبھو وہ لات اُسے مارتا کبھو شہپر

قضا جو پہونچی تھی نزدیک وہ بھی جھنجھلائی
حریف ہو کے دلیرانہ سامنے آئی

یہ بھبھا تھا نہ سمجھا ادا کو کینے کی
لگائی سامنے ہوتے ہی ایک سینے کی

ہلائی اُس نے بھی گردن لگی کہیں بیکل
کہ ایک دم میں گئی آہ اس کی گردن ڈھل

جھکا جو خاک کی جانب کو کیس پیچاں کا
زمیں پہ تاج گرا ہدہدِ سلیماں کا

ہوا کے مرغ ہوئے داغ اُسکے ماتم سے
سیاہ پوش رہے طائرِ حرم غم سے

وہاں جو نوحۂ مرغانِ قدس باز ہوا
کہ مرغ قبلہ نما کا بھی دل گداز ہوا

قفس کے مرغ نے سُن ترک آب و دانہ کیا
طیور نے بھی نہ پھر قصد آشیانہ کیا

ہو از بس کہ پراگندہ یہ غم جانسوز
اداس رہنے لگے سارے مرغ دست آموز

خروس عرش ہی اس بن نہیں ہے سینہ فگار
ہزار مرغ کا اب گھر خروس پر ہے بار
زمانہ جب تئیں ہے اُس کے درد کے مارے
رہیں گے خاک فشاں مرغ خانگی سارے
خوش میر تجھی کہ نہیں یہ رنج و تعب
کباب آتش غم میں مرغ و ماہی سب

مثنوی در بیان بز

کہتے ہیں جو غم نداری بز بخر
سو ہی لی میں ایک بکری ڈھونڈھکر
شعر زور طبع سے کہتا ہوں چار
وزدی بزگیری نہیں اپنا شعار
وزد ہے شایستہ خونریزی کا یاں
بلکہ بابت ہے بز آویزی کا یاں
میں پڑھوں ہوں اُسکے آگے شعر گہ
اپنے ہاں گویا بز اخفش ہے یہ
بکروں کی داڑھی کے تئیں جانے ہیں سب
تکہ ریشی بکری کی ہے بوالعجب
رنگ سر سے پاؤں تک اُس کا سیاہ
چکنی ایسی جس پہ کم ٹھہرے نگاہ
چار پٹھاں اُس کے آئے دید میں
دو جہاں ہوتے ہیں دو ہیں جید میں
ایک میں اُن میں سے تھا مطلق نہ شیر
ایک کو کہتے ہیں اندھے خرد و پیر
اسپہ کالے بکرے دو خیلا جنے
ناز نخرے سے رہے پھر انمنے
چارہ بیٹھے کھاتے اک انداز سے
دیتی پٹھہ تو ہوتے خوش اُس ناز سے
دودھ ہو چوچی میں تو بچا پئے
بیٹھا دیکھے اس طرف منھ کو کئے
بھوک سے گرم تظلم وے ہوئے
اپنی شایان ترحم وے ہوئے
دودھ منگوایا کئے بازار سے
پھوہوں سے دینا کیا انفار سے
گھاس دانہ بارے کچھ کھانے لگے
گرتے پڑتے پاس بھی آنے لگے
پرورش سے حق کی بارے جی گئے
آب و دانہ دوڑ کر کھا پی گئے
اب جوانی پر جو ہیں وہ شیر مست
کودتے ہیں ہر زماں ہر دم ہیں جست
مستی اپنی ماں پہ کرتے شاد ہیں
عاقبت بکرے ہی کی اولاد ہیں
زور و قوت سے حریفوں کے ہیں دھینگ
آہوئے جنگی کو دکھلاتے ہیں سینگ

ٹکر ان کی کیا جگر مینڈھا اٹھائے
قوچ سر زن سامنے ہرگز نہ آئے

سر زنی ہیں شہرۂ آفاق ہیں
لوگ بز گدی کے سب مشتاق ہیں

رنگ کو اس جنگ کا کیا ڈھنگ ہے
دیتے ہی میداں کا عرصہ تنگ ہے

ہوتے ہی استادہ طاری ہو غشی
کیا بز کو ہی سے ہو میداں کشی

تمیں ان کی دھاک سن کر مر گیا
غم گوزنوں کو انھوں کا چر گیا

گو وہ ٹکر کھا جو ڈکراتا رہا
بزدلی سے گرگ بھی جاتا رہا

مارے پانی پانی کر بکرے اصیل
لکھنؤ سے غل ہے تا بکرے کی جھیل

پاس جانا اُن کے اب مسدود ہے
ذبح کرنے کو ہر اک موجود ہے

اس ادا سے جائیں گے چھریوں تلے
کاشکے ہوتے نہ ہاتھوں میں پلے

☆☆

ہجویات

مثنوی در بیان مرغ بازاں

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے
گرم پرخاش مرغ یاں پائے

پر و پُرزا درست یکساں ہے
مرغِ تصویر کا بھی حیراں ہے

مرغ ہے ایک ایک جیسے کلنگ
قاز و سارس سے جنگ جس کا ننگ

حوصلہ کس قدر حواصل کا
ذکر کیا کرگسِ شتر دل کا

لات کی گھات کر جو مڑ جاوے
نسرِ طائر کا رنگ اُڑ جاوے

زہرہ ققنس کا اس خطر سے آب
شب نہ سووے ہراس سے سرخاب

بکری سا فیل مرغ کو مارا
کب شتر مرغ سے ہوا چارا

آدمی جو بڑے کہاتے ہیں
مرغ مارے بغل میں آتے ہیں

سُرخہ و سبز وار کے سب مرغ
ہیں ثنا گستر ایسے تھے کب مرغ

ہو جو کیں مرغ خانگی کے تئیں
مت سُن اس ہرزہ چانگی کے تئیں

لات ماری جو کاٹ کر حلقوم
حیدر آباد تک پڑی ہے دھوم

کھا کے سینے کی مدّعی سووے
نسر واقع کا واقعہ ہووے

نے ثنا سے بطیں ہی ہیں تر لب
مُرغ عیسیٰ ہیں مدح خواں ہر شب

ٹمّی کے سر پہ آج ٹیکا ہے
اس کے آگے کنیل پھیکا ہے

کیا عجب ان کی رہگذر کا فرش
ہوں پر افشاں تو ہو خروسِ عرش

اُڑ گیا حلق کا جو لڑتے پوست
کی صدا مرغ ہوست نے ہی دوست

کیس اس رنگ ہوتے ہیں محسوس
جوں گلستاں میں ہوویں تاجِ خروس

شور جنگ آوری کا تا کہسار
کبک کا گھر خروس پر ہے بار

کب ہیں پہلے سے مرغ زرّیں بال
حُسن لاکھے کا سمجھ مُرغِ خیال

کر سکے وصفِ مرغ کیا کوئی
مرغِ آمین کو دعا گوئی

وقر اتنا کہ دیر بچے لیں
جان دے کوئی تخمِ مرغ نہ دیں

مرغ بازوں سے ساز کر دیکھا
در الطاف باز کر دیکھا

رابط رکھا بہت اُنھوں کے ساتھ
ایک پر مرغ کا نہ آیا ہاتھ

مرغ کا مرغ ہووے مرغ انداز
مرغ ایسا ہو تو بجا ہے ناز

یعنی اپنا حریف جب پاوے
پر ہلانے نہ دیوے کھا جاوے

سینہ کیا سینہ بال کیا پرو بال
جیسے چشمِ خروس آنکھیں لال

بازی بدبد کے جب لڑاتے ہیں
کانٹے لوہے کے باندھ لاتے ہیں

آیا حلقوم کے کہ حلق کے پار
پھوٹا چھاتی میں ایک لگ کے دوسار

ہاتھ جس مرغ باز کے تھا وہ
پانی کرنے لگا تر آ کر وہ

کچھ تو ٹھہرا تو دم دیا اُن نے
تعبیہ کر کے رکھ لیا اُن نے

اور جو سُست ہو ہوا تھپلا
دونوں بازو کے پر دیئے پھیلا

دم سے گیا ہو یہ بیدم و مجروح
قصدِ پرواز میں تھا مرغ روح

ہو چکا ہو چکا ہوا یہ شور
ڈھلکی گردن گیا وہ سارا زور

پھیلا پانی میں وہ غمِ جانسوز
دل زدہ پھر ہیں مُرغ دست آموز

جانور رنگ باختہ سب ہیں
یعنی حیران فاختہ سب ہیں

مرغِ قبلہ نما کو وحشت ہے
بال کھولے ہیں پر نہ طاقت ہے

ورنہ اُڑ کر کہیں چلا جاتا
دیر اپنے مقام پر آتا

جمعے منگل کو پالی کی ہے دھوم
گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم

مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش
جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں
سیکڑوں ان سفیہوں کی باتیں

اُن نے پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے
اُن نے کی نوک یہ کڑکنے لگے

وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج
ساتھ اس کے بدلتے ہیں کج دھج

مرغ کی ایک پر فشانی ہے
ان کی صد رنگ بدزبانی ہے

ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ
ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں
لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
یک کے مُنھ میں مرغ کی منقار
ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
مُنھ پہ آیا جو کچھ وہ بکنے لگے
تیکھی نظروں سے سبکو تکنے لگے
طُرفہ ہنگامہ طُرفہ صحبت ہے
بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ
لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ
پھر جو روزِ معیّن آوے گا
نالہ مرغِ سحر سُناوے گا
عالم آوے گا گرد ویسا ہی
گرم ہنگامہ ہوگا ایسا ہی
میر ان کا نہ ہووے گو قائل
مرغِ معنی پہ وہ بھی ہے مائل

مثنوی در ہجو خانۂ خود

کیا لکھوں میر اپنے گھر کا حال
اس خرابے میں میں ہوا پامال
گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دلتنگ یوسفِ جاں ہے
کوچۂ موج سے بھی آنگن تنگ
کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ
چاردیواری سو جگہ سے خم
تر تنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم
لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی
کیا تھمے مینھ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام
اس چکش کا علاج کیا کریے
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے
جانہیں بیٹھنے کو مینھ کے بیچ
ہے چکش سے تمام ایواں کیچ
آنکھیں بھر لاکے یہ کہیں ہیں سب
کیونکہ پردا رہے گا یارب اب
جھاڑ باندھا ہے مینھ نے ذرات
گھر کی دیواریں ہینگی جیسے پات
باؤ میں کانپتی ہیں جو تھر تھر
اُن پہ رڈا رکھے کوئی کیونکر

کیچ لے لے کے جوں توں چھوپا ہے   چھوپا کا ہے کو بلکہ تھوپا ہے
تس کو پھر پرچھتی بھی ہئی نہیں   ٹوٹا اک بوریا سا ڈالو کہیں
ڈھانکو دیوار یا اُٹھا رکھو   یا ہمارے لیے بچھا رکھو
ایک حجرہ جو گھر میں ہے واثق   سو شکستہ تراز دلِ عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک   کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیری ہے خاک
کہیں گھوسوں نے کھود ڈالا ہے   کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا   شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے   کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں   پتھر اپنی جگہہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے   جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے
رکھ کے دیوار ایدھر اودھر سے   لا کے یارب بتاؤں کس گھر سے
چارپائی جب اس میں بچھوائی   پہلے چلپاسہ ہی نظر آئی
سام ابرص کہ ہے دوائے خُراج   ہر جگہہ یاں سے نمایاں آج
پیکر اپنی خدا نے رکھی ہے   ڈانس ایک ایک جیسے مکھی ہے
آگے اُس حجرے کے ہے اک ایوان   وہی اس تنگ خلق کا ہے مکان
کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ   اُس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھو کوئی سنپولیا ہے پھرے   کبھی چھت سے ہزار پائے گرے
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے   کوئی داسا کہیں سے چھوٹا ہے
دیکھے مرنا ہمیشہ مد نظر   گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر
مٹی تو وہ جو ڈالی چھت پر ہم   تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم
مضطرب ہوکے جو بچھائی بہت   ہر کڑی نے کڑی اُٹھائی بہت
پرے اس مینھ میں کرختی ہے   تختے تختا ہوئے یہ تختی ہے
ہوئیں اڑدا ڑیں پھر جو حد سے زیاد   چل ستوں سے مکان دے ہے یاد
اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر   گرتی جاتی ہے ہولے ہولے منڈیر

جیتے ہیں جتلک نہیں پہونچے ورنہ کیا بس ہے جو یہیں پہونچے

کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال پدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال

طوطا مینا تو ایک بابت ہے پودنا پُھدکے تو قیامت ہے

کیونکہ ساون کٹے گا اب کی بار تھر تھراوے بھنبھیری سی دیوار

ہو گیا ہے جو اتفاق ایسا شاق گزرے ہے کیا کہوں کیسا

ہو کے مضطر لگے ہیں کہنے سب اُڑ بھنبھیری کہ ساون آیا اب

تیتری یاں کوئی جو آتی ہے جانِ محزوں نکل ہی جاتی ہے

نہیں دیوار کا یہ اچھا ڈھنگ کہیں کھسکی تو ہے قیامت ننگ

ایک دن ایک کوّا آبیٹھا بگماں جیسے ہوّا آبیٹھا

چیل سے لوگ دوڑے کرتے شور کہ نہ حایط میں کچھ رہا تھا زور

ہو نہ ایسا کہ اپنی چال چلے دوڑے اچھلے کہ ہال ہال چلے

نہیں وہ زاغ چار پاؤں پھرا ایک کالا پہاڑ آن گرا

مٹی اس کی کہیں کہیں بھسکی جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی

سان کر خاک لگ گئے دو چار بارے جلدی درست کی دیوار

اچھے ہوں گے کھنڈر بھی اس گھر سے برسے ہے اک خرابی گھر در سے

اُکھڑے پکھڑے کواڑ ٹوٹی وصید زلفے زنجیر ایک کہنہ حدید

خاک لوہے، کو جیسے کھادے پاک چھیڑ لیجے تو پھر نری ہے خاک

بند رکھتا ہوں در جو گھر میں رہوں قدر کیا گھر کی جبکہ میں ہی نہ ہوں

گھر بھی پھر ایسا جیسا ہے مذکور ہے خرابی سے شہر میں مشہور

جس سے پوچھوا سے بتادے شتاب ساری بستی میں ہے یہی تو خراب

ایک چھپّر ہے شہرہ دلّی کا جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا

بانس کی جا دیے تھے سر کنڈے سووے مینہوں میں سب ہوئے ٹھنڈے

گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب

مینھ میں کیوں نہ بھیگئے یکسر پھونس تو بھی نہیں ہے چھپّر پر

مٹی ہوکر گرا ہے سب والا
وہ رہے ہاں جو ہووے ڈھب والا

واں پہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا
یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا

حال کس کو ہے اولتی کا یاد
مگری اس جھگڑے میں گئی برباد

کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا
کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا

ٹپکے دو چار جا تو بند کروں
بیچ کوئی لڑاؤں فند کروں

یاں تو جھانکے ہزار میں تنہا
کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا

بسکہ بد رنگ ٹپکے ہے پانی
کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی

کوئی جانے کہ ہولی کھیلا ہوں
کوئی سمجھے ہے یہ کہ خیلا ہوں

مجھ سے کیا واقعی ہوا چارا
آسماں جو پھٹے تو کیا چارا

بان جھینگر تمام چاٹ گئے
بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

تنکے جاندار ہیں جو بیش و کم
تن پہ چڑیوں کو جنگ ہے باہم

ایک کھینچے ہے چونچ سے کرزور
ایک مگری پہ کررہی ہے شور

پوچھ مت زندگانی کیسی ہے
ایسے چھپّر کی ایسی تیسی ہے

کیا کہوں جو جفا چکش سے سہی
چارپائی ہمیشہ سر پہ رہی

بوریا پھیل کر بچھا نہ کبھو
کونے ہی میں کھڑا رہا یکسو

ڈیوڑھی کی ہے یہ خوبی در ایسا
چھپر اس چونچلے کا گھر ایسا

جنس اعلیٰ کوئی کھٹولا کھاٹ
پائے پٹی رہے ہیں جن کے پھاٹ

کھٹملوں سے سیاہ ہے سو بھی
چین پڑتا نہیں ہے شبکو بھی

شب بچھونا جو میں بچھاتا ہوں
سر پہ روز سیاہ لاتا ہوں

کیڑا ایک ایک پھر مکوڑا ہے
سانجھ سے کھانے ہی کو دوڑا ہے

ایک چٹکی میں ایک چھنگلی پر
ایک انگوٹھا دکھا دے انگلی پر

گرچہ بہتوں کو میں مسل مارا
پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ہاتھ تکیے پہ گہہ بچھونے پر
گبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلایا جو پائنتی کے اور
وہیں مسلا کر ایڑیوں کا زور

تو شک ان رگڑوں ہی میں سب پھاٹی
ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑتے جھاڑتے گیا سب بان
ساری کھاٹوں کی چولیں نکلی ندان

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو
پائے پٹی لگائے کونے کو

جب نہ تب پنڈے پر لیے پائے
سیتلا کے سے دانے مرجھائے

سو یہ تنہا نہ بان میں کھٹمل
آنکھ منھ ناک کان میں کھٹمل

کہیں پھڑکا کہ جی سے تاب گئی
آنکھ سے تاپگاہ خواب گئی

ایک ہتیلی پہ ایک گھائی میں
سیکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ کہیے
کب تلک یو ٹٹولتے رہیے

یہ جو بارش ہوئی تو آخر کار
اس میں سی سالہ وہ گری دیوار

آہ کھینچی خرابی کیا کیا نہ
تھے جو ہمسائے وے ہیں ہمخانہ

ایسے ہوتے ہیں گھر میں تو بیٹھے
جیسے رستے میں کوئی ہو بیٹھے

دو طرف سے تھا کتوں کا رستا
کاش جنگل میں جا کے میں بستا

ہو گھڑی دو گھڑی تو دتکاروں
ایک دو کتے ہو تو میں ماروں

چار جاتے ہیں چار آتے ہیں
چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز
کتوں کا سا کہاں سے لاؤں مغز

وہ جو ایواں تھا حجرے کے آگے
اسکے اجزا بکھرنے سب لاگے

کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا
پانی جُو جُو میں اُس کے بیٹھ گیا

کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا
ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا

میں تو حیران کار تھا اپنا
کوئی اُس دم نہ یار تھا اپنا

اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر
خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر

چرخ کی کجروی نے پیسا تھا
پر خدا میرا مجھ سے سیدھا تھا

کتنے اک لوگ اسطرف دھائے
یا ملک آسمان سے آئے

مٹی لے لے گئے دو ہاتھوں میں
کام نے شکل پکڑی باتوں میں

صورت اس لڑکے کی نظر آئی
ہم جو مردے تھے جان سی پائی

آنکھ کھولی اِدھر اُدھر دیکھا — اس خرابی کو بھر نظر دیکھا
قدرت حق دکھائی دی آکر — یعنی نکلا درست وہ گوہر
داشت کی کوٹھی میں لا رکھا — گھر کا غم طاق پر اُٹھا رکھا
مومیائی کھلائی کچھ بلدی — فرصت اُس کو خدا نے دی جلدی
غم ہوا سُن کے دوستداروں کو — پھر بندھا یہ خیال یاروں کو
کہ مری بود و باش یاں نہ رہے — گو تصرف میں یہ مکاں نہ رہے
شہر میں جا بہم نہ پہونچی کہیں — چار نا چار پھر رہا میں وہیں
اب وہی گھر ہے بے سروسایہ — اور میں ہوں وہی فرومایہ
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس — خواب راحت یاں سے سو سو کوس
قصہ کوتہ دن اپنے کھوتا ہوں — رات کے وقت گھر میں ہوتا ہوں

نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا
گھر ہے کا نام ہے گھر کا

مثنوی در ہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود

جسم خاکی میں جس طرح جاں ہے — اس خانہ ہم پہ زنداں ہے
ظلمتیں اس کی سب پہ روشن ہیں — زندہ در گور ہم کئی تن ہیں
ہے جو سر کوب اک بڑی دیوار — واں سے جھانکو تو ہے اندھیرا غار
بخت بد دیکھ سارے پرنالے — اس کے معمار نے اُدھر ڈھالے
اب جو آیا ہے موسم برسات — دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
صحن میں آب نیزہ بالا ہے — کوچۂ موج ہے کہ نالا ہے
مینھ میں گھر کے پانچ چھ چھپّر — ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
پر تنک تنکے تھے کچھ ایک نئے — سو وے چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احساں مند — کہ جنھوں نے کیے ہیں جھانکے بند

پھوس کچھ ہے کہیں سو آتا ہے
بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے

اُڑ گئی گھاس مٹی ہے والا
ہے جو بندھن سو مکڑی کا جالا

اپنے بندھن سے جو کہ چھوٹا ہے
ہم پہ گویا وہ بانس ٹوٹا ہے

کیا کہوں آہ گھر ہے رہنے کو
باندھتا ہوں مچان رہنے کو

بند جھانکوں کو کیجیے تا کے
یاں تو آسمان ٹوٹا ہے

ٹھیکے دینے کو جا اڑے ہیں ہم
سر پہ چھتر لیے کھڑے ہیں ہم

ٹٹیاں تھیں جو آگے چھپّر کے
بہتی پھرتی ہیں صحن میں گھر کے

تا گلے سب کھڑے ہیں پانی میں
خاک ہے ایسی زندگانی میں

ابتو اپنا بھی حال ہے بدتر
سر پہ گھڑی ہے تپہ ہے چھپّر

پانی بہ کر جھکا جو ہے دالان
سر پہ رہتا ہے طرۂ ایوان

چاک اس ڈول سے ہے ہر دیوار
جیسے چھاتی ہو عاشقوں کی فگار

متصل ٹپکے ہے نہ باراں ہے
گریۂ زار سوگواراں ہے

گھر کی صورت جو اور ہوتی ہے
چھت بھی بے اختیار روتی ہے

مینھ یکبارگی جو ٹوٹ پڑا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا

داسے پایان کار ٹوٹ گئے
طاقچے بھر رہے تھے پھوٹ گئے

بہ گئے گولے تختے ڈوب گئے
غرض اجزائے سقف خوب گئے

موج خشتی ستون میں پیٹھی
جان غمناک خون میں بیٹھی

لے گیا پیچ و تاب پانی کا
کوٹھری تھی حباب پانی کا

یوں دھنسا گھر کہ بار خاطر تھا
آہ کس کا غبار خاطر تھا

اُکھڑی دہلیز سب منڈیر گری
لہر پانی کی جھاڑ دیتی پھری

ساری بنیاد پانی نے کاٹی
اینٹ کے گھر کو کردیا ماٹی

جھک گئے سب ستون در بیٹھا
وہی چھپّر کھڑا ہے گھر بیٹھا

جب اجارے پہ آکے چھت ٹھہری
ہم سبھوں میں یہ مصلحت ٹھہری

آؤ اب چھوڑ کر یہ گھر نکلیں
کسو ٹٹی پہ بیٹھ کر نکلیں

دبکے مرنے سے ڈوب مرنا خوب — ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب

سنکے ہر اک کے جی میں در آیا — خاطروں میں یہ حرف ٹھہرایا

گٹھری کپڑوں کی میں اٹھائی تھی — سر پہ بھائی کے چارپائی تھی

بوجھ کپڑوں کا جن نے باندھا تھا — اس کا سارا فگار کاندھا تھا

ساتھ کوئی چراغ لے نکلا — کوئی سر پر اجاغ لے نکلا

چھاج کی کرکے کوئی اوٹ چلا — مینھ کے مارے کوئی لوٹ چلا

منھ پہ چھلنے کو ایک نے رویا — ایک نے سر کی کا کیا گھوپا

ایک نے چھینکے حال حال لئے — پائے پٹی گلے میں ڈال لیے

ایک نے بوریا لپیٹ لیا — اور پایا جو کچھ سمیٹ لیا

اپنا اسباب گھر سے ہم لے کر — الگنی سب کے ہاتھ میں دے کر

صف کی صف نکلی اس خرابی سے — تا کہ پہونچیں کہیں شتابی سے

میر جی اس طرح سے آتے ہیں — جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

جن نے اس وقت آنکھ کو کھولا — ہنسکے بے اختیار وہ بولا

سنکے اس بات کو نرائے ہم — بارے اک بھائی کے گھر آئے ہم

تب سے رہنے کو اب تلک ہیں خراب — نہیں ملتا ہے گھر بقدر حباب

جس میں خوش یکنفس معاش کریں
طور پر اپنے بود و باش کریں

مثنوی در مذمت برشکال کہ باراں دراں سال بسیار شدہ بود

کیا کہوں اب کی کیسی ہے برسات — جوش باراں سے بہہ گئی ہے بات

بوند تھمتی نہیں ہے اب کی سال — چرخ گویا ہے آب در غربال

وہی یکساں اندھیر برسے ہے — آسماں چشم وا کو ترسے ہے

ماہ و خورشید اب نکلتے نہیں — تارے ڈوبے ہوئے اچھلتے نہیں

آب میں* کوئی بولتا ہی نہیں
آسماں دیدہ کھولتا ہی نہیں

چرخ تک ہو گیا ہے پانی جو
ماہ و ماہی ہیں ایک جا ہر دو

لے زمیں سے ہے تا فلک غرقاب
چشمۂ آفتاب ہیں گرداب

خشک بن اب کی بار سبز ہوئے
موش دشتی کے خار سبز ہوئے

ابر کس کس سیاہ مستی سے
ہوتے جا ہیں بلند و پستی سے

لڑکوں نے کی زمانہ سازی ہے
خاک بازی اب بازی ہے

ابر کرتا ہے قطرہ افشانی
یاں پانی رہے ہے بارانی

تنگ آبی سے جان مست اغراق
ڈوبنے پر ہے کشتی آفاق

عقل مینھوں نے سب کی کھوئی ہے
بات باراں نے یاں ڈبوئی ہے

کیسا طوفانِ مینھ چھایا ہے
زخم دل نے بھی آب اُٹھایا ہے

بیٹھے اٹھتے نہیں ہیں بام و در
یہ خرابی ہے شہر کے اندر

سقف آماج بوند پیکاں ہے
مینھ ہے یا کہ تیر باراں ہے

جیسے دریا اُبلتے دیکھے ہیں
یاں سو پرنالے چلتے دیکھے ہیں

ابر رحمت یا کہ زحمت ہے
ایک عالم غریق رحمت ہے

لے گئے ہیں جہان کو سیلاب
نقشہ عالم کا نقش تھا بر آب

نہ ہے جلسہ نہ ربط باراں ہے
شہر میں ہے تو باد و باراں ہے

روز و شب یاں ہمیشہ جھمکا ہے
اندنوں رنگ برق چمکا ہے

بڑی بوندوں کی چوٹ سے ڈریے
سنگباراں جہاں ہو واں مریے

پڑھتے ہیں یار درس حیرانی
آرسی کے بھی گھر میں ہے پانی

آدمی ہیں سو کب نکلتے ہیں
مردم آبی پھرتے چلتے ہیں

کتے ڈوبے گئے کہاں ہیں اب
سگِ آبی ہی ہیں جہاں ہیں اب

وسعتِ آب پوچھ مت کچھ یار
کوچے موجوں کے ہوگئے بازار

معبد اب سارے گرتے آتے ہیں
زاہد خشک ڈوبے جاتے ہیں

تھا ٹھہرنا برابر ان کے شاق
مسجدوں میں کیا ہے استغراق

مینھ تو یاں اب لگے ہی رہتے ہیں — سارے عالم کے کان بہتے ہیں
غرق ہے چڑیا اور گلہری ہے — خشکی کا جانور بھی بحری ہے
مینھ از بسکہ بہہا ہے گا — اک جہاں کو ڈبو رہا ہے گا
شعر کی بحر میں بھی ہے پانی — بہتی پھرتی ہے اب غزلخوانی
لائی پارندگی کی چالاکی — آب خشک گہر پہ نمناکی
ہے زراعت جو پانی نے ماری — ہوگئی آبخست ترکاری
آب ہے گا جہاں کے سر تا سر — خوف سے سوکھتا ہے میوۂ تر
مست ہو ہوگئے ہیں مست شراب — غوطے کھاتے پھرتے ہیں عالم آب
مستی ہے اب جو چاہیں سیر آبی — بط ہے تو ہوئی ہے مرغابی[1]
دستِ غم اس قدر بہ طغیاں ہے — کہ ہر اک گوشہ بیچ طوفاں ہے
سیل دیکھے ہے کوہ سار ان کی — لیے کشتی گدا ہیں بار ان کی
جزر و مد جس کا تا فلک جا ہے — جو ہے تالاب قہر دریا ہے
ہر طرف ہیں نظر میں ابر سیاہ — پانی ہے جس طرف کو کریے نگاہ
سیلہا اور رکاب دیدۂ ماست — چشم تا کار میکند دریاست
پانی عالم کے تا بسر ہے گا — خشک مغزوں کا مغز تر ہے گا
خضر کیونکر کے زیست کرتا ہے — آب حیواں میں پانی مرتا ہے

لکھے کیا میر مینھ کی طغیانی
ہوگئی ہے سیاہی بھی پانی

مثنوی در ہجو نا اہل مسمّی بہ زبان زد عالم

سنیو اے اہل سخن بعد از سلام — چھیڑتا ہے مجکو اک تخم حرام
پر نہیں مرغی کا گرم طیر ہے — وہم میں شہباز کا ہم سیر ہے
کام مجکو کچھ نہیں ہے اور سے — بلکہ اس بھی طرز سے اس طور سے

[1] دو شعر یہاں سے حذف کیے گئے

شاعری کو میری ہو گے جانتے — تم چنانچہ سب مجھے ہو مانتے
میں ہمیشہ سے رہا ہوں باوقار — کن دنوں تھا ہجو کا کرنا شعار
گر کنھوں نے کچھ کہا میں چپ رہا — ہجو اس کی ہوگئی اس کا کہا
کیا ہوا اگر چاند پر پھینکے ہیں خاک — پڑتی ہے اُن سب کے منھ پر میں ہوں پاک
رہیو شاید کچھ نہیں میرا گناہ — مدعی بے ہیچ ہے یہ روسیاہ
تھا تحمل مجھ کو میں درویش تھا — درد مند عاشق و دلریش تھا
پر کروں کیا لاعلاجی سے ہے اب — غصے کے مارے چڑھی ہے مجکو تب
ایسے کتنے ہیں جو اب شاعر بنے — مدتوں یہ لونڈے آئے مجھ کنے
ایک باتوں سے مری آدم ہو — اک نظر سے شہرۂ عالم ہو
ایک نے دیواں کی میرے نقل لی — اس دوانے کی کنھوں نے عقل لی
ایک میرے طرز پر کہنے لگا — دوسرا پیرو مرا رہنے لگا
سارے عالم میں ہوں میں چھایا ہوا — مستند ہے میرا فرمایا ہوا
دور سے کرتا ہوں بیٹھا سب کی دید — کوئی سر کھینچو ہے میرا مستفید
کوئی بے تہ گو نہ جانے میری قدر — پائیں ہیں پائین آخر صدر صدر
ہے گی شخصیت خدا کی اور سے — ہاتھ کب آوے بزرگی زور سے
ایک لچا دے جو اک عمدہ کو بھوگ — تو اُسے کیا کچھ طرف جائینگے لوگ
جو بڑے ہیں وے ہی آخر ہیں بڑے — ایسے لچے بہت پھرتے ہیں پڑے
شہر میں آیا میں بعد از بست سال — گم تھا یاں سر رشتۂ قال و مقال
کسب جو کرتے تھے یہ فن شریف — ان میں سے کوئی نہ تھا میرا حریف
کتنے اک نو مشق تھے گرم سخن — سو بچارے آپ ہی ناآگاہ فن
مدعی میرا ہوا یہ بے ہنر — مردۂ صد سال سا بے نور تر
کاسہ لیس مایۂ خبث و حسود — قلیۂ دہ روز سے بھی بد نمود
آتے اچھا ہے جو اس کو روک دو — ورنہ منھ دیکھو تو وہ ہیں اوک دو
باپ اُس کا سخت ناداں نادرست — کوڑی کی سی گندگی بلی قاق وسُست

ایک جا آیا شتر قد گھر گیا
واں شتر غمزہ سا مجھ سے کر گیا

رہ گیا میں پی کے لوہو کا سا گھونٹ
یعنی دیکھوں بیٹھے ہے کس کل یہ اونٹ

اس تحمل پر نہ کی مطلق نظر
خار پہلو کا ہوا ہر جا لچر

جب لگا ہے ناچنے مستی سے خوب
تب لیا میں نے قلم کے زیر چوب

مستی اُسکی ساری اب جھڑ جائے گی
دھوم ساری گلیوں میں پڑ جائے گی

جب بڑوں سے مار ناہموار کھائیں
کج خرامی سے تب اپنی باز آئیں

راہ سیدھا ہو کے چلتا ہے بلے
اونٹ جب آیا پہاڑوں کے تلے

اونٹ کی خلقت پہ ہے قدرت کو ناز
اسکی خلقت کم ہے کیا اے بے نیاز

ہیئت اُس کی مضحکہ ہے سوانگ ہے
جید عوج بن عنق کی ٹانگ ہے

سر کے تئیں اُسکے جو دیکھوں کر نگاہ
بانس پر ایک اوندھی ہانڈی ہے سیاہ

تیرہ رو مضحک سراپا زور ہے
دُم اگر ہووے تو پھر لنگور ہے

شکل و صورت دیکھ کر حیراں رہو
بیگماں سب مل کے لگ لگ ہی کہو

بیٹھے تو بیٹھا ہے گویا بو تیمار
آتے جاتے جاویں اس کو جوتے مار

چال جب چلنے لگے سر جھاڑ کر
پائوں کو پہلے رکھے مُنھ پھاڑ کر

بال و پر رکھتا نہیں بے پاؤ سر
ورنہ تھا یہ بھی عجائب جانور

ایک دن بیٹھے تھے یاں ذاتِ شریف
وارد اُس دن ہوگئے کتنے ظریف

ایک بولا دیکھ کر حیران ہو
یہ جزائر کا کوئی حیوان ہو

یاں تو ایسا جانور دیکھا نہیں
سر کہیں ہے پائوں اس کے ہیں کہیں

ایک کے آیا مکوڑا وہم میں
ایک کے مور سواری فہم میں

ایک نے ہنس کر دیا اُس کو ڈھکیل
اور بولا تیری قدرت کے کھیل

کیسا اعجوبہ نیا پہونچا ہے یاں
چونچ ہو تو ہے شتر مرغِ کلاں

ایک بولا کر کے چشمک میری اور
واہ صاحب جانور پالا ہے زور

ایک دن باہر تو ہو لیکر کھڑے
یہ اچنبھے یوں نہیں رہتے پڑے

جائے اُس وحشی کا ٹک وسواس بھی
چوک بھی ہے پاس یہ نسناس بھی

اسکو یاروں نے غرض کیا کیا کہا
لیک یہ خرنا مشخص ہی رہا

یہ جو ہے موشک دوان و شور چشم
موشدہ شتی چہرہ و شبکور چشم

بے سبب سر گرم کیں ہمسے ہوا
مستحقِ لعنتِ عالم ہوا

چل قلم اب ہے ارادہ جنگ کا
پاس کہتک کیجئے نام و ننگ کا

یاں زبردستوں کو دعوٰی کھا گیا
یہ چھپا رستم کہاں سے آگیا

تا قباحت فہم کو دعوٰی بڑا
ہو کے تنکا سا پہاڑوں سے اڑا

ہاتھی کی ٹکر کو ہاتھی ہی اٹھائے
چیونٹیوں کا جگر جو منھ پہ آئے

جنگ ہاتھی کی ہو گو اُس کو ہوس
پر اُسے ہی موت کا ریلا ہی بس

ایک دھکے میں کہاں وہ کامنی
پودنے کی سی ہے اُس کی ضامنی

میں نے پاس اس کا کیا حد سے زیاد
پر کمی کرتا ہے یہ ابن زیاد

قبلہ کہتے کہتے حاجی ہو گیا
پاس ظاہر چھوڑ پاجی ہو گیا

رشک شہرت سے مری مرنے لگا
میری عزت کا حسد کرنے لگا

لگ گئی چپ اُس کو میرے شور سے
یہ نہ سمجھا ہے خدا کی اور سے

یہ قبول خاطر لطف سخن
دے ہے کب سب کو خدائے ذوالمنن

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز وطور
اب چنانچہ میر مرزا کا ہے دور

خصمی وہ کرلئے کہ ہو معقول خلق
نے انھوں سے جو کہ ہو مقبول خلق

دشمنی تھی اُس کو مجھ سے کیا ضرور
حیف ایسی عقل لعنت یہ شعور

ہوں جو میں پر تو فگن تو ہے یہ کیا
خور کے آگے ذرہ کب ٹھہرا رہا

خون دل آشام ہیں جو صبح و شام
دے بھی لیتے ہیں ادب سے میرا نام

یہ مری رہ کا نہ حائل ہو سکے
یہ موئی جوں کیا مقابل ہو سکے

میں نے اُلٹی اجگروں کی دم میں صف
ادھ موئی سے چھپکلی کیا ہو طرف

رکھتی ہے میری شرافت اشتہار
گو یہ ناسید کہے ہے کیا چمار

ہجو کی جو اُن نے میں کیا دب گیا
بھونکنے پر سگ کے ہاتھی کب گیا

ننگ ہے میری توجہ اس طرف
حیف ہے میلانِ دریا سوئے کف

دارو دتی سے ہے اُسکے مجکو شرم
تب تو میں باتیں کروں ہوں نرم نرم

ان عزیزوں کا نہایت پاس ہے
ورنہ یہ ملعون کیا کناس ہے

جو نہ سمجھا تیغ خامے کی ہے پاس
کاٹوں گا یوں جس طرح کٹتی ہے گھاس

جب سے لے آیا قدم اپنا یہ شوم
تب سے ویراں ہو گئی یہ مرز بوم

ایک بد یمنی ہی ہے گی بوم میں
لطف وہ پاتے ہیں ہم اس شوم میں

دیدنی ہے قدرت ربّ و دود
ایسی اچرچ کم ہی ہوتی ہے نمود

کیا کمی ہے یہ جو عزت کم کرے
گو نہ شیطاں سجدۂ آدم کرے

کرتی ہے تعظیم میری کائنات
لعنت اس پہ ہوتی ہے دن اور رات

یا بلا ہے یہ کج.....گزک
میرے دتکارے گئے چھیڑے دبک

میری ہیبت سے نکل جاتا ہے موت
دشمنی کی اُن نے اپنی ما..........

بیت کہنا چاہتا ہے سو ہنر
شاعری سمجھا تھا کیا خالہ کا گھر

نا مبارک ہی نہیں سادہ بھی ہے
الّو ہے اور الّو کی مادہ بھی ہے

عقل سے کس طرح ہووے بہرہ ور
ہے کسو حافظ کا نطفہ پاچہ خر

پر وہ حافظ جو ہو قرآں خوان قبر
اس سے لیں کارِ تلاوت گو بہ جبر

جھڑ گیا ہووے دماغ اُس کا تمام
پڑھتے پڑھتے شور سے ہر صبح و شام

وہ خرف جورو سے جا یک جا ہوا
ایسا اُلّو ماخرا پیدا ہوا

دیکھ کر اُن کے خرامی ہائے سرد
ایک کوّے نے کی تقلید قدرد

کود کر چلنے لگا آخر کو راہ
اپنی بھی رفتار بھولا رو سیاہ

کاشکے ہوویں محذور شیخ و شاب
چھوٹے سے منھ جو پکارے کیا ہے باب

گو کہ یہ پھُس کرے کیا مال ہے
آگے میرے ......کا سا بال ہے

چاہوں گا جب پھینک ہی دونگا اُکھاڑ
ایسی ...... سیکڑوں ڈالی ہیں جھاڑ

بد نمائی اُس کی ہے بیساختہ
کیا ہے یاں میش بچہ انداختہ

دیکھ اسے یاد آوے قدرت کاملہ
کیا بلا ہے مادہ خوک حاملہ

گرگ گردن خوک چشم و غوک سر
غول صحرائی کا بچہ ہے مگر

چار سکھیاں کہہ کے شاعر ہو گیا
اس فن مشکل کا ماہر ہوگیا

باپ کو اُن نے بنا رکھا ہے اُوت
ہیں کہاں ایسے سعادت مند پوت

کم ہو ہے گا جو اُس کا زور پا
جانتا ہے اس کو پیری کا عصا

کچھ نہیں معلوم اس کو سرکار
تب تو ٹھہرایا ہے اس کو رازدار

اس زنا زادے نے جو لب وا کیا
پہلے ماں کا راز ہی رسوا کیا

ایک ہی شب کے تئیں جلوا دیے
یار ماں کے باپ کو دکھلا دیے

پھر حقیقی باپ سے جا کر ملا
اس مجازی کا کیا اس سے گلا

پیسے اس کے کھا کے جب کٹا ہوا
یاں کسی تقریب آ پیدا ہوا

تب سے روز و شب اسی کے ساتھ ہے
اس خرف کی داڑھی اُس کے ہاتھ ہے

بس قلم نفریں ہے میری بس اُسے
ہے دماغ بحث پاجی اب کسے

رکھ زباں کیدھر گیا تیرا مزاج
پوچ گو بہتیرے پھرتے ہیں پواج

ہجو عاقل نام نا کسے کہ بسگاں انسے تمام داشت

اک جو لچر رزق کی وسعت سی ہو گئی
تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہو گئی

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش
چیچڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی طبع و لطافت وہ بر طرف
کتا بغل میں مارے لگا پھرنے ہر طرف

دتکارو کتے کو تو لہو اپنا وہ پیے
ہے اس کی استخواں شکنی کتوں کے لیے

یا جھوٹے ہاتھ کتے کو مارا نہ تھا کبھی
یا کتوں سے چٹایا ہے اب اپنے منہ کو بھی

کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں
کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں

آیا جو ایک روز وہ بے تہ چلا ہوا
کتا ازار اس کے سے نکلا بندھا ہوا

یک سگ گزیدہ کی سی طرح جھومنے لگا
پھر کھول اس کے منہ کے تئیں چومنے لگا

ایسی بھی ہم نے دیکھی نہیں کتوں کی ہوس
گردن میں اپنے ڈالے پھرے روز و شب مرس[1]

[1] مرس ۔ رسی

ٹکڑا ہو جس کے ہاتھ میں یہ اُس کا یار ہے
جیسے سگ سرائے سگِ ہر سوار ہے

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا
دھوبی کا کتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

تھکتا ہے پھر جو کرتے ہوئے دوڑا اور دھیاڑ
لیتا ہے بے دماغ ہو لوگوں کے کپڑے پھاڑ

جو ہڈیوں پہ لڑتا رہا ہو بسانِ سگ
ہو آدمیت اس کو بھلا کس مقام لگ

انساں کو انس کتے سے اتنا ہوا ہے کب
ناپاک اس کو جانیں ہیں پاکیزہ لوگ سب

اصحاب کہف کا بھی جو سگ ہو تو ہے وہ سگ
نجم الدیں کے بھی کتے کو کتا کہے ہے جگ

گر سگ تخلص اپنا جو آیا بروئے کار
اکراہ سگ لوند سے کرنے لگا دیار

رہتے نہیں نفور تو سگبان بے شعور
کھاتے میں وہ بھی کہتے ہیں کتے کو دور دور

کیا جانئے کہ یہ گہہ و سگ کیا متاع ہے
بازار میں جو دیکھے ہے سگ کو سماع ہے

آدم گری اڑا رکھی حرف و سخن گیا
دیکھا جو خوب تو سگ دیوانہ بن گیا

دم لابہ جو دبے تو لگے کرنے بد خصال
دوڑے وگرنہ کاٹنے کو کتے کی مثال

کمبخت یہ غریب جو مردہ سا پائے یہ
مرگھٹ کے کتے کی سی طرح پھاڑ کھائے یہ

در مدعی ہو ٹک بھی قوی دل قوی نصیب
پھر آگے اُس کے سوکھی سی بلّی ہے یہ غریب

رہتا ہے سخت شیفتہ کتوں کے بال کا
پلّا یہ ہے کہے تو کسی کتے وال کا

کتوں کی لے کے زرد و سیاہ و سپید پشم
کس کس طرح سے دیکھتا ہے داب داب چشم

کتوں کے شوق میں جو یہ آتش ہے زیر پا
کہنا ہے اس کو اب سگ پا سوختہ بجا

اسکی پلیدی شہرۂ ہر شہر ہی رہی
کتے کے کاٹے کی سی اسے لہر ہی رہی

دلی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں
ہمسایوں کی جنھوں کے لیے کھائیں گالیاں

وہ مر گئیں تو دیر رہا روتا غمزدہ
پشتی کے پیچھے پھر نہ ہنسا ٹک ستمزدہ

لونگی کا گرم غم جو رہا سوکھ نخ ہوا
برنی کی تعزیت میں سگ روے چخ ہوا

بلّی جو پالتا تو بھلا ایک بات تھی
آئین میں اسکی دوستی ایماں کے ساتھ تھی

توراں کے لوگ ہوویں کہ ہوں اہل اصفہان
کتا تو کشتنی ہے سب اسلامیوں کے ہاں

جسکو خدا خراب کرے پھر وہ کیا کرے
کیونکر زباں نکالے نہ جوں سگ پھرا کرے

آواز دے دے کتوں کو توڑے ہے اپنی جان
مرجائے گا یہ بھونکتے ہی بھونکتے نداں

ہے بسکہ سگ پرست مرے گا جو یہ ولی
توشے میں اس کے ہوگا نہ کچھ غیر سگ کنی

کتوں کے پیچھے پھرتا ہے گلیوں میں دور ہو
یہ سب ہے اس لئے کہ ہر اک جائے شور ہو

اس وضع ساختہ کے ہوں احمق فریفتہ
بہرہ ہے جنکو عقل سے وے کیوں ہوں شیفتہ

ہے اس طرح کہ معرکہ گیروں سے پُر جہاں
بہتیرے ایسے کتے نچاتے پھرے ہیں یاں

مثنوی مسمّٰی بہ تنبیہ الجہال

صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف
کسب کرتے جنکی طبعیں تھیں لطیف

تھے تمیز درمیاں انصاف تھا
خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا

دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو
کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو

تھے جو اس ایام میں اُستاد فن
ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن

پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دیں
کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں

گر چمار اس کارخانہ میں نہ ہو
ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو

چار و ناچار اس کنے جانا پڑے
کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے

حاجت اس فرقے سے مطلق یاں نہیں
جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصاں نہیں

یہ تو دنیا میں ہے اس فن کا کمال
دین کا اس فرقے کے پوچھو نہ حال

کذب ہو جس جائے رونق بخش سمع
واں کی دینداری رکھو اور دل کو جمع

جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں
کو یقین ایمان کیسا دیں کہاں

ہم تلک تھی بھی وہی رسم قدیم
یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم

پیار کرتے تھے انھیں اُستاد فن
ان کے ہوتے رہبر راہ سخن

جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار
شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا

الغرض یاروں نے قیدیں دیں اٹھا
جو کوئی آیا اُسے دی پاس جا

ٹک نہ استبداد سے کی گفتگو
کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو

چار سکھیاں کہہ کے دیں ناکس کے ہاتھ
پھر اُسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ

آپ بیٹھے صدر میں وہ دست چپ
کرنے لاگے شاعری سے حرف گپ

بولے ان کو آج کل سے ہے خیال
ذہن ان کا تیزی رکھتا ہے کمال

ہو رہیں گے کچھ اگر صحبت رہی
اور ہم سے بھی اُنھیں الفت رہی

جب ہوا ثابت وہ اُن کا مستفید
سب نے جانا اسکو شاگرد رشید

کی اشارت تاکہ وہ کھولے دہن
آگے استادوں کے ہو گرم سخن

اُن کے ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا
صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا

نیم قد اُٹھ اُٹھ کے یہ سننے لگے
جاوٴ بے جا سر کے تئیں دھُننے لگے

وہ سراپا جہل ناگہ وقت کار
ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار

سر میں رکھ کر دعوی طبع لطیف
میر و مرزا کا ہوا آخر حریف

کیسی کیسی یوں گئیں طبعیں بباد
آفریں شاگرد و رحمت اوستاد

جب تلک یہاں تھی تمیز زشت و نیک
کاہے کو یوں شعر کہتا تھا ہر ایک

اہل فن کی رہتی تھی سبکو تلاش
اُن کے ہاں کرتے تھے بود و باش

جو کہ خود سر رکھے اُستادوں سے عار
اُن کے تئیں ہرگز نہ ہوتا اعتبار

زندگی بلکہ انھوں پر شاق تھی
ہاتھ گر لگ جاتے تھے شلاق تھی

حکایت

شائق فن تھا وزیر اصفہان
ایک دن آیا ہلالی[1] اس کے ہاں

حاجبانِ در سے ہو آگاہ کار
کی اشارت تا اُسے دیں گھر میں بار

---

[1] ہلالی استر آبادی انکا کلام فصیح ہے، عہد جوانی میں خراسان چلے گئے تھے عبداللہ خان ازبک کے زمانہ تسلط میں ۹۳۶ء میں قتل کیے گئے۔

عزت و تعظیم کی حد سے زیاد
پاس لے مسند پہ بیٹھا شاد شاد

اُن نے کھینچی اُس کی مرزائی بہت
بیٹھے بیٹھے رات جب آئی بہت

شعر کی تقریب لاکر درمیاں
کرنے لاگا شاعری کا امتحاں

شعر خوانی کی پڑھا سو تھا غلط
سنتے ہی بھڑکا وہ شعلہ کی نمط

غصہ ہو بولا کہ فراش و چوب
کھینچ لا میداں میں کی شلاق خوب

اس قدر مارا کہ بے دم ہوگیا
سوج دست و پا ہر اک تھم ہوگیا

کھینچ کر ڈلوادیا دربار میں
یہ خبر پہونچی جو ہر بازار میں

وارث اُس کے لے گئے آرات کو
جب بخود آیا تو پایا بات کو

یعنی دستور زماں دشمن نہ تھا
یا وہ کچھ ناآشنائے فن نہ تھا

غالباً پایا غلط اشعار کو
خوش نہ آیا اُس کرم کردار کو

ورنہ شیوہ اُس کا ہے لطف و کرم
جائزے میں وے ہے دینار و درم

مجکو کیوں شلاق کرتا اتنی شب
کاہے کو بدنام ہوتا بے سبب

پس مجھے ہے تربیت اپنی ضرور
جاکے بیٹھوں اک سرآمد کے حضور

صحبت اکثر رکھوں اس استاد سے
شاید اس کی دولت ارشاد سے

پہونچے اک رتبہ کو میری قیل و قال
ہو مجھے اس فن میں یک گونہ کمال

اُٹھ کے آیا مولوی جامی کنے
مشق کی یک چند اس نامی کنے

جب ہوا کچھ شعر کا رتبہ بلند
اور مولانا لگے کرنے پسند

پھر گیا اک دن درِ دستور پر
حاجب درگاہ نے کی جا خبر

کاے امیر اس روز کا شلاق خوار
آج در اوپر ہے پھر خواہانِ بار

کی اشارت سدِّ رہ کوئی نہ ہو
قصد ہے برخورد کا تو آنے دو

سامنے آیا تو کی نیچی نظر
دھوپ میں جلتا رہا تو اک پہر

بعد ازاں ایمائے ابرو کی کہ ہاں
صحن ہی میں سے ہوا وہ مدح خواں

پھر وہیں سے دے صلہ رخصت کیا
اک مصاحب نے جگر کر کر کہا

اگلی صحبت کی تھی عزت اس قدر
سو ہوئی شلاق حد سے بیشتر

اُبکی اس کو جائزہ دیگر گراں
تو نے فرمایا مرخص واں سے واں

میں نہ سمجھا یہ کہ وہ کیا تھا یہ کیا
در جواب اس برگزیدہ نے کہا

ایسی ہی ہوتی ہیں تضحیک سلف
دست ہو تو اُن کے تئیں کریے تلف

اسقدر اس کا تنبہہ تھا ضرور
تا کہ پہونچے یہ خبر نزدیک و دور

جو سُنے سو خود سری سے باز آئے
تربیت ہونے کو اُستادوں کی جائے

ورنہ کرتا پوچ گوئی ہر دبنگ
رفتہ رفتہ شاعری ہو جاتی ننگ

تب جو میں شلاق کی یہ خام تھا
اب جو آیا لائق انعام تھا

قصہ کوتاہ تھی ممیز درمیاں
ننگ ہے کرم مزابل پر بھی یہاں

بے تمیزی سے ہے رائج ابتری
جسکو دیکھو خود نمائی خود سری

نے بیاں کا ہے سلیقہ نے زباں
اسپہ ہے ہر ایک سحبان بیاں

بس قلم وقتِ زباں بازی نہیں
چپ کہ دورانِ سخن سازی نہیں

کون حرفِ خوب کو کرتا ہے گوش
بات کی فہمید کا ہے کسکو ہوش

بے تمیزوں سے بھرا ہے سب جہاں
ہے دماغ حرف ہمکو بھی کہاں

مثنوی اژدرنامہ

یہ موذی کئی ناخبر دار فن
نئی ناگنیں جنکے ٹیکوں پہ پھن

نہیں جانتی ہوں میں مار سیاہ
زبانہ ہے آتش کا میری نگاہ

نفس سے مرا افعی پیچدار
گیا جس سے خصم قوی من کو مار

جدھر بھر نظر دیکھوں لگ جائے آگ
دم دم کشی لب پہ کھیلیں ہیں ناگ

جہاں میں ہوں وہ جا ہے پُر شر و شور
عصا سے چلے راہ واں مار و مور

مری آنکھ سے زہر ٹپکا کیا
جلا آگے میرے کبھو کب دیا

سُن اس ماجرے کو سبھوں نے کہا
کہاں کیچوے یہ کہاں اژدہا

نہ خصمی مری اژدروں سے ہوئی — طرف مجھ سے ہو جونک کیا ادھموئی

اگر شور زاغاں سے ڈر جائے مار — تو کیا اجگروں کا رہے اعتبار

نہ کس طور اژدر کو تکواسہ ہو — حریف اس کے سوکھی سی چلپاسہ ہو

کہاں چھپکلی اژدہے سے لڑی — کس اژدر پہ ایسی قیامت پڑی

ہزار اجگر اندوہ سے جائے لٹ — دے ایسے کیڑے مکوڑے ہیں چٹ

جہاں شور اژدر سے ہے دھوم دھام — کوئی کنسلائی سے نکلے ہے کام

بہ ظاہر یہ لائے تو ہیں پر نکال — ولے ہوں گے اُن کے جیوں کے وبال

حریفی انھوں سے ہوا اژدر کی کب — وہ کھینچے جو یکدم تو پھیکا ہیں سب

حکایت بعینہ یہ دل سے ہے میر — سر راہ کہتا تھا جو اک فقیر

کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم — درندوں کے بھی دل تھے اُس سے دونیم

نکلتے نہ تھے اُس طرف ہو کے شیر — پلنگ و نمرداں نہ رہتے تھے دیر

جہاں شیر کا زہرہ ہوتا ہو آب — شغال اور روبہ کا واں کیا حساب

وہ صحرا تھا اس کے سبب ہولناک — دم اس کے نے واں کی اڑا دی تھی خاک

نکلتا تھا جب بہر برگ و نوا — شجر کے شجر ہو تے تھے تب ہوا

کہاں سایہ اس جا و سبزہ کہاں — درخت اسکے چاٹے رہے تھے نہ واں

صدا جب مہیب اُس کی ہوتی بلند — جگر چاک کرتے ہوا سے پرند

درندوں کے برجا نہ رہتے حواس — چرندے مکانوں سے ہوتے اُداس

وحوش اُس بیاباں میں جاتے نہ تھے — طیور آشیانوں میں آتے نہ تھے

کبھو اُس کی رہ میں جو اُٹھتا غبار — تو وہ دشت تھا ایک تاریک غار

پہونچتا تھا گردوں تلک شور و شر — ہوا صاف ہوتی نہ دو دوپہر

رہا کرتی کوسوں تلک اس کی دھوم — نہ اُس راہ آتا کوئی جز سموم

ہوئے ساکنانِ بیاباں تنگ — اُٹھے کوہ و وادی سے شیر و پلنگ

گئے جان لے لے وحوش و طیور — کوئی رہ گیا موش و مینڈھک سا دور

گئی لومڑی ایک سوکھی ہوئی — کسو اور جنگل میں بھوکی ہوئی

گلی میں جو یاں کے کھلے اس کے لب ہوئی واں کی اعیان گرم غضب
خراطین و خرموش و موش و شغال اس اژدر کو کر جنس اپنی خیال
رواں ساتھ اُس کے شبانہ ہوئے کئی گرگٹ آگے روانہ ہوئے
رعونت سے مینڈھک اُچھلتے چلے بلوں میں سے چوہے نکلتے چلے
قریب اُس بیاباں کے جسدم گئے اُنھوں میں سے آگے بہت کم گئے
قضارا وہ آفت تھی سر گرم سیر چلے آتے تھے بھاگتے وحش و طیر
اُس آشوب سے دست و پا گم کیے فراموش سب نے سرو دم کیے
لگا ڈرنے خرموش سا پہلوان ہوا مضطرب کیچوا سا جوان
وہ گرگٹ کہ جس کو تھی گردن کشی ہوئی خوف سے اُسپہ طاری غشی
قدم غوک سے گرد کا جل گیا بھروسا تھا گیدڑ پہ سو ٹل گیا
جہاں پہلواں موش رستم معاش لگا کرنے میداں میں بل تلاش
کہ سوراخ پاوے تو روپوش ہو یہ تشویش یکدم فراموش ہو
وے چھوڑتا کب ہے خصم قوی کہ ہو خوف جاں سے کوئی منزوی
پراگندگی تھی اس انبوہ میں کہ گونجی بلائے سیہ کوہ میں
اس آواز سے جی نکل ہی گئے جو ثابت قدم تھے بچل ہی گئے
سیہ جب ہوا ہوگئے منھ سفید ہوئے مدّعی جان سے نا اُمید
بھرا ایک دم اُن نے واکر وہاں کہ پایا اُس انبوہ کو نیم جاں
دم دیگر اُن سے نہ کوئی رہا وہی دشت خالی وہی اژدہا
زبانہ وہی آگ کا چار اور ہوا گرم ویسی ہی ویسا ہی شور
وہی دم کشی شام سے تا سحر اُسی ہولناکی سے وہ دشت و در
کنھوں نے کبھی منھ نہ ایدھر کیا نہ پھر نام اس اژدہے کا لیا
مری ان گزندوں کی صحبت ہے یہ طرف ہوں مری اُنکی طاقت ہے یہ
جو مجھ کو ہو کچھ بھی اُنھوں کا خیال تو یہ مارگیری کریں کیا مجال
تو کیا ہو اُنھوں سے بہت دور میں ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں

مری قدر کیا اُن کے کچھ ہاتھ ہے
جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے

کہاں پہونچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر
گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

مثنوی در مذمت آئینہ دار

آج سے مجکو نہیں رنج و ملال
جب سے نکلے بال تب سے ہے یہ حال

موشگافوں کا نہیں ہے نام اب
مدعی شیر ہیں حجام اب

ان سے کیں اک مو برابر بھی نہیں
جلف اشرافوں کے ہمسر بھی نہیں

پر ہوئے سر چڑھ کے یہ موئے دماغ
دود ہو جانے لگے سوئے دماغ

ہوگئے گرم سخن تب تو قلم
ورنہ یوں بیہودہ کب نکلا ہے دم

ایسے مونڈے میں نے کتنے بے شعور
ہے حجامت اس بھی فرقہ کی ضرور

یاں نہ سید کچھ ہے نے نائی ہے شرط
ہو کسو کسوت میں دانائی ہے شرط

سگ کو نجم الدیں کے سرداری ہوئی
نوح کے بیٹے کی وہ خواری ہوئی

میر و مرزا میں حکم ہووے خرد
نے کی نائی جن پہ سب کا دست رد

سمجھے مرزا میر کو مرزا کو میر
نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے سیر شیر

مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت
یاں تأنّی واں عجالت ہے بہت

جس جگہ میں نے رکھی مُنھ میں زباں
ہوتے اُس جاگہ جو مرزا بیگماں

استرے کانوں میں اپنے باندھ کر
کب کے اب تک گھسگئے ہوتے ادھر

ان کمینوں کا گلہ کیا کیجئے
ایسے دس پیدا ہوں گر نہ لیجئے

کہتے ہیں سر گرم بیباکی ہے یہ
ہوں تو ہوں ناپاک کیا پاکی ہے یہ

لکھئے اس فرقہ کے اب تا چند ذم
خط بناویں ایسا کریئے کف قلم

گرچہ ان کو کہتے ہیں آئینہ دار
لیک انکا منھ نہ دیکھیں کاش یار

صاف قینچی پر انھیں چڑھوایئے
گر زمد مواس میں پھر ہو جایئے

چاہو ہو اس قوم کی کیا شرح حال / آگے ہی آویں گے جتنے ہوں گے بال
اک سفید اُن کو نہیں چننے کی تک / ہوتے ہیں دشمن یہ کالے بال تک
کیا کہوں کیسے ہیں اوندھے یہ لچر / کیجئے اصلاح عاید ہووے شر
کھرچیں ایسا سر کہ کردیں پائمال / سیدھیاں جب سُن لیں تب لیں اُلٹے بال
معتبر اُن کے جو حجّامی ہیں اب / ہند میں وہ تیرہ روشامی ہیں اب
کوئی لے جائے جو حاجت غسل کی / چلّو چلّو پانی پر دیتے ہیں جی
لعنتیں کرتے ہی گزرے اُس کو واں / غسل میں فرصت تشہد کی کہاں
بیٹھے جاے خانے میں کیا غسل کر / جیب شاگردوں نے واں رکھی کتر
لیک پھر اُجرت کے اوپر جنگ ہے / لات ہے گالی ہے پھر سر چنگ ہے
اس سقاوے میں گیا تھا اک حریف / اسکی فی الجملہ طبیعت تھی ظریف
دھوکے پاجامہ نہانے بھی گیا / یکطرف پھر پائخانہ بھی گیا
غسل کے پیچھے جو منھ گھر کو کیا / ہاتھ نائی کے سوا پیسا دیا
نائی نے پوچھا کہ پیسا یا ٹکا / دمڑی یہ کیسی ہے میں قرباں گیا
ہنسکے بولے تو نہ بدلے جائیو / یاں ہگا بھی ہے اُسے اٹھوائیو
چوہڑے نائی ہیں سارے ایک ذات / ان میں ہے بدذات جو ہو نیک ذات
آیا اک نائی زنانا سا نظر / ہاتھ میں نلوا لیے بے پا و سر
میں کہا آتا ہے نلوا کام کیا / بولتا ہے آگے سے بدنام کیا
.....اُس میں لوطیوں کی ڈال کر / مونڈتے ہیں .....اک اک بال کر
ہاتھ میں رکھئے تو...... ہو انھیں / ضبط کی شاید نہ طاقت ہو انھیں
عذر گرچہ واں تلک بھی یاں نہیں / لیک اک دن اس میں اپنی جاں نہیں
وھکے چڑھ جاویں نہ جانے کیسے کے / جی بھی جاوے واسطے دو پیسے کے
سُنکے اس سے ایسی اچرج بات کو / میں کہا لعنت تری اوقات کو
کاٹئے اُن کے تئیں مثل گزر / پنڈے کے بلکے ہیں اکثر پاچہ خر
بعضے بعضے اُن میں سے جراح ہیں / بحر خون و ریم کے ملّاح ہیں

زرد و زنگاری کوئی ڈوبا ہے ساتھ
حیف کے ہے ایک دو لئے ہیں ہاتھ

موم ڈالیں تیل میں مرہم کریں
پھر مسیحائی کا دے اس پر بھریں

پھیر پگڑی بیٹھیں ایسی شان سے
آئے ہیں گویا ابھی ایران سے

باپ سے اپنے اگر پیسے نہ پائیں
داغ کو اُس کے جراحت کر دکھائیں

بعضے بعضے ان میں رعنا ہیں اگر
سو مشعلچی ہیں بھگت کے بیشتر

رنڈی گت ناچے یہ اُس کا منھ دکھائیں
پاپا مشعل لیے مجلس میں جائیں

روشنی لے دوڑتے ہیں وقت شام
گھورتے ہیں کر کے اندھیارا مدام

تیل کی کپی لیے خوش ہیں کھڑے
ایک بھڑوے ہوتے ہیں چکنے گھڑے

لگ چلیں تو ہینگے جیسے موچنے
کھائیں جب سر میں لگیں تب سوچنے

چھیڑیو تو مغز بھی لے جائیں گے
سر کے تئیں سہلا کے بھیجا کھائیں گے

بے حقیقت ہیں نہیں شایانِ کار
صحبت اُن سے بگڑی ہے پایان کار

مثنوی در ہجو اکول

ایک ہے پُر خور آشنا بے پیر
سینہ سوراخ جس سے ہے کف گیر

صدمنی دیگ ہے شکم اُس کا
نفس اژدہا ہے دُم اُس کا

آنت شیطان کی ہے اُس کی آنت
دانت اُس کا ہے ہاتھی کا سا دانت

خستۂ جوع وہ جو آوے زنہار
منہ ہے گویا کہ زخم دامن دار

شکل مت پوچھ کھانے کا ہے بلی
مُنھ چھپیوں سے جیسے روٹی جلی

گال کلچے سے پھر توے سے سیاہ
کاسۂ سر ہے جیسے اوندھا کڑاہ

توند کالی جو کھول جائے لیٹ
آہنیں ہیں تنور اُس کا پیٹ

راہ مطبخ میں جو پاوے ہے کبھی
چاٹ جاتا ہے دیگچوں تک بھی

کھنچے باورچیوں کے کیا کیا ناز — کتری گئی اُس کے چوتڑو پر پیاز

کھانا نکلے پر آوے ہے کیسے — چیل ٹوٹے ہے گوشت پر جیسے

وقت کھانے کے ہاتھ سے اس کا — قاب پر نان پنجہ کش گویا

کیا وہ دو پیازہ کھاکے ہو تازہ — اک نوالا ملا ہے دو پیازہ

گوشت ہانڈی بھرا ہے ختک میں — ہنڈیاں گویا تھیں اُس کی خشک میں

خام طمعی سے اک کرے ہے آہ — دیکھ کر شب کو نان ہالۂ ماہ

نہ ٹلے دیکھ کر وہ قاب پلاؤ — مُنھ ہے مُنھ بیٹھا اگرچہ کھاوے گھاؤ

کھانے پر وہ جب جی چلاتا ہے — لاٹھی پاٹھی بھی کھائے جاتا ہے

نہیں پہونچے جو کھانا کھانے لگ — ہڈیوں پر لڑے ہے جیسے سگ

بھوکھ کا باؤلا جو آتا ہے — لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے

دھوں میں دشمنوں سے بھی وہ لئیم — جائے گھل مل اگر سُنے ہے حلیم

آش بغراپہ مار بھی کھاوے — اس میں گو بوغرا نکل جاوے

کسی مفلس کے گھر جو جاتا ہے — کچھ نہیں خفتیں ہی کھاتا ہے

بھوکھ سے جب کہ غصے میں آوے — بز کو ہی کی طرح جھنجھلاوے

ٹھڈیوں کو نگہہ سے کھا جاوے — چنے لوہے کے بھی چبا جاوے

دہر کا جلنا آگ سے مانوں — بھوک اُس کی جلے تو میں مانوں

نکلے بازار میں وہ جب چربوز — سر ہی پھوڑے ہے دیکھ کر تربوز

گھاس پات اور کانس کھاتا ہے — نیشکر پر وہ بانس کھاتا ہے

اُس کے آنے کی سُن کے بازاری — کرتے ہیں سودوں کی خریداری

کوئی تختہ کرے ہے دوکاں کو — کوئی لاوے بلا گزرباں کو

کنجڑے ڈھانکے ہیں ساگ پات اپنا — تکتے ہیں بنیے داؤ گھات اپنا

کہ مبادا ادھر کو آجاوے — سودے یکسو ہمیں نہ کھا جاوے

اینٹ پتھر بھی کھا گزر جاوے — الغرض پیٹ اپنا بھر جاوے

کیا کیا جینے کی کہئے چکھتا ہے — ایک پیٹ اس کو مارے رکھتا ہے

پیٹ اپنا بڑا جو پاتا ہے — گوہ تک کا بھی حیف کھاتا ہے
وہ قضا را ہوا مرا مہمان — کھا گئی اس کی میزبانی جان
گھر میں جو کچھ تھا بیچ منگوایا — کھانا اُس کے لیے میں پکوایا
کتنا کھانا بیاں کروں تجھ سے — جس پہ سو میہماں کروں تجھ سے
مجھ سے تھی روزگار سے ان بن — خوب کھانا تو تجھ پہ ہے روشن
چار من گاجروں کا قلیہ تھا — دہ منی دیگ بیچ دلیہ تھا
روٹیاں کس قدر بتاؤں میں — جس کو دو چار سال کھاؤں میں
چاہ کرکے گرا جو وہ بلاع — مدد روح اشعث طمّاع
تھی ابھی روٹیوں کی جیٹ کی جیٹ — میں رہا کہتا کھا گیا وہ سمیٹ
کھانا کوئی اور کیا کہے اُس کا — سارے منھ دیکھتے رہے اُس کا
جب مرے گا وہ بھوک کا روگی — روح توشے کی روٹی میں ہوگی
کھانے کی بو جو ناک میں پیٹھے — مرگیا ہووے تو بھی اُٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں — وہ مرے بھوک اُس کی مرتی نہیں

بھوکے اس کا جو جی نکل جاوے
گور میں بھی کفن نگل جاوے

مثنوی دیگر در بیان کذب

اے جھوٹھ آج شہر میں تیرا ہی دور ہے — شیوہ یہی سبھوں کا یہی سب کا طور ہے
اے جھوٹھ تو شعار ہوا ساری خلق کا — کیا شہ کا کیا وزیر کا کیا اہل دلق کا
اے جھوٹھ تجھ سے ایک خرابی شہر میں ہے — اے جھوٹھ تو غضب ہے قیامت ہے قہر ہے
اے جھوٹھ رفتہ رفتہ ترا ہوگیا رواج — تیری متاع باب ہے ہر چار سو میں آج
اے جھوٹھ کیا کہوں کہ بلا ریز سر ہے تو — اے جھوٹھ سچ یہ ہے کہ عجب فتنہ گر ہے تو

اے جوٹھ کب عرصہ میں تجھ سا حریف اب
تیرے ہی حکم کش ہیں وضیع و شریف اب

اے جوٹھ تیرے شہر میں ہیں تابعیں سبھی
مر جائے کیوں نہ کوئی وے سچ بولیں نے کبھی

کہنے سے آج اُن کے کوئی دل نہ شاد ہو
فردا کہیں تو اس سے قیامت مراد ہو

وعدے گھڑی کے پہروں کے سب آزما چکے
برسوں تک انتظار کیا جی ہی جا چکے

اے جھوٹھ رنگ تیرے کرے کوئی کیا بیاں
رکھتا ہے جیسے غنچہ زباں تو تہ زباں

یوسف کہ تھا نبی و صداقت شعار تھا
پھر حسن ظاہری سے بھی باغ و بہار تھا

پایان کار تیرے سبب چاک پیرہن
زنداں میں جا کے برسوں رہا چھوڑ کر وطن

اے جوٹھ تو تو ایک دلآویز ہے بلا
آشوب گاہ تجھ سے زمانہ رہا سدا

کس جانکنی سے کوہکنی کوہکن نے کی
تصویر کھود شیریں کی پیش نظر رکھی

نزدیک جب ہوا کہ وہ مطلوب سے ملے
اب صبح و شام غنچۂ مقصود دل کھلے

دلالہ کے تو پردے میں آ کام کر گیا
دو باتوں میں وہ عاشق دل خستہ مر گیا

اے جھوٹھ تجھ سے فتنے ہزاروں اُٹھا کئے
ہنگامۂ و فساد ہی ہر سو رہا کئے

اے جھوٹھ راستی سے نہیں گفتگو کہیں
کہنے کو یاں کہیں ہیں حقیقت میں ہے نہیں

اے جھوٹھ اس طرح ہیں بہت جی سے جا چکے
وعدوں میں آہ لوگوں کے وعدے ہی آ چکے

اے جھوٹھ اس زمانے میں کیونکر چلے معاش
ہے تنگ جھوٹ بولنے سے عرصۂ تلاش

سردار جس سے سب متعلق ہے کاروبار
سچ بولنا ہے اُسکے تئیں سخت ننگ و عار

پھر سب مدار کار دروغی و مفتری
صدق و صفا و راستی کے عیب سے بری

جھوٹا سوار* دولت ابھی کا ہے یہ امیر
ورنہ قسم کسو کی بھی تھی حرف بار گیر

مشکل حصول کام ہے یاں حاصل کلام
باتوں ہی باتوں کام ہوا خلق کا تمام

اے جھوٹھ دل مرا بھی بہت دردناک ہے
ان کاذبوں سے صبح نمط جیب چاک ہے

اک فرد دستخطی تھی مری ایک شخص پاس
دیکھا جو خوب اس کو تو مطلق نہیں حواس

تھا میں فقیر پر نہ گیا شاہ کے حضور
اتنے لیے کہ رتبۂ عزت مرا ہے دور

آداب سلطنت سے نہیں مجکو رابطہ
حرکت نہ ہوئے مجھ سے کوئی غیر ضابطہ

مرزائی مجھ سے کھینچی نہیں ہر عزیز کی
پھر شعر و شاعری بھی نہیں ہے تمیز کی

صحبت خدا ہی جانے پڑے کیسی اتفاق | کیا بات آوے بیچ میں بے رنگی ہے شاق
میں مضطرب گھر اس کے گیا اُٹھ کے پانچ بار | کہنے لگا زباں سے یہ ہوتے ہی وہ دو چار
تقصیر میری اس میں نہ کریگا کچھ خیال | صاحب کہیں خموشی کروں میں یہ کیا مجال
لیکن یہ حرف اس بھی سیہ رو کا رکھئے یاد | انداز سے یہ لوگ سخن کرتے ہیں زیاد
بہتیری ایسی فردیں یہ رکھتے ہیں جیب میں | رکھتے ہیں یوہیں لوگوں کو برسوں فریب میں
دکھلاؤں گا چلا ہوں سوال آپ کا لیے | میں نے کہا فقیر کہو کس طرح جیے
بولا نہ ہوگا سعی میں ایدھر سے کچھ قصور | پھر دیکھئے کہ پردے سے کرتا ہے کیا ظہور
اک آدھ ایسی بات بنا کر کھسک گیا | دل اس خبر کے سننے سے میرا دھڑک گیا
یہ عرضیاں حضور کو بھیجیں میں صبح و شام | دستخط جو ہو کے آئے کوئی سو اسی کے نام
یعنی وہ ابکی آن کے کچھ دیوے گا شتاب | دل جمع رکھیں کاہیکو کرتے ہیں اضطراب
دو چار بار آیا بھی وہ پر نہ کچھ ہوا | مجھ کو جو اضطرار تھا میں بے اجل موا
مدت مدیدی گزری مجھے کرتے انتظار | خجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار
اس فرد دستخطی کو ہے یہ ماہ ہفتمیں | تنخواہ کا نہیں ہے ٹھکانا ابھی کہیں
آیا جو وہ لطیفۂ غیبی اب اپنے گھر | میں مضطرب ہو آپ گیا ملنے اس کے گھر
بارے نہ اتفاق ہوا یہ کہ ہو ملاپ | کھویا تھا اضطرار سے عزو وقار آپ
گھر آکے ایک بھائی کو بھیجا پیام دے | آئے وے اُس کے پاس سے جو کچھ جوابدے
حضرت سے کہیو پہلے بہت بندگی مری | پھر کہیو اب اُترتی ہے شرمندگی مری
دو چار دن میں بھیجے گا کچھ گھر ہی آپ کے | در پے نہ اتنے ہو جیے میرے ملاپ کے
تب سے وے بھائی جاتے ہیں ہر روز صبح و شام | ابتک تو ملتوی ہے زمانے زدے کا کام
دن دیکھتے ہیں وعدے کے بھی ہیں بہت قریب | پھر ترک شہر کیجئے گا کہہ کے یا نصیب

برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے وعید
سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں اُن جھوٹوں سے بعید

مثنویات شکارنامہ

شکارنامۂ اوّل

چلا آصف الدولہ بہرِ شکار — نہادِ بیاباں سے اُٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا کے رنگ — لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانوں سے جانے لگے — وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے
سُن آوازِ شیرانِ نرّ ڈر گئے — پلنگ و نمر خوف سے مر گئے
جہاں ببر آیا نظر صید تھا — بیاباں اُسی پہن سے قید تھا
گئے مست ہاتھی مکانوں کو چھوڑ — دیے پنجۂ شیر نلیوں سے توڑ
نہ دیکھا نہ ہم نے سنا یہ شکار — کہ بکری سا ہاتھی کو لیتے ہیں مار
پلنگانِ صحرا کہ دل خوں کیے — نہنگانِ دریا ہوئے مرچیے
کہاں سہل مارے گئے نرہ شیر — لگے بکریوں کو پکڑتے بھی دیر
ہوئے لشکری جبکہ سرگرمِ گشت — مقیّد ہوئے مست فیلانِ دشت
گئے جانور دشت خالی رہے — بیابان جھاڑے گئے تو کہے
عجب تر ہے یہ صید کرنیکا ڈھنگ — کہ چورنگ ہاتھی ہوئے بید رنگ
نہ چیتل نہ پاڑھا نہ ارنا نہ شیر — ہوئے گولیاں کھا کے یک لخت ڈھیر
درندوں کا پیدا نہ نام و نشاں — نہ شیرِ ژیان و نہ پیل وہاں
کبھو فیل دشتی نہ جکڑے گئے — نہ یوں بھیڑ بکری سے پکڑے گئے
سُنا جس طرف فیل دشتی کا میل — رواں فوج اُدھر کو ہوئی سیل سیل
اگر ٹک بھی اٹکا تو مارا گیا — پڑے سیکڑوں پھاند چارا گیا
وگر سرکشی سے کی استادگی — تو پیش آئی اک طرفہ افتادگی
پہاڑ ایک ہاتھی مقابل ہوا — بزور آمد و شد کا حائل ہوا

جٹے دونوں وے دیو میدان میں
اُٹھا شور محشر بیابان میں

جہاں دونوں فیلوں کی تھی سرزنی
شتر مُرغ سے واں نہ ہو پرزنی

جو اس مار کھانے پہ اکڑا رہا
کئی روز رسوں سے جکڑا رہا

رہے کس طرح پھٹ گیا تھا جگر
موا دوپہر میں لہو موت کر

مگر سرکشی سے نہ اپنی ہٹا
نہ میدان سے ٹک و بانک گھٹا

اشارہ ہوا اُس کے چورنگ کا
سبھوں کو ارادہ ہوا جنگ کا

برسنے لگا مینھ تیروں کا زور
ہوا فیلِ باراں کا جنگل میں شور

لگی پڑنے بجلی سی تیغ سیاہ
پریشان ہو جیسے ابرِ سیاہ

نہایت وہ ہاتھی ہوا لخت لخت
گرایوں کہ جیوں پارۂ کوہ سخت

رکھا لا کے لشکر میں اثنائے راہ
سر اُس کا کٹا جیسے بُرج سیاہ

رہے کہتے اس دن عجب سب ہی یہ
سر فیل ہے یا سرِ شب ہے یہ

اگر دیو ہیں سرگرانی کے ساتھ
نہ اس تیرگی و کلانی کے ساتھ

وہاں خشمگیں جیسے آتش یہ تھا
مگر فیل سر دیو سرکش یہ تھا

گوزن اور ہرنوں کی کیا دیجے شرح
گئے شیر مارے سوکتوں کی طرح

گیا دشت در دشت شور شکار
ہوئے گرگ آہو کے اوپر سوار

ہرن جھکتیوں میں رہے گھومتے
کھپے فیل بیلوں ہی میں جھومتے

برابر رہے گورو شیرِ ژیاں
برابر تھا دونوں کو وسواس جاں

گئے پیشتر چھوڑ نخچیر گہ
شغالوں کی روباہ بازی تھی یہ

اس اوقات سے جو کہ بیہوش تھے
بھیرر و بُنہ* جاگہ خرگوش تھے

اگر ریچھ نکلا تو تھا سو بسو
بہت مضطرب تھا وہ آشفتہ مو

قلندر سپاہی پئے جاں ہوئے
لیے اسکو سردرگریباں ہوئے

علف آب گوں تیغ کا پھر ہوا
کہیں پانوں اس کے کہیں سر ہوا

موئے اس طرح حضرت بوحمید
کہ جوں ہوتے ہیں گے بڑے سے پلید

گرے پشت سوئے فلک خاک پر
اک انبوہ تھا جسم ناپاک پر

گئے لادنے فیل پر لشکری | یہی ذات تھی لائق برتری
کروں صید ماہی کا کیا میں بیاں | کہ فیلوں پہ تھے تو وہ تو وہ رواں
پڑے سیکڑوں دام تالاب میں | نہ چھوٹی تنک خاک اُس آب میں
نہ تیتر نہ طاؤس صحرا کے بیچ | نہ ماہی نہ مرغابی دریا کے بیچ
رہے گوشت ہی پکتے ہر صبح و شام | جواں کھا گئے مُرغ و ماہی تمام
ہوا حائلِ راہ بحرِ عمیق | کہ ہو وہم ساحل پہ جسکے غریق
قریب آکے اتری یہ خائف تھی فوج | کہ بیڈول اُٹھتی تھی ہر ایک موج
مہیب اور آلودۂ خاک آب | بعینہ پھٹی آنکھ تھا ہر حباب
غضب لجہ خیزی بلا جوش پر | تلاطم قیامت لیے دوش پر
چلے بس تو کچھ کوئی چارہ کرے | مگر دیکھ ہی کر کنارہ کرے
تردد میں ہراک کہ ہوں کیونکہ پار | کنارے بیچ سر گشتہ گرداب وار
رواں آب ایسی روانی کے ساتھ | کہ جوں رنگی ہو جوانی کے ساتھ
لگے پاؤں چلنے جہاں شور تھا | کہ کم آب میں بھی بڑا زور تھا
تامل سے اقبال نواب دیکھ | توقف کیا پہلے تو آب دیکھ
پھر اُس پار جا کر اشارہ کیا | کہ لشکر نے ووہیں گزارا کیا
شباشب اُترنے لگے لشکری | نہ جوشِ آب کا وہ نہ ویسی تری
وہ سوتا جگاتا تھا جس کا خطر | اُٹھا شور سے فوج کے چونک کر
نشہ اُسکے سر سے اتر سا گیا | چڑھائی سے لشکر کے ڈر سا گیا
کچھ اک ناویں لے کچھ شجر کاٹ کر | شتابی سے دریا کے تئیں پاٹ کر
اُترنے لگا لشکر بیکراں | کراں تا کراں تھی یہ محشر عیاں
سلامت ہوا پار سب اژدہام | رہے دنگ خضر علیہ السلام
شکار اُس کنارے بھی تھا بیشتر | ہوے صیدیاں کے جگر ریش تر
غرض میر تا دور چرخ بلند | رہے آصف الدولہ اقبال مند
کرے اس کا اقبال ہر لحظہ کام | شکار اس کے دشمن رہیں صبح و شام

غزل میر کوئی کہا چاہئے
ٹک اس بھی زمیں پر رہا چاہئے

بازقدم رنجہ فرمودن آصف الدولہ بہادر روزِ دیگر برائے شکار

چلا پھر بھی نواب گردوں شکار	اسد باؤ کے گھوڑے پر ہو سوار
روانہ ہوئی فوج دریا مقال	نہنگوں کی اب کھنچی جاوگی کھال
گیا شور تا آسمانِ بریں	ہوئی گرد افواج گردوں قریں
زمیں ہوگئی جائے خوف و خطر	فلک کو لگے دیکھنے شیر نر
چڑھا بسکہ دریائے فوج گراں	اُتر ہاتھیوں کی گئیں مستیاں
دبی چپلگا چلنے بھیڑوں کی چال	پریشاں ہے گرگ بغل زن کا حال
پلنگوں نے کہسار سے راہ لی	نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی
بجرے جو تھے دام سے چھا گئے	کشف نیچے ڈھالوں کے گھبرا گئے
درندے پرندے چرندے چھپے	گزندوں کے منہ گرد نیچے ڈھپے
تلف جانور ہیں جہاں کے تہاں	گوزن اور گور اور آہو کہاں
رہے گور یک شاخ و یک سو غزال	تزلزل میں ہیں کیا شجر کیا نہال
شغال اور روباہ و خرگوش سے	نہیں بحث کچھ یہ ہیں بیہوش سے
کوئی شور سُن سُن کے گھبرائے ہے	کوئی کان ڈالے چلا جائے ہے
کوئی ڈھونڈھتا ہے بیاباں میں جھاڑ	کوئی چاہے ہے پھاند جاؤں پہاڑ

که شاید اودھر نہ ہو کل مکل — کوئی دن جیے اس بلا سے نکل
پھرے مضطرب ہو کے شیرِ غریں — که بیشوں میں تھے یا کماں یا کمیں
نکلتا ہے گفتار پر بے حواس — ہزبر جگر خوار سب ہیں اوداس
کیا کام ڈرتے گئے پھٹ جگر — بن آئی ہی مرمر رہیں ہیں نمر
اگر خرس تھا مفتر و بد معاش — لگا موش خانے کی کرنے تلاش
وگر ببر ہے پیش و پس ہے نگاہ — نہیں سوجھتی بچواسی سے راہ
مبادا شکاری سگانِ رکاب — گریں آکے مجھ تک بھی پہونچیں شتاب
ہوا آب زہرہ وہ شیری گئی — جگر ڈر سے ہے خوں دلیری گئی
ہوئی صید بندی کی جنگل میں دھوم — گرے فیل جیسے گھٹا آوے جھوم
بیاباں میں چھایا ہے کیا کیا ابر مرگ — برستی ہے گولی بسانِ تگرگ
لڑائی نہیں ہوں جو مصروف جنگ — اُڑیں رنجکیں اُڑے دشمن کے رنگ
جو آتا ہے پلٹن کو کچھ ولولہ — چلے ہے کوئی توپ ہے زلزلہ
اگر جائے ٹھٹی اس کی کوہِ گراں — گیا شیر پھنکے بھی جاگہ سے یہاں
نہ دل مرد ہے ببرو گرم شتاب — دل شیر برنی بھی ڈر سے ہے آب
نہ رنجک کے اُڑنے کا اچھا ہے طور — ہوا آن ہی میں زمانہ کچھ اور
ہوئی گرم آتش زنی سے ہوا — رکھا آب میں جا کے لک لک نے پا
محیط آبگیروں کے تھے مرد کار — موے مالک الحزن چندیں ہزار
بہت دام پانی کی جانب جھکے — کھڑے رہ گئے رود کیا کیا رُکے
ٹھنک سونس گھڑیال رہ رہ گئے — مگر مچھ نہ جانے کدھر بہ گئے
نہ قشقل نہ سلی نہ سرخاب ہے — تمام اُن کے لوہو سے سرخ آب ہے
عجب روغن قاز ملتے تھے یار — کہ قازون کو لیتے ہوا میں سے مار
منگاتے تھے بطخ کی چربی ظریف — سو وہ چربی اب پھینکدیں ہیں حریف
ہوئے کتنے اقسام ماہی شکار — نہ آوے قسم کھائے بن اعتبار
مگر مرگ و ماہی تھی جالوں کے بیچ — کہ یوں مچھلیاں سب نکالیں اینچ

نہ ارنب ہے جنگل میں نے سوسمار — کوئی بدوی کیا کھاوے پروردگار
کلنگوں کی اُلٹی گئی صف کی صف — ہوئے بیچ میں قرقرے بھی تلف
نہ* جب کے گئے سبزہ کھا کھا کے چیت — نبرے ویسے ہی آئے کھیتوں میں کھیت
بٹیر اور تیتر کا ہے کیا شمار — کہ باز آگئے جرے کرتے شکار
ہوا زرد سبز رنگ بہت دل میں ڈر — نمد مو ہوا گرد سے شانہ سر
خطرناک تھا دشت کیا کہیے مور — دبا یوں پھرے جیسے دبتا ہے چور
نہ پاڑھا نہ نیلا نہ چیتل کوئی — بنوں میں جووں تھی گیا جل کوئی

کوئی میر صاحب غزل یاں کہو
پر ایسی کہ ویسی کسی سے نہ ہو

نشیب و فرازِ بیاباں کو سُن — جو ذی ہوش ہیں وے تو ہوتے ہیں سُن
چڑھو آسماں پر جو آوے چڑھاؤ — پھر اترو تو تحت الثریٰ ہی کو جاؤ
جو اس میں کہیں ہووے لغزش تو خیر — کہ در پیش ہے اور عالم کی سیر
زمیں ضیق از بس ہوئی یک بیک — نہ پھیلا سکا پانوں گز پا تنک
ملے پر سے پر تھے ہوا میں کلنگ — کہ چلنے لگے یاں سے تیر و تفنگ
قیامت تھی آفت تھی ہر ایک چوٹ — لگے جس پر تھا وہیں لوٹ پوٹ
ہوئے خون اُس جمع کے بید رنگ — ہوا کا ہوا اور اکدم میں رنگ
نہ پر تھا نہ پرواز نہ بازو نہ پا — کنھوں نے بھی پوچھا نہ یوں تھا یہ کیا
نہ زردی کو دیکھا نہ پایا کبود — نکالا ہے لوگوں نے پانی سے دود
سیہ کی بلا ترک تازی رہی — نہ سارس کی وہ سر فرازی رہی
کماندار مردم سے چارہ گیا — کسو کھیت پر مفت مارا گیا
نہ جو فیل دشتی کی مستی گئی — وہیں مٹ گیا اُس کی ہستی گئی
سنانوں کی نوکوں پہ پھر بٹ گیا — وہ کوہِ گراں سنگ سب چھٹ گیا
بہت جانور چھوڑ آکھر گئے — لگی وُوں بہت جل گئے مر گئے

اگر بن ہے گویا بنا ہے اُسے / کرے قصد واں کا تو کیونکر گھسے
مگر زور سے کچھ نکلتا ہے کام / بہت رنج کھینچے سے چلتا ہے کام
خریدار دستار سرخار بن / زمیں پر رکھو پانوں کانٹوں کو چُن
کئی گام یوں راہ چلنا پڑے / پھر اُس واہگہ سے نکلنا پڑے
تو آگے بیابان پُر خار ہے / کہیں جھاڑ بوٹا کہیں غار ہے
اگر اُس میں پانی نظر پڑ گیا / کنارہ پہ اس کے یہ چڑھ کر گیا
ہوا حال اپنا پریشاں بہت / پھرے مضطرب اور حیراں بہت
ترائی جو واں سے گزرنا ہوا / کہاروں کے سر چڑھ اُترنا ہوا
بیابانِ وحشت اثر پُر خطر / یہی ڈر ہے ڈر کیا اِدھر کیا اُدھر
جہاں تک نظر جائے سوکھی ہے کانس / اگر سبزہ بھی تھا تو تھوہڑ کا بانس
کہیں دل رُکے بند ہو جائے دم / لکھوں کیا نیستاں ہی تھے یک قلم
چلے باد دن کو تو ہو سائیں سائیں / پڑے رات تو پھر کرے بھائیں بھائیں
نہ سبزہ نہ کھیتی نہ آب رواں / کوئی شیر غراں کہ پیلِ دماں
سو وہ شیر مارا گیا مثل سگ / وہ ہاتھی پکڑ لائے بے تاز و تگ
کوئی دشت ایسا کہ تھا سبزہ زار / ہوا دلکش و جرگہ جرگہ شکار
اگر آہو گیری کا ہوتا نہ عیب / تو وہ ہم بھی رکھ لیتے بیشک وریب
مسطح زمیں میل در میل تھی / نہ دریا چہ تھا کوئی نہ جھیل تھی
اگر آگیا رود خانہ کہیں / نہ دلخواہ تھا واں سے جانا کہیں
بڑا لطف تھا سیر میں گشت میں / نہ تھی دخت زر حیف اس دشت میں
ہوا اک جبل سامنے سے سیاہ / اسی کی طرف کو پڑی سب کی راہ
عجب لطف کا تھا وہ کوہِ گراں / کہ صد چشمہ کا اُس میں پانی رواں
شجر سبز و پتھر بہت صاف تھے / سبھی جیسے الماس شفاف تھے
ہوا ایک ابر اس جبل سے بلند / ہوا پر بچھی اسکی یزدی پرند
پہردن سے بارش لگی ہونے زور / رہا ساری وہ رات طوفاں کا شور

ہوئے خیمے پانی کے اوپر حباب سب اسباب لوگوں کا تھا زیرِ آب
نہ پوچھ اور اسباب مردم کا حال نہ چادر رہی خشک نے کوئی پال
قنات اور تنبو بسر سب گئے کھڑے تھے جو کندے اتر سب گئے
بھرا پانی لشکر میں پھیلا ہوا اگر فرش بستر تھا تھیلا ہوا
ہوا سرد از بس ہوئی ایک بار کلیجوں کے ہوتی تھی برچھی سے پار
پھرے باد سے لوگ منھ ڈھانپتے جگر چھاتیوں میں رہے کانپتے
رہا ایسی سردی میں کیدھر شکار ہوئے لوگ خیموں کے اندر شکار
بہت پر جب جی کو تجنے لگے جوانوں کے بھی دانت بجنے لگے
تہ میغ خورشید پنہاں ہوا نہ دیکھا مگر روئے جاناں ہوا
بہت اسپ واشتر موئے پاؤں پیٹ نکالا انھیں خیمہ گہ سے گھسیٹ
غزل میر یاں کوئی موزوں کرو تامل کرو دل جگر خون کرو
کسو بن ارنوں کا پاکر نشاں لگی جانے ہر صبح فوجِ گراں
مقابل ہوا آکے جو فیل مست اگر فیل تھا تو ہوا اس کا پست
غضب ہے خدا کا کوئی اسکے چوٹ اگر اسپ اشتر ہے تو لوٹ پوٹ
نہ خوک اس کی جنگل میں گھیرے ہے راہ نہ شیر اس کی جانب کرے ہے نگاہ
بڑی دیر جنگل میں دوڑا پھرا لیا زیر بندوق آخر گرا
لگی بہنے شمشیر جدول شعار لگے قیمہ کرنے جوانانِ کار
بہت ایسے مارے بہت کٹ گئے نظر کرکے ہیئت جگر پھٹ گئے
کسو بن میں رونق نہ پائی گئی پھر اس پر جو ایسی ادائی گئی
جگرواں کے شیروں کے پھٹ پھٹ گئے بیاباں سے کرگدن ہٹ گئے
نہ فیلوں میں سدھ بدھ نہ شیروں میں زور نہ چیتوں کو جاگہ نہ گوروں کو گور
نہ بوٹی کو چھوڑا نہ باقی ہے جھاڑ پہاڑوں کو راہوں سے ڈالا اکھاڑ
پرندہ جہاں پر نہ سکتا تھا مار ہوا رہکلے توپ کا واں گزار
نکل شیر جنگل سے حیراں ہوئے اڑا ہے جو تھے صاف میداں ہوئے

جہاں چلتے پھرتے نہ تھے مار و مور — چلے پہروں واں تیر بندوق زور
شغال اور خرگوش و ہم روبہاں — شکاری سگوں نے کیے نوش جاں
ہوا پر جو تھے مرغ پرواز میں — گرے سیکڑوں ایک آواز میں
بہت جانور کھا گئے کر کباب — ہوئے آشیانے ہزاروں خراب
حواصل تھا کیا جو کہوں تھا کہیں — کہ تعداد کشتوں کی پاتے نہیں
بہت مضطرب جھکتیوں میں پھرے — سلامت نہ آخر گئے بر سرے
اُنھوں ہی میں سیمرغ بھی تھا مگر — کہ پر مارتا ہی نہیں کوہ پر
نہیں فیل مرغ اور شتر مرغ اب — کہ بعضوں کے طعموں کے کام آئے سب
کسو بن تھے نیستاں اور کانس — چلے راہ واں لے نہ سکتے تھے سانس
برس مینھ دو دن میں کھل بھی گیا — ولیکن ہے کہرا لطیفہ نیا
کہ اندھیر تھا جیسے ظاہر ہو دود — ہوئے ہونٹھ سردی سے سب کے کبود
بلا دھوم سے کوئی گھبرا پڑے — جنھیں دیکھو وے کانپتے ہیں کھڑے
ہوا سرد ہوکر گئی جان مار — اُٹھایا بڑا لُطف سیر و شکار
دل اُس دود تیرہ سے گھبرا گیا — کہیں آگ دیکھی تو جی آگیا
یہی چال تھی ایک دو چار کوس — ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی پڑی ایسی اوس
کسو کوہ کے پاس نکلی جو راہ — گئی کوہ کی تیغ تک کم نگاہ
بلندی تھی اُس کوہ کی تا فلک — نگہ جاتے ہی جاتے جاتی تھی تھک
نہ اس رنگ سے صید ہونگے کہیں — ہوئی خون کے رنگ رنگیں زمیں
جہاں دام اور دو کی تھی بود و باش — لگے چوک لوگوں نے کی واں معاش
ہوا ایک جنگل میں آکر گزر — کسو کو نہ تھی واں کسو کی خبر
ترا کم قیامت تھا اشجار کا — ستم پھر ہوائے ستمگار کا
کہ اس مرتبہ بارد و سرد تھی — ہوے سُن مگر برف پر درد تھی
کوئی خار بن حایل رہ ہوا — پھٹے پیرہن ہوش سب تہ ہوا
درختانِ بے برگ و بر بدنما — نہ اک شاخ پر مرغ رنگیں نوا

بہت سر مالئے بہم تھے شجر
ولیکن نہ پایا کنھوں نے ثمر

نہ قمری ہوئی نالہ پرواز تک
نہ بلبل کی واں آئی آواز تک

یہی کل مکل تھی یہی کشمکش
پھرے مارتے سر کو دیوانہ وش

درختوں کے انبوہ سے رُک گئے
چلے اتنے جھک کے کہ ہم جھک گئے

اگر جاگہ سے اپنی ہلی
تو کانٹے سی ہم رہرواں پر چلی

جو اس دشت میں تھا کوئی صید بھی
سو آگے ہی وہ ہوگیا قید بھی

رہائی ہی مقصود تھی واں سے یار
پڑی اپنی سب کو کہاں کا شکار

کہوں کیا کہ یکسر تھے اس میں قلم
چلے روسیہ اور سو سو بہم

نہ چھوٹی تھی جاگہ قدم وار بھی
نہ اُٹھتا تھا اک نالۂ زار بھی

کہ دل کو کسو کے لگے جوں خدنگ
ہوئے ایسے سنسان جنگل میں تنگ

نکلتا ہوا کھینچ کر یہ عذاب
ملا بیشتر ایک تہ دار آب

رواں تھا کسو کی طرف تندو تیز
ہوا اس کے چلنے کی تھی پیش خیز

حباب اس کا چشمک زناں موج پر
کہ یوں گرم ہو جاتے ہیں اہل نظر

طلبگار کرتے نہیں سادگی
نہ ہو جوں گہر ایسی استادگی

کنارے پہ اس کے اترتا ہوا
دوبالا ہوئی ٹھنڈ مرتا ہوا

نہ رکھتے تھے جوں رند مفلس لباس
نہ اُن سے ہوا اپنے جامہ کا پاس

غزل کہنے کی یہ بھی جا خوب ہے
جو اچھی ہو موزوں تو کیا خوب ہے

آنکھیں ہیں اسکی راہ پہ جوں نقش پا ہزار
پر میر کچھ سرِ سیر و سفر نہیں

لیے کتنے زوروں میں بانک و پٹے
جواں اس سے آگے بھی جا کر ڈٹے

نہنگ اسطرف کے بخاروں کے سُن
پلنگ ان بنوں سے چلے سر کو دُھن

غریب اشتلم جنگلوں میں رہا
نہ جھانکا ادھر کوہ سے اژدہا

گیا سیکڑوں کوس شور شکار
رہے ٹھور حیوان یکجا ہزار

چلا باز چھاتی کو کھولے جہاں
پرندہ رہا وہم کا بے گماں

زمیں گرد جرہ ہے کیا تیز بال
رکھا جنے اُٹھتے ہی مُرغ خیال

فلک سیر شاہیں کی پرواز دیکھ
لگے جوں نگہہ جا کے انداز دیکھ

نہ جھاڑ اگیا نسر طائر سے سر*
گھٹا کر گس چرخ چھوٹا نہ پر ۲۰؎

رواں جس گھڑی ہوتی فوج گراں
بھیر دنبہ ہر طرف سے عیاں

زمیں پر قدم کوئی کیونکر دھرے
بیاباں فراخی سے تنگی کرے

کوئی شعبہ آیا اگر درمیاں
ہوا شور لشکر سے محشر عیاں

بلندی و پستی تھی اتنی کڈھب
کہ گاہے زمیں گہہ فلک پر تھے سب

کوئی تالا کھولا اگر آگیا
تو اپنا کیا پھر کوئی پا گیا

گرے یاں رہے یاں یہی چال تھی
جہاں در جہاں خلق پامال تھی

ہوا دن تو یوں کھینچتے رنج شام
گئی رات چوروں کے ڈر میں تمام

کہے ہے کوئی کون آتا ہے یہ
پکارے کوئی کون جاتا ہے یہ

لگے آنکھ کپڑوں کے تئیں زد رہو
پھر آرام سے رات کو سو رہو

ہوا خیمہ گہہ دامنِ کوہ سب
رہا آ کے نواب واں تین شب

قریب ایک مُیا پہاڑی تھی واں
لگا اُس سے کم کم تھا آب رواں

پہاڑی کہ تودا کہوں خاک کا
کہ انبار تھا خار و خاشاک کا

محاذی تھا اُس کوہ کے ایک دشت
کہ دشوار تھا اُس میں آدم کا گشت

ہوا بد بہت اور پانی لگے
قدم راہ چلتے ہوئے ڈگمگے

چلے باؤ تو ایک موحش ہی شور
رکھے پانوں دامن کو کھینچے بزور

فقط خار بن کیا کیڑ پہاڑ تھا
کہ بوٹا بھی واں جھاڑ جھنکار تھا

چلو ہی چلو ہے یہ چلتے نہیں
کہ اشجار آگے سے ٹلتے نہیں

نہ ٹوٹیں نہ سرکیں نہ کاٹے کٹیں
مگر پچھلے پانوں ہی رہرو ہٹیں

کہیں ہاتھی آیا ہے بھڑکا ہے اونٹ
کھڑے لوگ پیتے ہیں لوہے کے گھونٹ

کہیں ہیں گے انفار سرگرم جنگ
کرے ٹٹو پر تل کا عرصہ ہے تنگ

قیامت نمودار ہر ہر قدم
چلے کوئی کیا رکھ کے سر پر قدم

اسی طور منزل کو کر قطع راہ
پہنچتے رہے ہم بحال تباہ

شجر جمع تھے کچھ تہہ کوہ بھی
فرود آیا اس جایہ انبوہ بھی

زمین اونچی نیچی خشونت بہت
اسی سے تھی واں کم سکونت بہت

ولیکن وہی خاک زشت و پلشت
ہوئی بود آدم سے رشک بہشت

ہوئی بیلچوں سے برابر زمیں
چمن سے بھی شاداب وہ سرزمیں

وہ پانی جو چلتا نہ تھا ڈھنگ سے
کہ تھا رہگرا سر زناں سنگ سے

صفا اور خوبی میں کچھ بڑھ گیا
کئی ہاتھ مقدار سے بڑھ گیا

غزل اس زمیں پر بھی کہنی ہے میر
دل اپنا ہے لطفِ سخن کا اسیر

پہاڑی سے لشکر چلا سوے کوہ
چلے بس تو کریے سیہ روئے کوہ

پڑی وادی سوختہ بیچ میں
کہیں آب میں تھے کہیں کیچ میں

نیستان سے ہے خرابہ کڈھنگ
پٹیلے سے عرصہ نہایت ہے تنگ

شجر جنگل ایسے تھے انبوہ سے
کہ ان میں سے جانا ہو اندوہ سے

کہیں بید کے برگ خنجر گزار
کہیں پا نہ رکھنے دیں سر تیز خار

تنک دو درختوں کے اودھر ہوئے
نیستان پھرتے ہی پھرتے موئے

اگر بید آئے تو بن بید باف
نہ آئے نظر دور تک راہ صاف

اگر بانس تھے واں تو تھے دشت دشت
کہ دشوار تھا دو قدم کا بھی گشت

ہمیں چار نالے اترنے پڑے
کنارے پہ دو دو گھڑی تھے کھڑے

رہا ہر قدم گرنے ہی کا خطر
چلے دو قدم راہ پائی اگر

بہت لوگ دشت قدم کو گئے
بہت اسپ اشتر عدم کو گئے

لگے ہاتھ فیلان دشتی کی راہ
و لے ڈر نہ ہو فیل کوئی سیاہ

نہ ہاتھی ملا کوئی بارے نہ شیر
ہوئی خیر گو طے ہوئی راہ دیر

شجر سر کشیدہ بہت کیا کہوں
جو دیکھوں تو پگڑی سنبھالے رہوں

چنار اُن درختوں کے تھے پائمال
سفیدار رکھتے تھے حکمِ نہال

اگر کوئی دریا چہ آتا ہے بیچ
تو لوگوں کے روندوں سے ہوتا ہے کیچ

تلِ کوہ رفعت نمودار ہو
گیا آمد و شد میں ہموار ہو

کوئی گل زمیں آئے ایسی نظر
کہ عالم نے اودھر لگائی نظر

کہیں سبزۂ تر سے جی جا لگے
کہیں سرسوں پھولے دلوں کو ٹھگے

نہ تھا پر گل زرد و امانِ کوہ
یہی رنگ تھا تا گریبانِ کوہ

فضا دلکشا آب یکسر صفا
شجر خوشنما نرم نرمک ہوا

چکارے بہت مارے کہسار میں
دو رستہ بکا گوشت بازار میں

یہ انبوہ اشجار تا شش کروہ
پھر آگے بیابان وہ ہے اور کوہ

کناروں میں اس کے کہیں کوئی کھیت
وگرنہ یہی سنگ بے رتبہ ریت

نہ سبزہ کہیں تھا نہ آب رواں
نہ دامن میں اس کے چکارا دواں

دکھائی نہ دیتا تھا خوش قد نہال
سیاہی پکڑتے تھے چشم غزال

وہی جنگلہ دو طرف بد نمود
مقام اس طرح کے بھی ہیں یاد بود

نہ پھولی تھی سرسوں نہ کچھ تھی بہار
نہ ظاہر میں اس کے کہیں لالہ زار

نہ چشمک زناں دور نزدیک پھول
نہ نرمی سے آتی تھی بادِ قبول

چلے باد ایسے کہ جھکڑ رہے
ہوا اور پانی میں پھکڑ رہے

اودھر باد کا شور ادھر آب کا
شب و روز مذکور کیا خواب کا

ادھر کے تئیں ایک تھا آب شار
وہ البتہ شایان سیر و شکار

وہیں ایک دم تھا دلوں کا لگاؤ
اُڑانے نہ دے جو حواسوں کو باؤ

سو اپنے تئیں تو نہ تھا کچھ دماغ
کہ حال اپنا تھا جیسا بجھتا چراغ

بہت شعبۂ کوہ مشہور تھا
زبانوں پہ لوگوں کے مذکور تھا

قدم رکھ جو نواب وہاں تک گیا
سر اس شعبہ کا آسماں تک گیا

کذھب وہ جگہ سیر گہ ہو گئی
حضور اس کے فردوس تہ ہو گئی

ہوا خیمہ استادہ ایسی جگہ
کہ آنے لگی دیر واں سے نگہ

رواں دو طرف اس کے ایک آب کم
کہ دل کا لیے جائے سب زنگ غم

جہاں تک کھنچے مد نظر
ہوا موج زن کوہ کے تا کمر

نظر والوں کے جی بھی ڈھلنے لگے
گرفتہ دل اس جائے کھلنے لگے

وہ پانی چلا واں سے دریا ہوا
رواں گرم تر سوئے صحرا ہوا

بہا دامنِ کوہ میں سنگ پر
کیا سنگریزوں کو بھی رنگ پر

کہ لوگ ان کو ہاتھوں میں رکھنے لگے
گرفتہ دل اس جائے کھلنے لگے

کراڑوں کا کیا عظم کیجئے بیاں
برابر کھڑے تھے دو کوہ گراں

انھیں میں سے تھی راہ اس آب کی
وہیں بھیڑ رہتی تھی احباب کی

ہوئے دامنِ کوہ میں کچھ مقام
سفر کی بھی مدّت ہو شاید تمام

کوئی روز گھاٹی کی بھی سیر ہے
سبھوں کی ہے معلوم پھر خیر ہے

جو اس میں کسو سیر کا دیں نشاں
نظر آئے یا کوئی پیلِ دماں

تو اور ایک دو دن کی ہوتی ہے دیر
وہ ہاتھی بندھے کہئے گا یا وہ شیر

شکار ایسا دیکھا ہے اس بار کا
کہ جھاڑا ہوا دشت و کہسار کا

کوئی دیکھے کب تک پہاڑ اور جھاڑ
ٹلے چھاتی پر سے کہیں یہ پہاڑ

غرض ہے وزیرِ جہاں ارجمند
رئیس کلاں کار عالم پسند

در اس کا ہے باب سجود سراں
رہیں حکم کش اُسکے شور آوراں

سدا وہ رہے یوں ہی دشمن شکار
جہاں میں سخن ہے مرا یادگار

بہانے نہ کر میر اب شاخ شاخ
غزل کہہ زمیں گو کہ ہے سنگلاخ

شکارنامۂ دوّم

مکرر ہے نواب کو قصدِ صید
بیابان پہناور اب ہو گئے قید

رواں بحر لشکر ہوا موج موج
گئی چشم خورشید تک گرد فوج

بحار و صحاری پہ ہے عرصہ تنگ
مگر یاں سراسیمہ ہیں واں پلنگ

پہن بیٹھے ہیں شیر ببری لباس
کریں لوگ شاید فقیری کا پاس

چکارے ہرن دونوں اندیشہ مند — دلوں میں ہراس کمان و کمند

کہیں گرگ وادی کو فکرِ گریز — نظر ایدھر اودھر کرے شیر تیز

بنوں میں ہے آشوب کوہوں میں ڈر — بیاباں وطن سارے گرم سفر

کہیں امن ہو تو کہوں واں گئے — نکل آکھروں سے پریشاں گئے

اسد کی نہ شیرانہ ہنکار ہے — نہ گفتار کو تاب رفتار ہے

جہاں کے تہاں فکر میں ہیں کھڑے — کہ دنگل سے جنگل میں کیا بن پڑے

ہوا دود باروت سے تیرہ رنگ — صدائے تفنگ و صدائے تفنگ

وحوش و بیاباں کو وحشت غضب — ہوا ہیں کھڑکتے ہی پتے کے سب

ہزاروں ہی بندوق ہر دم چلے — ہوا ہی میں پنچھی پکھیرو جلے

گئے باد جو آسماں میں پلٹ — کلنگوں کی صف باز نے دی اُلٹ

اُڑے ہاتھ دو چار جرے کہاں — رہے مرغ آبی جہاں کے تہاں

پرِ تیر جس دم کشادہ ہوئے — بُزے صید حد سے زیادہ ہوئے

بنوں میں مچی دھوم سی آ کے دھوم — جہاں دیکھیے ہے قیامت کا ہجوم

کہیں ارنے مارے غضنفر کہیں — کہیں ہاتھ نکلا ہے اژدر کہیں

پڑے مست ہاتھی جو تھے من چلے — سُن اس شور کو چھوڑ کر بن چلے

نہ تیرہ ہے روز گو زنان و گور — کہ شیروں کو بھی قشعریرہ ہے زور

لبِ آب جاکر جو کھیلے شکار — اسد واں کے تھے کودک بے سوار

ہوئے قرقرے صید ہو ہو کے ڈھیر — ہوا میں سے بھاگا عقاب دلیر

زغن ان بنوں میں نہ پائی گئی — نہ تندار کی لاش اُٹھائی گئی

ہوا ہے یہی تو یہ ہوئی نہیں — کہ ہو خاذ* آکر سیہ یاں کہیں

جگر کیا کہ پرزن ہوا اس بن میں زاغ — یہ زہرہ نہیں رکھتے کو ہی کلاغ

شتر مرغ سیمرغ از بس ہراس — نہیں آتے کوہ شمالی کے پاس

غزل کہہ کہ ہے میر لطف ہوا — بیاباں خوش آیندۂ و خوش فضا

بنوں میں پھرا کرتے ہیں ہم تو دیر — نہیں بولتے ڈر سے غرندہ شیر

*قاز حاد

رہے تھے جو فیلانِ مست آن کر — گئے کجلی بن یاں سے ڈر مان کر
جو اِن میں سے آکر لڑا پھر دیا — سو کٹھ بندنوں سے ہوا فیل پا
گریوے کہیں تھے بلند اور پست — پھرا اڑتے تھے واں جیسے پیلانِ مست
بہی تیغ نواب اس طور سے — بہے جدول تیز جس طور سے
بہت رہ گئے زیرِ شمشیر و تیر — بہت آئے لشکر میں ہو کر اسیر
لدے ہاتھیوں پر جو ہوکر شکار — ہوئیں بوجھ سے پشت فیلاں فگار
کئے گم جو گینڈے نے اپنے حواس — کھڑا ہو رہا آکے بھینسوں کے پاس
کہ بھینس اس کو بھی جان کر لشکری — چلے جائیں صرصر نمط سر سری
نہ چھوڑا ہے طیر ایک عصفور تک — نہ وحشی کپی اور لنگور تک
لگے جاکے شاہین دستور یوں — پڑے بکریوں میں کہن گرگ جیوں
کلنگ ایسے بازوں سے آئے ستوہ — کہ کابل سے آگے گئے صد کروہ
نہیں قوچ سر زن نہ ایل نہ رنگ — ہوئے قید با صید کیا بید رنگ
غضب کر گئے جرے نواب کے — اڑا کھا گئے خیل سرخاب کے
نہ لگ لگ نہ تیتر رہا دشت میں — نہ غمخوارک آیا نظر گشت میں
سبھوں میں جو تھے قاز و سارس سرس — ہوئے صید یوں جن پہ آیا ترس
حواصل کو ہوتا اگر حوصلہ — تو گرتا نہ کھیتوں میں وہ دلہ
کہیں سارے طاؤس مرتے گئے — ادھر لوگ افسوس کرتے گئے
کہیں جی اٹھی تھی زمیں بعد مرگ — نہال اس کے خوش قد بسیار برگ
نہ بستی سے صحرا تلک سبز تھے — نظر جائے جس جا تلک سبز تھے
ہوا دلکش و ہر طرف سبزہ زار — کہ سرسوں نے کی تھی قیامت بہار
کھڑے لوگ محو تماشا تھے واں — کہ کہنے لگی بلبلِ خوش زباں
کہ خاطر جنوں سے نہ رکھتے نچنت — خبر بھی ہے تم کو کہ آئی بسنت

یہ عہدِ جنوں ہے جنوں کیجئے — جگر کو غزل کہتے خوں کیجئے

کسو ایسے جنگل میں جانا ہوا — کہ مشکل قدم کا اٹھانا ہوا

نظر گرد لشکر پہ تھی دمبدم
نہ تھا واں کے ضیغم کو کچھ اور غم

کوئی ارسلاں بھیجتا گر رسول
تو شاید کہ الحاح ہوتی قبول

سودے خوں گرفتہ تو بھولے ہوئے
بہت اپنے زوروں پہ پھولے ہوئے

چلے ہر طرف اب جو آکر تفنگ
نہ اوقت صلح و نہ ہنگام جنگ

لگی آگ جنگل میں چارا گیا
بن آئی نہ کچھ مفت مارا گیا

ہوا چہرہ کوئی تو جوں شیر سنگ
نہ شیری دلیری نہ چہرے پہ رنگ

لگی گولی پڑنے نہ پھر چل سکا
نہ جاگہ سے اُکسا نہ ٹک ہل سکا

چلے ہم جو بہراچ سے پیشتر
ہوئے صید دریا کے واں بیشتر

بھرے فرط ہی سے تو دیہات شہر
کہے تو کہ سوتے رہے رود و نہر

گھٹے گولیوں سے مگر بے شمار
رہے سونس گھڑیال چندیں ہزار

جو کچھ زخم پانی میں لے کر گئے
وہیں ہوکے ناسور مر مر گئے

لگا کہنے باخہ سر اپنا جھکا
کہ پانی تو جالوں سے سارا رُکا

اگر جایئے تہ کو دھس جایئے
دگر گاڑے سر تو پھنس جایئے

عجب مخمصہ ہے بچے کیونکہ جان
یہی موت ہے سوجھتی ہے ندان

جواب اس کا گھڑیال نے یوں دیا
گھڑی ایک دو کا ہے قصہ رہا

بڑی سر پہ بجتی ہے فرصت نہیں
پھر اس کو کھنچتے ہیں اب کیا کہیں

تحمل ہو کچھ بھی تو تدبیر ہو
کریں کیا اگر یونہیں تقدیر ہو

کوئی دشت یکدست نے زار تھا
رکھے واں قدم پانوں افگار تھا

یہی سینک یا کانس پانی کی گھاس
زمین و ہوا آب و آتش اُداس

کہیں سوں لگی ہے تمامی ہے دود
کہیں دو شجر ہیں سو کیا بد نمود

نہ پتا نہ شاخیں نہ کچھ اُن کو بار
سراپا ہے خشک و زبوں زرد و زار

نہ سائے سے ان کے کوئی بہرہ مند
نہ دیکھا چرندہ نہ آیا پرند

سیاہی نہ ہرنوں کی ڈاروں نے کی
نہ چشمک کہیں سے چکاروں نے کی

کہیں لپٹے آپس میں دو چار نے
کہیں ہاتھی آیا کہیں شیر نے

کہیں سر پتا سر پہ تھا جیسے تیغ
روندوں کے پانوں پہ آیا دریغ

نہ بلبل غزلخواں نہ طیروں کا شور
سبھی دیکھتے میر کے منھ کی اور

سو اُن نے غزل ست سی یہ کہی
و لے دل کو لوگوں کی لگتی رہی

کسو ایسے بن سے نکلنا ہوا
کہ کوسوں تلک اس میں چلنا ہوا

کشیدہ قد اس بن کے سارے درخت
چمن کے سے نوبادگاں سبز بخت

برابر برابر کھڑے سر بسر
پھرے دیر اودھر کو جاکر نظر

پرے چل کے آیا ترا کم بہت
حواس اس میں جاکر ہوئے گم بہت

کہیں راہ نکلی تو چلتے پڑے
رہے پال و پر تل بہت واں کھڑے

کہ شاخوں نے جھک جھک ملائے تھے سر
بہت آگے جا جا کے آئے تھے پھر

وہی راہ در پیش و کثرت ہوئی
قیامت کے اوپر قیامت ہوئی

سروں پر اودھر توپ آئی چلی
پڑی تھی اودھر لوگوں میں کھلبلی

کہیں اسپ و اشتر کہیں فیل مست
زمیں ہر سر گام بالاؤ پست

گزر جس طرح اس طرح سے کیا
روندوں نے خونِ جگر ہی پیا

وہیں بیچ آیا میانا مرا
کوئی دیکھتا رنج اٹھانا مرا

سواری سے مجھ کو ندامت ہوئی
کہ چاروں سے ملامت ہوئی

لگے کہنے آیا فرنگی کہاں
کہ چوپانی کی رسم چھوڑے ہے یاں

جسے دیکھو چار ان نے رکھ کر کہار
لگا ہونے ہر صبح اس پر سوار

چلو ہی چلو ہے کہ بیچ جائیو
کہ چوپالے کے پاس تم آئیو

روندے اودھر کے ادھر ہیں خراب
یہ جاتے ہیں مجرے کو بھاگے شتاب

چڑھے چار کے کاندھے جیتے ہی جی
لیا انگل اس سودے میں نفع بھی

کہ گھوڑے دیے چھوڑ یکبارگی
میانوں میں کرتے ہیں آوارگی

نہ اس حال سے اہل دختر خبر
توجہ نہ عمدوں کی کچھ ہے ادھر

کیا ایک نالے سے ہم نے گزر
ہوئی قائم اس جا پہ حشر دگر

گرے گاڑی چھکڑے پیادے سوار
کہ مقصد تھا سب کا عبور ایک بار

گزارا جو فیلوں کا پہلا ہوا
ملا خاک میں آب چہلا ہوا

کمر تک لگے پھنسنے دلدل کے بیچ
کہ نالے کا پانی تھا یکدست کیچ

پھنسے گاؤ اشتر گرے بار خر
ہوئے اسپ و اشتر بھی زیر و زبر

اگر چند باندھے تھے وہ جسر خام
ہوئے ایک ریلے میں دونوں تمام

نہ دیکھے تھے آگے کبھو یہ کمیں
و لیکن خدا نے اُتارا ہمیں

سلامت رہا اپنا اسباب سب
رہے لوگ لشکر کے کرتے عجب

چلے واں سے آگے بنڈیلا ملا
کیا اُن نے ایک ایک کو وہ ولا

عجب راہ پر خوف مشکل گزار
نہ ہوتے تھے معلوم ہاتھی سوار

خطر شیر کا شور بنگاہ کا
تعب واں کے جانے کا غم راہ کا

کہ جاؤ زمیں کچھ ہویدا نہ تھی
کہیں اس میں پگڈنڈی پیدا نہ تھی

گڑھے غار پاؤں کے لغزش بلا
چلی باؤ تو نئے کی لرزش بلا

صدا برگِ نئے کی نہایت مہیب
طریق عجب و مسافر غریب

جنوں پیشہ وہ دشت و وحشت شعار
کہ فیل اُس کے طفلان بازی مدار

کہیں پانی آیا سو حالت خراب
کہ تھا زیر کاہ اس میں ہر جائے آب

نہ ہاتھی نہ اسباب اپنے کنے
یہی اک میانہ بنے سو بنے۔

چنانچہ گئے راوتی کے کنار
نہ ربط آشنائی کسو سے نہ پیار

کھڑے ہم رہے ہاتھ پر رکھکے ہاتھ
کریں پار جانے کی کس منھ سے بات

کہار اک میانے میں اپنے دیئے
پھر اس کے جو تھے چاروں ہم نے لئے

چڑھ اُن کے سر آنروئے دریا ہوئے
ہوئے پانی پانی کہ رسوا ہوئے

نہ جانا کہ آتا ہے کس کا قدم
کہ صیدِ بیاباں گئے کرکے رم

گوزن ایک دو مار لائے کبھو
اُڑے باز جرّے کہیں ایک سو

نہ صید ایک دیکھا بھرے لاکھ رنگ
غزل میر نے بھی کہی اور ڈھنگ

چلے صبح گہ دامنِ کوہ کو
تماشا کناں فوج و انبوہ کو

درختوں میں چلنا تو دشوار تھا
ولے راستہ بھی قدیم وار تھا

گزارا ہوا یوں ہی اک آدھ کوس
پٹیلے پہ ہنگامہ آرا تھی اوس

نیستاں میں چھپتا تھا گھوڑے سوار
اگر ہو تو واں شیر کا ہو شکار

نہ رہتے تھے سو شیر شرزہ بھی واں
نہ ہاتھی کے پانوں کا پایا نشاں

پٹیلے سے کیلے کا جنگل ملا
پھر آ کر وہیں یہ جو دنگل ملا

عجب کشمکش درمیاں آ گئی
بھیر اک بلا تھی جہاں آ گئی

نہ ہلنے کی جا گہ نہ چلنے کو راہ
سروں پر کھڑے اسپ فیل سیاہ

خطر فیل دشتی کا ہر ہر قدم
گئے شیر کے ہر قدم پر قدم

کنار آب کے لوگ اُترے تمام
ہوئے دامنِ کوہ میں کچھ مقام

سرِ کوہ کیونکر نہ ہو چرخ سائے
کہ نواب واں سیر کرنے کو جائے

رہے آب پر فرش چوکی و تخت
خیمے رود کوہ و زہے ان کے بخت

ہمارا تو جانے کو چاہا نہ جی
کہ تھے پیر ہم واں ہو خوب تھی

رہی منعقد بزم تھا ناچ راگ
نہ ہو کچھ تو کیونکر ہو یہ دل کی لاگ

کہی اور ہی بحر میں یہ غزل
مگر میر کو ہے دماغی خلل

بہا سنگ ریزوں پہ اس رنگ آب
کہ قدر ان کی جوں قدر یاقوت ناب

لیے عمدہ ہاتھوں میں دیکھیں بہار
کہ ہر شے کا ہے وقت لیل و نہار

اسی آب کا رابتی یاں ہے نام
ہمیں ساتھ اس کے ہے ربط تمام

کنارے کنارے اسی کی ہے راہ
چلے جاتے ہیں جو نہ ہووے پناہ

جہاں تک ہے آب و خوراب جائیں گے
ہمیں دیکھیں گے جو نظر آئیں گے

جبل سے ہوئے ظاہر آثار آب
برسنے لگا قطرہ قطرہ سحاب

ہمیں پر نہیں کچھ ہوا کا ستم
کہیں گرگ وادی کو بھی ہے یہ غم

کہیں ایسے سکڑے ہیں حیوان دشت
کہ ٹکڑے کرو تو نہ ہوں گرم دشت

نہ نکلے ہے ہاتھی نہ بولے ہے شیر — کوئی یوز پکڑا ہے سو بعد دیر

اسد یکطرف یوز یکسو رہے — عجب یہ ہے باندھے گئے اژدہے

نہ پوچھو کھنچا دور کار شکار — نہ اب دشت و در میں نمر ہے نہ مار

شکار افگناں راہ کرے تھے طے — ملے جاتے تھے خاک میں دشت نے

نہ ببروں کو جنگل میں طاقت رہی — نہ نگروں کو پانی میں فرصت رہی

اسد مارے جاتے تھے سگ کی مثال — بندھے آتے تھے یوز و گرگ و غزال

ملا ایک پتھر اگر یا گڑھا — تو کثرت سے نو نیزہ پانی چڑھا

بہت مشکلوں سے کیا ہے عبور — کہ یک گام راہ اور سو سو فتور

غزل بحر کا جل میں تہ دار کہہ
کہ اڑ جائے میر اس بحیرے کی تہہ

بڑے جانور خوار کیا کیا ہوئے — بندھے پاؤں فیلاں سے رسوا ہوئے

بہت نالے کھولے پکھا لے گئے — بحیروں میں روہو نکالے گئے

نگر کی پس از مرگ نفرت ہوئی — کہ ہاتھی پہ چڑھنے کی رخصت ہوئی

کشف کا ہوا ہے یہ اوصاف اب — کہ جھینگوں نے کی شرح کشاف اب

نہ تیتر بٹیر اور کبوتر ملا — دیے باز جروں کو سارے کھلا

کہیں بحری پانی یوں جا لگے — کہ پنجوں میں بے صید ادھر آ لگے

ہوا میں سے یوں کر اتارے کلنگ — کہ بازوں نے چڑیا سے مارے کلنگ

کسو اور ارنوں کو دیکھا کھڑے — کہے تو بیاباں میں ہاتھی پڑے

جگر کر کے جاتے تھے مردان کار — تو وہ ایک دو کر ہی لاتے شکار

وگرنہ بشر کا نہ مقدور تھا — قریب اس کے جانا بہت دور تھا

نہ ان چار شانوں کا روکش ہے شیر — نہ سو فیل دو چار رکھتے ہیں گھیر

مدد گار تھے حضرت زندہ فیل — پکڑ لاتے تھے لوگ تب زندہ فیل

بحیرہ نہ دریائے اعظم سے کم — اٹھا کرتے تھے لجے لطمے بہم

ہر اک موج اس کی سمندر کی لہر — کنارے پہ گرداب غرقاب قہر

یہی جنگل اُس جھیل کے آس پاس — درختوں کا انبوہ نے کا اگاس
اسی بن میں شیر اور یوز و پلنگ — اسی بن میں گورو گوزن اور رنگ
اسی بن میں ہاتھی وہیں کرگدن — وہیں قوچ سر زن اسی میں ہرن
اسی بن میں لنگور بندر بھی تھے — وہیں ایک دو ہم قلندر بھی تھے
اسی بن میں پاڑھا وہیں نیل گاؤ — اسی بن میں صید بندی کا چاؤ
اسی بن میں تھے حضرت بو حمید — اسی بن میں نسناسی اُن کے مرید
اسی بن میں تھے خوک جاموش رنگ — کیا اس سوربن نے لوگوں کو تنگ
اسی بن میں رہنا اسی بن میں راہ — وہیں شام کا حسن لطفِ پگاہ
اسی بن میں وہ جھیل گہری بہت — ہوئے صید بری و بحری بہت
وہیں مچھلی بکتی تھی دمڑی کی سیر — ولیکن نہ کھاتا تھا ہو کوئی سیر
کہ اُس آب کا ہضم دشوار تھا — کہ جوں آب شمشیر دم دار تھا
شغال اور خرگوش جی سے گئے — شکاریِ سگ اُن کو اُچک لے گئے

غزل سے لگا ہے بہت میر دل
کہ اس مثنوی میں کہیں متصل

کنارے پہ تھی اسکے اک گل زمیں — سراسر ہری جوں زمرد نگیں
جہاں تک نظر جائے شاداب تھی — کہ یکدست واقع لب آب تھی
وہیں خیمے سب کے ہوئے تھے کھڑے — وہیں دام رہتے تھے اکثر پڑے
نواڑوں کی سیر اس میں ہر شام گہ — وہی سیر گاہ و وہی دام گہ
وہیں صید ہوں مرغ و ماہی تمام — مقام ایسے ہوویں تو کریے مقام
ہوا خیمہ آکر جو نواب کا — فلک سائے تھا فرق اس آب کا
ہوا ہو تاواں کاش دو آب زر — ہوئے جیسے شایستہ سیر نز
عجب ڈھب سے کی روشنی صد عجیب — کہ دیں چھوڑ نادین دیے بھر کے سب
جدا ہوویں غنچہ غنچہ چراغ — ملے جیسے عاشق کی چھاتی کے داغ
درے روشنی شعلہ انگیز نار — پرے سطح پانی کا آئینہ دار

ہوئیں کشتیاں کچھ در سے پرے — چراغوں سے موجوں کے کوچے بھرے
حبابوں میں تھی جو چراغوں کی تاب — حبابی تھا آئینہ سب سطحِ آب
نمودار چرخ پر انجم تھی شب — دلوں سے وہ پھیلاؤ پانی کا سب
غرض روشنی کی عجب کچھ تھی لاگ — لگادی ہے گویا کہ پانی میں آگ

غزل میر کوئی کہا چاہیے
کسو تو زمیں پر رہا چاہیے

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ — امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کسو سے ہوئی شاہ نامے کی فکر — کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
گیا شہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم — دل شاعراں رشک سے ہے دو نیم
کنھوں نے کہی عشق کی داستاں — ہوا کوئی کھانے سے ہم داستاں
پئے آصف الدولہ میں نے بھی میر — کہے صید نامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ مشہور ہو — گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو
رہے آصف الدولہٗ داد گر — سخنور نواز اور عاشق ہنر
دہش سے جہاں اُس کے رونق پذیر — وزیر ابن دستور ابن وزیر
کریمی کرے تو جہاں در جہاں — کف جود خورشید سا زرفشاں
سراپائے احساں تمامی ہمم — ہمہ تن مروّت سراسر کرم
ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار — یہ حرف و حکایت بھی ہے یادگار
قفائے غزل اک رباعی کہو — سخن آگے موقوف چپکے رہو
بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس — کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاع ہنر پھیر لے کر چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

☆☆

مثنوی ساقی نامہ

ہے قابل حمد وہ سر انداز
جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز

اُس کو مئے حسن نے چھکایا
ہستی کا نشہ اسی سے پایا

پی اُن نے شراب خود پرستی
طاری ہوئی اُس پہ زور مستی

وہ مست شراب ناز ہے فرد
خورشید ہے اس کا جام پردرد

ہے گردشِ چشم اس سے افسوں
پھر جائے ہے جسکے ساتھ گردوں

ظلمت ہے دوئی کی تجھ سے احول
آخر ہے وہی وہی ہے اوّل

عالم ہے قرابۂ مئے فام
ہے دور سپہر گردشِ جام

مشہور جہاں جو کیف و کم ہے
بے نشہ جو ہووے تو ستم ہے

وہ مست نیاز ہے حرم میں
وہ رفتۂ ناز ہے صنم میں

ہے آب رخ زمانہ اس سے
روشن ہے تمام خانہ اُس سے

مینا میں جو سرکشی ہے وہ ہے
صہبا میں جو دل خوشی ہے وہ ہے

شمشاد ہے سر فراز اُس سے
گل دیدۂ نیم باز اُس سے

خوگر اُسے ناز پیشگی ہے
وہ ہے کہ جسے ہمیشگی ہے

جو عکس پڑا ہے جام مے میں
آتی ہے صدا اسی کی نے میں

ہے جلوہ گری میں یاں بصد ناز
وہ مست گزارہ و سرانداز

سو رنگ ہیں اُس کے یاد رکھ تو
ہر جلوہ سے دل کو شاد رکھ تو

عالم میں جو کچھ نمود میں ہے
ہر لحظہ اُسے سجود میں ہے

کر یاد اُسی کو اور مئے پی
جیتا رہے کوئی دن تو خوش جی

اب روئے سخن چمن کو کریے
مینائے دل اور مئے سے بھریے

آئی ہے بہار مئے گساراں
پھولے ہیں چمن میں گل ہزاراں

آئی ہے بہار و ہر خیاباں — ہے لطف ہوا سے گل بداماں
آئی ہے بہار زہد کیشاں — ہے توبۂ بادہ دل پریشاں
آئی ہے بہار مرغ گلزار — کرتا ہے نوائے سینہ افگار
لایا ہے بزور اس کا نالہ — مجھ کو بھی برائے سیر لالہ
ساقی جو کروں میں بے ادائی — معذور رکھ اب بہار آئی
گل باد صبا کے تا کمر ہے — دامانِ بلند ابر تر ہے
غنچہ کی گلابیاں بھری ہیں — تکلیف کی منتظر دھری ہیں
ظالم مۓ ناب وے ہوا ہے — اک جرعہ شراب وے ہوا ہے
ہر سر میں ہے شور فصل دے کا — چمکے ہے ہوا سے رنگ مۓ کا
اطراف چمن کھلا ہے لالہ — ہر پھول شراب کا ہے پیالہ
آتا ہے چمن پہ ابر جوشاں — آب رُخ کار سبز پوشاں
تحریک نسیم دمبدم ہے — تکلیف ہوائے گل ستم ہے
ابروں نے بھی کی ہے مے پرستی — اُٹھتے ہیں بصد سیاہ مستی
بوندوں کا جو لگ رہا ہے جھمکا — رنگ گل و لالہ زور چمکا
ہے گل کی ہوا سبو کشی میں — بلبل کا دماغ بو کشی میں
ہر شاخ ہے شوخ جام در دست — نرگس ہے کسو کی نرگس مست
ہے رنگ ہوا کا آفتابی — جھومیں ہیں نہال جوں شرابی
ہے سرو جوان نشہ در سر — لوٹے ہے روش پہ سبزۂ تر
چشمک کرے ہے حباب جو کا — یعنی کہ ہے درد اب سبو کا

ساقی قدحے کہ ذوق مل ہے
مطرب غزلے کہ فصل گل ہے

ہو صرف شراب کاش ساقی — یہ شیشۂ عمر ہے جو باقی
بے ساغر مے خنک ہے جینا — رکھتا ہے شگوں شراب پینا
لا بادۂ کہنہ سالِ نو ہے — سجادہ بھی بابتِ گرو ہے

دروازۂ میکدہ کھلا ہے — ہر پیر و جواں کو الصلا ہے
اینڈے ہے ہر ایک مست جوں تاک — لیتے نہیں نام دامنِ پاک
ہر مغبچہ جام* زیرِ سر ہے — ہر گوشے میں عالمِ دگر ہے
مستی نگاہ عقل دشمن — خوبی خرام مرد افگن
کہتے گئے صاحب کرامات — ہم ہی نہیں قابلِ خرابات
جو لوگ کہ اس جگہ سے اُٹھے — کب حلقہ و خانقہ سے اُٹھے
مستی سے ہر ایک صبح صد بار — خورشید کا سر ہے اور دیوار
ہے قابل سیر خرقہ پوشاں — دریا دلی شراب نوشاں
ان لوگوں کی ہر کمینہ صف میں — کشتی ہے شہہ و گدا کی کف میں
ہر کوچہ میں رہتی تھی منادی — تا رسمِ خردوری اُٹھا دی
از خود شدن اک مقام ہیگا — وہ مرتبہ یاں مدام ہے گا
گو پر ہے یہ دور پر کہاں تک — اک لغزشِ پا ہے یاں سے واں تک
بیخود ہو کہ یہ حجاب اُٹھے — دل یاں سے کہیں شتاب اُٹھے
پہونچیں ہیں فنا کو بیخودی سے — پاتے ہیں خدا کو بیخودی سے
پی جرعۂ و ہوش کو دعا کہہ — ہر بادہ فروش کو دعا کہہ
جوشش میں ہے بادۂ کہن سال — عبرت ہو جسے خوش اسکا احوال
اب دل میں مرے بھی جوش آیا — اب وقت وداع ہوش آیا
کھینچوں میں کہاں تلک دمِ سرد — ساقی وہ شراب شعلہ پردرد
وہ داروے درد بے حضوراں — وہ مایۂ نورِ چشمِ کوراں
سرمایۂ عمرِ جاودانی — یعنے ہے* وہ آبِ زندگانی
وہ میوۂ خوش رسیدہ بارے — وہ عیش دل گزیدہ بارے
آئینۂ حسنِ خود پسنداں — زینت دہِ عنبریں کمنداں
وہ رنگ رخِ بہار یعنی — وہ بادۂ خوشگوار یعنی
یاقوت گداز دادۂ عشق — یعنی وہ ہے جام بادۂ عشق

وہ لطفِ ہوا وہ سیرِ مہتاب / وہ شعلۂ غوطہ خور وہ در آب
وہ کامِ دلِ سبو بدوشاں / یعنی کہ وہ ہے شراب جوشاں
وہ موجبِ دل خوشی کہاں ہے / وہ داروئے بے ہشی کہاں ہے
وہ جس کی طرف کو ہے تہہ دل / یعنی وہ ہے ماہ شیشۂ منزل
وہ آتشِ تیز آب آمیز / وہ عربدہ جو وہ فتنہ انگیز
وہ مقصدِ جانِ نا اُمیداں / وہ روسیہِ رو سفیداں
وہ رونقِ کار گاہِ شیشہ / وہ شوکتِ بارگاہِ شیشہ
وہ جس سے ہے تو بہ مو پریشاں / وہ جس سے ہو گفتگو پریشاں
وہ دامنِ خشک جس سے جلجائے / ثابت قدموں کا پانوں چل جائے
وہ سرخیِ چشمِ خوب رویاں / اسبابِ خرابی نکویاں
وہ دلبرِ خود سر و شر آئیں / وہ رہ زنِ راہ دین و آئیں
وہ جس سے غباروں سے دھوؤں / مینا کے گلے سے لگ کے روؤں
مستی کی مجھے بھی خواہشیں ہیں / اس عقل سے دل کو کاہشیں ہیں
لا اُس کو جو آستین جھاڑوں / پھر ہاتھ چلے تو جیب پھاڑوں
بیہوشِ شرابِ ناب رہیئے / یوں تا بہ کجا کباب رہیئے
ہے مستی بیخودی ضروری / کھل جائے مقامِ بے شعوری
دل غم سے بھرا ہے زور میرا / تا عرش گیا ہے شور میرا
ہے دل میں کہ گل کی اور رو ہو / شیشہ ہو بغل میں اور تو ہو
ہر گام پہ لغزشِ قدم ہو / تکلیف شراب و مبدم ہو
جب سجدہ کناں ہوں صبح خیزاں / جب کاکلِ صبح ہو پریشاں
جب نکلے ستارۂ سحر گہہ / کر نعرۂ الصبوح یک رہ
ہے ذوقِ شرابِ صبح گاہی / بے لطف نہیں ہے رو سیاہی
جب ہووے نشہ ترنگ آوے / مستی مجھے باغ میں لٹاوے
شیشہ مرے مُنھ کو تو لگاوے / کر ایسی نگاہ جو چھکاوے

جب بیخودی تمام آوے — سر پر مرے ہوش رو کے جاوے
رخصت ہے تجھے کہ میں نہ ہونگا — بیہوش و خرد ہی پھر رہوں گا
بیٹھا تو کروں گا شکر تیرا — ہو ورنہ قبول عذر میرا

مثنویات جذبات عشق

مثنوی شعلۂ شوق

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

محبت مسبب محبت سبب
محبت سے آتے ہیں کارِ عجب

محبت بن اس جا نہ آیا کوئی
محبت سے خالی نہ پایا کوئی

محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

محبت سے کس کو ہوا ہے فراغ
محبت نے کیا کیا دکھائے ہیں داغ

محبت اگر کار پرداز ہو
دلوں کے تئیں سوز سے ساز ہو

محبت ہے آبِ رُخِ کارِ دل
محبت ہے گرمیِ آزارِ دل

محبت عجب خوابِ خونریز ہے
محبت بلائے دل آویز ہے

محبت کی ہیں کار پردازیاں
کہ عاشق سے ہوتی ہیں جانبازیاں

محبت کی آتش سے اخگر ہے دل
محبت نہ ہووے تو پتھر ہے دل

محبت کو ہے اس گلستاں میں راہ
کلی کے دلِ تنگ میں بھی ہے چاہ

محبت ہی سے دل کو رو بیٹھیے
محبت میں جی مفت کھو بیٹھیے

محبت لگاتی ہے پانی میں آگ
محبت سے ہے تیغ و گردن میں لاگ

محبت سے ہے انتظامِ جہاں
محبت سے گردش میں ہے آسماں

محبت سے روتے گئے یار خون
محبت سے ہو ہو گیا ہے جنوں

محبت سے آتا ہے جو کچھ کہو
محبت سے ہو جو وہ ہرگز نہ ہو

محبت سے پروانہ آتش بجاں
محبت سے بلبل ہے گرمِ فغاں

اسی آگ سے شمع کو ہے گداز
اسی کے لیے گل ہے سرگرم ناز

محبت ہی ہے تحت سے تابطوق
زمین آسماں سب ہیں لبریز شوق

محبت سے یاروں کے ہیں رنگ زرد
دلوں میں محبت سے اُٹھتے ہیں درد

گیا قیس ناشاد اس عشق میں
کھپی جانِ فرہاد اس عشق میں

ہوئی اس سے شیریں کی حالت تباہ
کیا اس سے لیلیٰ نے خیمہ سیاہ

سُنا ہوگا وامق پہ جو کچھ ہوا | نل اس عشق میں کسطرح سے موا
جو عذرا پہ گزرا سو مشہور ہے | دمن کا بھی احوال مذکور ہے
ستم اس بلا کے ہی سہتے گئے | سب اس عشق کو عشق کہتے گئے
اس آتش سے گرمی ہے خورشید میں | یہی ذرے کی جان نومید میں
اسی سے دل ماہ ہے داغدار | کتاں کا جگر ہے سراسر فگار
نئے اسکے چرچے حکایت سُنی | گہے شکر گاہے شکایت سُنی
اسی سے قیامت ہے ہر چار اور | اسی فتنہ گر کا ہے عالم میں شور
کوئی شہر ایسا نہ دیکھا کہ واں | نہ ہو اُس سے آشوب محشر عیاں
کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی | کہاں خون سے غازہ کاری نہ کی
زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار | غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار

آغاز قصہ

عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا | عجب اہل عالم کو جس سے ہوا
کہ واں اک جواں تھا پر سرام نام | خوش اندام وخوش قامت وخوش خرام
جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ | گلستاں پہ کام اُسکی خوبی سے تنگ
جدھر نکلے رنگیں ادائی کے ساتھ | چلے جائیں جی خوش نمائی کے ساتھ
کھلے بال چلتا تھا وہ سرو ناز | قدمبوسی کو آتی عمرِ دراز
جدھر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو | قیامت اُدھر سے نمودار ہو
نگہ گرم اُس کی جدھر جا لڑی | کہے تو کہ اودھر کو بجلی پڑی
وے کافر بھوئیں ہوویں مائل جہاں | کریں سجدہ اس جا پہ اسلامیاں
نگہ تیغ مجروح جس کے پڑے | بلک سیل* جوں دل میں جا کر گڑے
سیہ چشم اُسکے دو بدمست تھے | نگاہوں سے شمشیر دردست تھے
رُخ اُسکا کہاں اور مہ و خور کہاں | تفاوت زمین آسماں کا ہے یاں
دولب لعل کو جن سے شرمندگی | دم حرف سرمایۂ زندگی

دہن کی جو تنگی نظر کیجیے / تو آگے سخن مختصر کیجیے
نہ ہم تم زنخ دیکھ حیراں رہیں / کبھی دست زیرِ زنخداں رہیں
سراپا میں اُس کے جہاں دیکھیے / وہیں روے مقصود جاں دیکھیے
خراماں نکلتا وہ جس راہ سے / قیامت تھی واں نالہ وآہ سے
فدا اُس پہ جی جان ہر ایک کا / کہ مقصود دل تھا بد و نیک کا
کئی گز دو پیش اُسکے وارفتگاں / کئی ایدھر اودھر جگر تفتگاں
بہت رفتگانِ ادائے کلام / بہت مبتلائے بلائے خرام
کوئی کشتۂ شوق رفتار کا / کوئی نیمجاں ذوقِ دیدار کا
کوئی والہ خندۂ برق وش / کسو کے تئیں جنبش لب سے غش
کسو کی نظر میں کمر کی لچک / کسو کے جگر میں پلک کی کسک
کئی حیرتی طرز گفتار کے / کئی آرزو کش ہے پرکار* کے
کوئی زلف سے اُسکی مجنوں رہے / کسو کا تبسم سے دل خوں رہے
کوئی دل ستم کشتۂ اک نگاہ / کوئی جاں ہونٹھوں پہ موقوف آہ
کسو پر فسوں گردشِ چشم کا / کسو پر غضب غمزۂ و خشم کا
کوئی دست بر دل کوئی بیقرار / کوئی بے خبر کوئی بے اختیار
انھوں میں سے اک عاشقِ زار تھا / اُس آفت کو اُس سے سروکار تھا
محبت میں تھا جذب کامل اُسے / مرا دو دل اپنی تھی حاصل اُسے
شب دروز ہم بستر کام دل / ہمیشہ ہم آغوش آرام دل
دم اُسکے میں یہاں تک تو تاثیر تھی / کہ صحبت اس آتش سے درگیر تھی
بہم ربط چسپاں بہم اختلاط / نہ کم ہوتی گرمی نہ کم اختلاط
مرد کوئی غم سے کوئی ہو ہلاک / وہ شعلہ اُسی خس سے رکھتا تپاک
کہاں حسن میں تھا وفا کا یہ پاس / یہ سُنیے کہ ہے گا خلاف قیاس
بہت سے بہت اُسکا مالوف تھا / اُسی کی تسلّی سے مصروف تھا
کہ ناگہ وہ دلبر ہوا کدخدا / رہا اپنے عاشق سے چندے جدا

زن و شو سے اخلاص باہم ہوا — اُس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا
نگاہیں بہم دل میں کاوش کریں — سخن سے وفائیں تراوش کریں
ہوا ربط چسپاں بہم اس قدر — کہ دشوار اُٹھے ہمد گر سے نظر
رہیں دونوں دست وبغل روز وشب — کبھو مُنھ پہ مُنھ ہو کبھو لب پہ لب
وفا نے جو تکلیف کی ایک روز — گیا اپنے عاشق کے وہ دل فروز
گئی دن میں جا کر جو اس سے ملا — کیا اُس نے حد سے زیادہ گلا
کہ اے نازنیں آہ کن نے کہا — کہ تو حال سے میرے غافل رہا
مگر سدّ رہ تھا کسو کا فریب — ملا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب
کوئی زلف زنجیر پا ہوگئی — کہ مسدود راہِ وفا ہو گئی
طرح کس کی چتون کی دل میں کھبی — جگر میں پلک شوخ کس کی چبھی
کسو چشم نے تجھ کو جادو کیا — مرے جام عشرت کو لوہو کیا
کہا اُن نے تھی کد خدائی مری — نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری
رکھ اب مجھ کو معزور ناچار ہوں — محبت کا میں نو گرفتار ہوں
نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام — طرف اُس کے ہے دل کو میل تمام
اُسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے — دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے
اُسے مجھ سے ہے نسبت عاشقی — وہ رہتی ہے بے طاقت عاشقی۔
نہیں اُس کو یک لحظہ تابِ فراق — جُدائی مری اُس پہ گزرے ہے شاق
نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن — تو پاتا ہوں جا کر اُسے نیمجان
: دیکھے جو مجھ کو تو مر جاوے وہ — وہیں جی سے اپنے گزر جاوے وہ
جو پہونچے مری جھونٹھ اُسے بدخبر — تو کر بیٹھے بچ اپنے جی کا ضرر
غرض اُس کو تاب و تحمل نہیں — شکیبائی ہجر بالکل نہیں
یہ سُن کر کہا اس دل فگار نے — ستم کشتۂ دوری یار نے
کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول — یہ مکرِ زناں ہیں تو ان پر نہ بھول
وفا کن نے ان ناقصوں میں سے کی — موا شوے کسکا کہ وہ پھر نہ جی

بہ ظاہر میں ہوں ہر چند رشک ماہ
ولیکن ہیں باطن میں مار سیاہ

خدا مکر سے ان کے دے ہے خبر
نہیں ان سے کوئی فریبندہ تر

جہاں میں فریب ان کا مشہور ہے
زبانوں پہ مکر اُن کا مذکور ہے

پئے امتحاں عاقبت یک نفر
مقرر ہوا تا کہ جا اُس کے گھر

کہے غرق دریا ہوا پرسرام
ہوئی زندگانی کی صبح اُس کی شام

گیا تھا نہانے کو وقتِ سحر
سو ڈوبا وہ خورشید روشن گہر

کیا موج دریا نے سر سے گزار
اُٹھا طبع نازک سے اُس کے غبار

وہ گیسو جو بکھرے تھے بالائے آب
سواب موجِ دریا کو ہے پیچ وتاب

پھریں تھیں جو وے انکھڑیاں آب میں
سووے گردشیں اب ہیں گرداب میں

تمنا میں تھے جسکے سب دل فگار
سو دریا کو اب ہے وہ بوس و کنار

نہ سمجھا وہ نا فہم اسرارِ عشق
نہ سوچا وہ ناتجربہ کار عشق

کہا غرقِ دریا ہوا پرسرام
ہوا کام اُس رشک مہ کا تمام

کہے تو کہ موجوں کو تھا انتظار
کہ دست و بغل ہوگئیں ایک بار

گیا بیٹھ پانی میں ایسا شتاب
کہ گویا لبِ آب کا تھا حباب

کنارے پہ دریا کے اک شور ہے
بحالِ خراب ایک جمہور ہے

گرے ہیں کئی آشنا آب میں
کئی آتشِ غم سے ہیں تاب میں

کوئی سر پر اس غم سے ڈالے ہے خاک
کسی نے کیا ہے گریباں کو چاک

ہمیں داغ وہ دُر تر دے گیا
بہت آب یہ ماجرا لے گیا

سُنا اس کی ہمسر نے جب یہ سخن
ہوا موجِ زن بحر رنج و محن

نگہ اک طرف در کے مایوس کی
دم سرد کھینچا گیا ڈوب جی

وہی بے خودی رخصتِ جان تھی
وہ اک دم کی گویا کہ مہمان تھی

گری ہو کے بیجان وہ درد مند
ہوا شور نوحے کا گھر سے بلند

موئی گم میں اس جملہ تن ناز کے
گئی جان ہمرہ سخن ساز کے

وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا
کہ اس واقعے سے پشیماں گیا

خبر لے گیا اُس کنے زود تر
جو تھا در پئے امتحاں بے خبر

کہ وہ رشک مہ امتحاں دے گئی
محبت کے ناموس کو لے گئی

موا سن پرسرام کے تئیں موئی
مرے اک سخن میں قیامت ہوئی

اگرچہ نہ کچھ اُن نے منھ سے کہا
دیا جی و لے جی اسی میں رہا

یہ سُن کر وہ نافہم حیراں ہوا
خجالت سے سر در گریباں ہوا

گیا ہوش سُن کر پرسرام کا
دوانہ ہوا عشق کے کام کا

اُٹھا بیخود و بے خرد بے حواس
گرا آکے اس پیکرِ مردہ پاس

لگا کہنے اے مایۂ زندگی
مجھے مُنھ سے تیرے ہے شرمندگی

کیا جلد رحلتِ سفر تونے بار
نہ میرا کیا آہ ٹک انتظار

نہ میری سنی کچھ نہ اپنی کہی
مرے تیرے دونوں کے جی میں رہی

زمیں پر سے آخر اٹھایا اسے
لبِ آب جاکر جلایا اُسے

جب آگ اس کے پیکر پہ سب چھا گئی
محبت عجب داغ دکھلا گئی

یہ گرمِ فریاد و زاری ہوا
لہو اُس کی آنکھوں سے جاری ہوا

جگر غم میں یک لخت خوں ہوگیا
رُکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا

گئے ہوش و صبر اس کے یکبارگی
طبیعت میں آئی اک آوارگی

سراسیمگی سے بگولا ہوا
پھرے اس طرح جیسے بھولا ہوا

نہ جی کو تسلی نہ دل کو قرار
کفِ غم میں سر رشتۂ اختیار

کبھو یاد کر اُس کو نالاں رہے
کبھو ٹک جو بھولے تو حیراں رہے

کبھو یاں کبھو واں بحال خراب
وہی بے قراری وہی اضطراب

رہے گھر تو آشوبگہ وہ گلی
چمن میں جو لیجائیں تو بے کلی

کبھو متصل ہونٹھ پر آہ سرد
کبھو دست بردل کہ دل میں ہے درد

ہوئی رفتہ رفتہ جو وحشت زیاد
لگا بھاگنے سب سے وہ نامراد

کچھ اپنے بدو نیک کی سُدھ نہیں
نکل جائے تنہا کہیں کا کہیں

کبھو جاکے صحرا سے لاویں اسے
کبھو روتے دریا پہ پاویں اُسے

کبھو خاک ملتا ہے منہ پر کھڑا
کہیں ہے خرابی میں بے سُدھ پڑا

سر شام اک روز دریا گیا
ہوئی رات واں سے نہ آیا گیا

کنارے پہ رہتا تھا ایک دام دار
رہا رات اُسکے یہ قرب و جوار

کہا اُس کی عورت نے اُس رات کو
نہیں تجھ سے جی چاہتا بات کو

تجھے فکر اب کچھ ہماری نہیں
تو جاتا نہیں شام سے اب کہیں

ترا شب کو دریا میں پڑتا تھا دام
تو چلتا تھا بارے معیشت کا کام

تو جاتا نہیں شب کو جس روز سے
معیشت ہے اندوہ جاں سوز سے

نہیں طاقتِ صبر ہم کو تنک
بہت دیر ملتا ہے نان و نمک

وہ بولا کہ میں بھی پریشان ہوں
بہت تنگ دستی سے حیران ہوں

کہوں کیا کئی روز سے شام کو
اُٹھاتا ہوں میں اس سبب دام کو

کہ یک شعلہ تند پر پیچ و تاب
فلک سے اترتا ہے نزدیک آب

کوئی دم تو رہتا ہے سرگرم گشت
کبھی سوئے دریا کبھی سوئے دشت

ٹھہرتا جو ہے پھر کنارے پہ واں
کہے ہے پرسرام تو ہے کہاں

یہ آتش مرے دل کی کیونکر بجھے
عدم میں بھی میں نے نہ پایا تجھے

کیا عشق نے مجھ کو آتش کا باب
نہ چھڑکا مری آگ پر تونے آب

گیا وہ یہ کہہ کر سوئے آسماں
رہے ہے مجھے رات دن خوفِ جاں

سُنا حال شعلہ کا صیاد سے
دھواں ایک اُٹھا جانِ ناشاد سے

ہوا شعلۂ شوق دل سے بلند
رہا لوٹتا آگ میں جوں سپند

گئی رات جوں توں ہوئی صبح جب
زیادہ ہوئی عشق کی تاب و تب

محبت نے کی اشتعالک کہ وہ
سراسیمہ آیا چلا اس جگہ

جہاں سے اُٹھی تھی یہ آتش سلگ
پھر اس کے جگر کو لگی گھر کو لگ

تبسم کناں واں یہ ان نے کہا
کہ کلفت میں غم کی بہت میں رہا

چلو سیر گشتی کو ہنگامِ شب
لب آب خالی کریں دل کو سب

ہوا سو ہوا یوں نہیں تقدیر تھی
جہاں سوز اُلفت کی تاثیر تھی

نہ ہوتے جو دیگر یاں متصل
نہ ہوتی یہ آتش کبھو مشتعل

کیاں عقل کی اُن نے باتیں جو واں
وہ عاشق جو تھا در پئے امتحاں

لگا کہنے یہ آرزو تھی مجھے
کہ اک روز ہشیار دیکھوں تجھے

سو یہ دن خدا نے دکھایا مجھے
سخن تیرے منھ کا سُنایا مجھے

ندامت سے ہوں تنگ شاہد ہیں سب
گرفتار ہوں میں بحال عجب

نہ خجلت سے رو ہے جو کچھ میں کہوں
نہ قدرت اجل پر کہ مر بھی رہوں

نہ تقدیر کا میں نے سمجھا فریب
نہ جانا کہ اتنی ہے وہ نا شکیب

ہوا اک سخن میں مرے یہ غضب
خرابی کا تیری ہوا میں سبب

کروں گا زمانہ میں جب تک معاش
رہوں گا اسی درد سے دلخراش

مقرر کیا ہے کئی دن سے یہ
کہ آئندہ رہئے تری خاک رہ

جو اس میں ہے خوش تو تو ہوں میں بھی سات
رہینگے لب آب ہی آج رات

دل پر کو خالی کریں گے بہم
پھریں گے ترے ساتھ خوش کوئی دم

ہوئے عاقبت سوئے دریا رواں
نہ پیدا کسو پر یہ رازِ نہاں

کہ اک آگ سلگی ہے واں یک کنار
محبت کمیں میں ہے سرگرم کار

کسو اشتعالک کی ہے منتظر
جہاں سر کو کھینچا قیامت ہے پھر

ہوئے ناؤ پر شام جب گہ سوار
کہا اُن نے یاں ایک ہے دام دار

جہاں قفل ہو راہ دریا تو واں
کفایت ہے اُس گلبدن کی زباں

اُسے سات لو تو بڑی بات ہے
کہ دریا میں پھرتا ہے اور رات ہے

لیا آخر الامر ہمراہ اُسے
بٹھایا قریب اپنے یہ کہ اُسے

تنک دور چل کیا یہ سوال
مجھے ہے ترے حرف شب کا خیال

کہاں شعلۂ سرکش آتا ہے یاں
کدھر پیچ وتاب آ کے کھاتا ہے یاں

کہاں لے ہے دریا پہ اکدم قرار
کدھر مضطرب ہو کرے ہے گزار

ٹھہرتا ہے کس جا وہ آتش فگن
طرف کون سے ہو ہے گرم سخن

یہ صیاد سے تھا ہی محو سراغ
جگر آتش شوق رکھتی تھی داغ

کہ ہوکر فروغ اک سوے آسماں / تڑپنے لگا جیسے آتش بجاں
کوئی دم میں دریا پہ آیا فرود / ہوا نیزہ بالا سبھوں کا نمود
لب و آب دو شعلۂ جاں گداز / تڑپ کر بہت بازبان دراز
پکارا کہاں ہے پرسرام تو / محبت کا ٹک دیکھ انجام تو
کہ میں جملہ تن آتش تیز ہوں / دل گرم سے شعلہ انگیز ہوں
بھڑکتی ہے جب آگ دل کی مرے / لب آب اتروں ہوں غم میں ترے
مگر سوزشِ دل ہو کم آب سے / بجھے جی مرا اس تپ و تاب سے
سو یہ آب رکھتا ہے روغن کا کام / کیا عشق نے آہ دشمن کا کام
یہ بیتاب سن کر ہوا بیقرار / سفینے سے اترا بصد اضطرار
ہوا ہمدم اس آتش انگیز سے / کہا اس بلائے دل آویز سے
کہ میں ہوں پرسرام خانہ خراب / مرا دل بھی اس آگ سے ہے کباب
مرے بھی جگر میں یہی سوز ہے / یہی مجھ کو جلنا شب و روز ہے
محبت تری برق خرمن ہوئی / تری دوستی جی کی دشمن ہوئی
سخن مختصر کچھ وہ شعلہ چلا / کچھ اک اپنی جاگہ سے یہ دل جلا
بہم گرمجوشی سے یک جا ہوئے / کہ گزری تھی مدت بھی تنہا ہوئے
وہ شعلہ رہا ایک جا مشتعل / کہے تو تسلی ہوئے جان و دل
یکا یک بھڑک کر وہ جلنے لگا / پھر ایدھر اُودھر پھرنے چلنے لگا
کیا پاس پانی کے آکر صعود / رہی روشنی سی کوئی دم نمود
پھر آگے کسو پر نہ پیدا ہوا / نجانا کہ وہ شعلہ پھر کیا ہوا
خبردار ہو اہل کشتی تمام / لگے کہنے باہم نہیں پرسرام
اُٹھے ڈھونڈھنے ہو کے سب ناصبور / کنارے پہ دریا کے نزدیک و دور
نہ پایا کہیں اُس کو حیراں ہوئے / نہایت ہی خاطر پریشاں ہوئے
وہ صیاد بولا کہ دوں میں نشاں / گیا تھا سوئے شعلہ یہ نوجواں
یہ اور آگ دونوں ہوئے ہم سخن / وہ شعلہ ہوا اس پہ آتش فگن

یہ جوشش تو یاں سے تھی مد نظر | پھر آگے نہیں اُس کی مجھ کو خبر
نہ ہو آتشِ غم سے پہلے ہی داغ | چلو اُس طرف کو جو نکلے سراغ
گئے مضطرب جاں سارے رواں | تڑپتا تھا وہ شعلہ آکر جہاں
تلاش اُسکی کی اور لے لے کے نام | پکارے بہت پر کہاں پرسرام
محبت نے ایسا کھپایا اُسے | کہ ہرگز کنھوں نے نہ پایا اُسے
یقینی ہوا یہ کہ وہ تیز آگ | اُسی نیم کشتہ سے رکھتی تھی لاگ
لپٹ اس کو شعلہ ہی وہ لے گیا | عجب طور کا داغ یہ دے گیا
پھرے خوار ہو ہو کے ناچار سب | کسی کو تحیر کسی کو عجب
کوئی منفعل ساتھ آنے سے تھا | کوئی برلب آب جانے سے تھا
خصوصاً وہ عاشق ہوا پر خجل | ندامت ہوئی یہ جسے متصل
نہ تھا اگلی خجلت ہی سے روے حرف | ہوا دوسرا ماجرائے شگرف
تفکر کے دریا میں ڈوبا ہوا | کنارے پہ بیٹھا تھا روتا ہوا
کہ پوچھیں گے جو اس کے واماندگاں | تو یہ واقعہ کیا کروں گا بیاں
کہوں کیونکہ یکبار وہ جل گیا | کفِ خاک ہو خاک میں مل گیا
کھنچی جرم کو بے گناہی مری | ہوئی شہر میں روسیاہی مری
وہ شعلہ جلاتا مجھے کاشکے | لیے ساتھ جاتا مجھے کاشکے

مقولۂ شاعر

اگر ہے یہ قصہ بھی حیرت فزا | ولے میرؔ یہ عشق ہے بد بلا
بہت جی جلائے ہیں اس عشق نے | بہت گھر لٹائے ہیں اس عشق نے
فسانوں سے اسکے لبالب ہے دہر | جلائے ہیں اس تند عاشق نے شہر

محبت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوڑے یہ عاشق نہ معشوق کو

مثنوی دریائے عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی چال

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سر میں جنوں ہو کے رہا

کہیں رونا ہوا ندامت کا
کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا

گہ نمک اُس کو داغ کا پایا
گہ پتنگا چراغ کا پایا

واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ
یاں تبسّم ہے زخم تر کے بیچ

کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے
کہیں یہ خونچکاں شکایت* ہے

تھا کسی دل میں نالۂ جانکاہ
ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ

تھا کسو کی پلک کی نمناکی
ہے کسو خاطروں کی غمناکی

کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا
کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کہیں اندوہ جان آگہ تھا
سوزش سینہ ایک جاگہ تھا

کہیں عشاق کی نیاز ہوا
کہیں اندوہ جاں گداز ہوا

ہے کہیں دل جگر کی بیتابی
تھا کسو مضطرب کی بیخوابی

کسو چہرے کا رنگ زرد ہوا
کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا

طور پہ جا کہ شعلہ پیشہ رہا
بیستوں میں شرار تیشہ رہا

کہیں نے بست کو لگائی آگ
کہیں تیغ و گلو میں رکھی لاگ

کبھو افغان مرغ گلشن تھا
کبھو قمری کا طوق گردن تھا

کسو مسلخ میں جا قنارہ ہوا
کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا

ایک عالم میں دردمندی کی
ایک محفل میں جا سپندی کی

ایک دل سے اُٹھے ہے ہوکر دود — ایک لب پر سخن ہے خون آلود
اک زمانے میں دل کی خواہش تھا — اک سمیں جگر کی کاہش تھا
کہیں بیٹھے ہے جی میں ہوکر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
خار خارِ دلِ غریباں ہے — انتظارِ بلا نصیباں ہے
کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا — کہیں نوحہ ہے جان پر غم کا
آرزو تھا امیدواروں کی — دردمندی جگر فگاروں کی
نمک زخم سینہ ریشاں ہے — نگہ یاس مہر کیشاں ہے
حسرت آلود آہ تھا یہ کہیں — شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک اعجوبہ — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محروم وصل یاں سے گیا — کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکّا ہے — ہاں یہ نیرنگ ساز پکّا ہے
جس کو ہو اُس کی التفات نصیب — ہے وہ مہمانِ چند روزہ غریب
ایسی تقریب ڈھونڈھ لاتا ہے — کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغاز قصۂ جانگداز

ایک جا ایک جون رعنا تھا — لالہ رخسار و سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اُس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اُسکو صورتِ خوش سے — اُنس رکھتا تھا وضع دلکش سے
تھا طرحدار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
کوئی ترکیب اگر نظر آتی — صورتِ حال اور ہو جاتی
دیکھتا گر وہ کوئی خوش پُر کار — رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار
زلف ہوتی کسو کی گر برہم — دیکھتے اُس کے حال کو درہم
دیکھتا گر کہیں وہ چشم سیاہ — دل سے بے اختیار کرتا آہ
سر میں تھا شور شوق دل میں تھا — عشق ہی اُسکے آب و گِل میں تھا

الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب
ناشکیبار ہے تھا بے محبوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا
سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا
کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا
اک خیابان میں سے ہو نکلا
ایک سائے تلے سے رو نکلا
نہ تسلّی ہوا دلِ بیتاب
نہ تھا چشم تر سے خونِ ناب
دل کی واشد سے بے توقع ہو
ہر شجر کے تلے بہت سا رو
دیکھ گلشن کو نا اُمیدانہ
مُنھ کیا اُن نے جانب خانہ
دل کے رُکنے کا اُسکو اک غم تھا
راہ چلنے میں خیال درہم تھا
ناگہ اُس کوچے سے گزار ہوا
آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ
تھی طرف اُسکے گرم نظارہ
پڑگئی اُس پہ اک نظر اُس کی
پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی
وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بیقراری نے کج ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی
مُنھ جو اُس کا طرف سے اُس کے پھرا
مضطرب ہوکے خاک پر یہ گرا
وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اُسکا
بیطرح ہووے گو کہ حال اُس کا
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ
اُٹھ گئی سامنے سے یکبارہ
وہ گئی اُس کے سر بلا آئی
خاک میں مل گئی وہ رعنائی
دل پہ کرنے لگا گریباں تک
چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک
طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگ خوں کیا پیدا
سوزشِ دل نے جی میں جاگہ کی
داغ نے آ جگر کو آتش دی
بستر خاک پر گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دل بیمار
خاطر افگار خار خار ہوئی
جان تمنا کشِ نگار ہوئی
اُس کے مُنھ پر پڑی جو اُس کی نگاہ
نا اُمیدی کے ساتھ ہی سر کی آہ

خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ
رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ

ہونٹھ سوکھے تو خون ناب ملا
خواب و خور دونوں کو جواب ملا

خلق اُس کی ہوئی تماشائی
پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی

کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے
رو دیا اُن نے ایک حسرت سے

جاکے اُس کے قریب در بیٹھا
قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا

دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا
شوق نے کام کو خراب کیا

جو کہ سمجھے تھے اُس کو دیوانہ
رحم کرتے تھے آشنا یا نہ

عاشق اُس کو کسو کا جان گئے
سب برا اس ادا کو مان گئے

کیونکہ باہم معاش تھی سب کی
ایک جا بود و باش تھی سب کی

وارث اُس کے بھی بدگمان ہوئے
درپئے دشمنی جان ہوئے

مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں
دفعتاً اُس بلا کے تئیں ٹالیں

پھر یہ ٹھہری کہ ہوئنگے ہم بدنام
سُن کے آخر کہیں گے خاص و عام

کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا
کن نے مارا اُسے کہاں مارا

ہووے یہ خون خفتہ گر بیدار
کھینچتی ہووے خفتِ بسیار

کیجیے ایک ڈھب سے اُس کو تنگ
تا نہ عاید ہو اپنی جانب ننگ

تہمتِ خبط رکھئے اُس کے سر
کیجیے سنگسار اُس کو پھر

دے کے دیوانہ اُس جواں کو قرار
ہوگئے سارے درپئے آزار

ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا
ایک نے آکے زیرِ سنگ کیا

ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر
ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر

کی اشارت کہ کودکانِ شہر
آئے لبریز غصۂ و پر قہر

گرچہ ہنگامہ اُسکے سر پر تھا
لیک روئے دل اُسکا اودھر تھا

محو تھا اُس کے یہ خیال کے بیچ
تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ

مونٹھ پر محسن کا بیان اُس کا
تھا سرو سنگ آستاں اُس کا

ایک دم آہِ سرد بھر اُٹھنا
نالۂ گرم گاہ کر اُٹھنا

جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے
اس طرف یک نگاہ مشکل ہے

دوست کو میرے نام سے ہے ننگ
دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ

چشم تر سے لہو بہا کرتا
صبح کے باد سے کہا کرتا

کاے نسیمِ سحر یہ اُس سے کہہ
مت تغافل کر اور غافل رہ

ان بلاؤں کوئی کیونکہ جیے
جان پر آبنی ہے تیرے لیے

جان دوں تیرے واسطے سو تو
آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی
دور پہونچی ہے میری رسوائی

نام کو بھی ترے نہ جانا آہ
تجھ سے کیونکر سخن کی نکلے راہ

ناامیدانہ گر کروں ہوں نگاہ
دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد
ایک میں خوں گرفتہ سو جلاّد

کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق
بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق

نالہ ہوتا ہے گہ گہے دل جو
گریہ آنسو سے پونچھتا ہے کبھو

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل
جی ہے اس سے اسیر آب و گل

ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی
صورت اک معنیٔ نہاں ہوتی

اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات
ایک میں اور کتنے تصدیعات

سنگباراں سے سخت ہوں دلتنگ
شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ

محرم یک نگاہ بیش نہیں
کم ہے سینے میں جا کہ ریش نہیں

کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ
اک قیامت بپا ہے یاں سرراہ

کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز
اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز

بس تغافل ہوا ترحم کر
گوشِ دل جانب تظلم کر

کون کہتا ہے رہ بہ محوِ ناز
پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز

اُن بلاؤں پہ ان نے صبر کیا
اختیار اپنے جی پہ جبر کیا

اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا
اس کے اندوہ سے نہ مُنھ موڑا

اور یہ ماجرا ہوا مشہور
شور رسوائیوں کا پہونچا دور

دیکھ کر اُس کو بیخور و بیخواب
جانا ہر اک نے عاشقِ بیتاب

مُنھ پر اُس کے جو رنگ خون نہیں
عشق ہے اسکو یہ جنون نہیں

ہے نگہ اُس کی جس طرف مائل
اُس طرف ہی گیا ہے اسکا دل

جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں
چاہ ثابت ہوئی اُسے گھر میں

عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا
مضطرب کد خدائے خانہ ہوا

گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی
بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی

یاں سے یہ غیرتِ مہ تاباں
جا کے چندے کہیں رہے پنہاں

شب محافے میں اُسکو کر کے سوار
ساتھ دے ایک دایۂ غدّار

پار دریا کے جلد رخصت کی
اس طرح فکر رفع تہمت کی

گھر تھا اک آشنا کا مدِّ نگاہ
واں ہو روپوش تا یہ غیرتِ ماہ

ہووے جب اس بلا سے خاطر جمع
نور افزائے خانہ ہو جوں شمع

گھر سے باہر محافہ جو نکلا
اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا

طپش دل سے ہو کے یہ آگاہ
ہو لیا ساتھ اُس کے بھر کر آہ

واں کے رہنے سے اُسکو کام نہ تھا
وہ گلی اس کا کچھ مقام نہ تھا

جس سے جی کو کمال ہو اُلفت
جس سے دل کی درست ہو نسبت

جنبش اُس کی پلک کو گرداں ہو
دل میں یاں کاوش نمایاں ہو

واں اگر موشکست کا ہو باب
یاں رگ جاں کو ہووے پیچ و تاب

واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار
دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار

یار کو درد چشم اگر ہووے
چشم عاشق لہو میں تر ہووے

چاک دامن ہیں واں پے زینت
یاں گریباں ہے چاک گل کی صفت

واں دہن تنگ یاں ہے دلتنگی
حسن اور عشق میں ہے یکرنگی

دست افشاں وہ پائے کوباں یہ
تھا محافے کے ساتھ گرم رہ

قطرہ زن اشک سا وہ راہ تمام
درپے یار تھا یہ بے آرام

ہر قدم تھا زبان پر جاری
خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری

ہمسری اُس کی تھی میسر کب
ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب

شوق مفرط نے بے تہی کی سخت
نوشکیبی نے دل سے باندھا رخت

رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے
اُڑنے لاگے جگر کے پرکالے

اضطراب دلی نے زور کیا
ان نے بے اختیار شور کیا

دل کے غم کو زبان پر لایا
آفت تازہ جان پر لایا

کاے جفا پیشۂ و تغافل کیش
اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش

مُنھ چھپایا ہے تو نے اسپر بھی
نگہ التفات ادھر بھی

صبر کس کس بلا سے کر گزروں
چارہ اس بن نہیں کہ مرگزروں

منزلِ وصل دور میں کم پا
تجکو اس مرتبے میں استغنا

ہے تو نزدیک دل سے اے طناز
لیک تجھ تک سفر ہے دور دراز

ناز نے یک نفس نہ رخصت دی
آئینے نے تجھے نہ فرصت دی

تو تو واں زلف کو بنایا کی
جان یاں پیچ و تاب کھایا کی

تجھ کو تھی اپنے خالی رُخ پہ نگاہ
دل مرا مبتلائے داغِ سیاہ

تجھ کو مد نظر تھی اپنی چال
میں ستمکش ہوا کیا پامال

بسترِ خواب پر تجھے آرام
مجکو خمیازہ کھینچنے سے کام

واں لبِ لعل تیرے خنداں تھے
یاں فسردہ جگر پہ دنداں تھے

ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے
رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر
حال پر میرے ٹک تاسف کر

گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن
تھی وہ اُستاد کار حیلۂ و فن

پاس اُس کو بُلا تسلی کی
وعدۂ وصل سے تشفی کی

کاے ستم دیدۂ غمِ دوری
ہو چکا اب زمانِ مہجوری

زار نالی نہ کر شکیبا ہو
عشق کا راز تا نہ رسوا ہو

دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے
چل کوئی دم کو داد خواہش دے

سخت دلتنگ تھی یہ غیرت ماہ — قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ
گرچہ یہ حُسنِ اتفاق سے ہے — اُسکی بھی جذب اشتیاق سے ہے
تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا — نشۂ دوستی زیادہ ہوا
بزمِ عشرت کریں گے باہم ساز — ہو جو اب اپنے دوست کا دمساز
دے کر اُس کو فریب ساتھ لیا — دلِ عاشق کو اپنے ہاتھ لیا
لیک در پر وہ اُن نے یہ ٹھانی — کیجیے اُس سے خصمی جانی
یہ تو دل تفتۂ محبت تھا — سخت وارفتۂ محبت تھا
وقت نزدیک تھا جو آپہونچا — تا سر آب پا بپا پہونچا
آب کیسا کہ بحر تھا ذخار — تند و مواج و تیرۂ و تہ دار
موج کا ہر کنا یہ طوفاں پر — مارے چشمک حباب عماں پر
ہمکنار بلا ہر اک گرداب — لجہ سر مایہ بخش تیرہ سحاب
گزرِ موج جب نہ تب دیکھا — ساحل اُس کا نہ خشک لب دیکھا
کشتی اک آن کر ہوئی موجود — ہو فلک سے ہلال جیسے نمود
کی کنارے پہ لا کے استادہ — تھا محافہ رکوب آمادہ
اس سفینے میں جلد جا پہونچا — یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہونچا
بیچ دریا میں دایہ نے جاکر — کفش اس گل کی اسکو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اِکبار — اور بولی کہ اور جگر افکار
حیف تیرے نگار کی پاپوش — موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش
غیرت عشق ہے تو لا اُس کو — چھوڑ مت یوں برہنہ پا اُسکو
اُس طرف آب کے اُترنا ہے — اس نواحی کی سیر کرنا ہے
پانوں اُس کے جو ہیں نگار آلودہ — ظلم ہے ہوویں گر غبار آلودہ
جس کفِ پا کو رنگ گل ہو بار — منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار
ان پہ نرمی میں گل سے ہوں جو پرے — آبلہ چشم کو سیاہ کرے
یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو — مفت ناموسِ عشق کو مت کھو

جی اگر تھا عزیز اے ناکام
کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

سنکے یہ حرف دایۂ مکار
دل سے اسکے گیا شکیب و قرار

بے خبر کارِ عشق کی تہ سے
جست کی اُن نے اپنی جاگہ سے

تھا سفینے میں یا کہ دریا میں
موج زنجیر ہو گئی پا میں

کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب
تھی کشش عشق کی مگر تہ آب

کہتے ہیں ڈوبتے اُچھلتے ہیں
لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں

ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے
غرق دریائے عشق کیا نکلے

عشق نے آہ کھو دیا اُس کو
آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

جبکہ دریا میں ڈوب کر وہ جوان
کھو گیا گوہرِ گرامی جان

دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد
واں سے کشتی چلی برنگِ باد

خار خار دلی سے فارغ ہو
لے گئی پار اُس گل نو کو

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے
فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

خاک ہو کیوں نہ عاشق بیدل
کام سے اپنے یہ نہیں غافل

وصل جیتے نہ ہو میسّر اگر
لاوے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عاشق اگر گئے ناشاد
خاک خوباں بھی اُن نے دی برباد

قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ
آئی وہ رشک مہ زخود رفتہ

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ
ہو گیا غرق وہ فرد مایہ

اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا
آرزو مند اس جہاں سے گیا

تھے جو ہنگامے اسکے حد سے زیاد
ساتھ اُسکے گئے وے شور و فساد

شور فتنے تھے اس تلک سارے
ابتو بدنامیاں نہیں بارے

دل تڑپتا ہے متصل میرا
مرغ بسمل ہے یا کہ دل میرا

وحشتِ طبع اب تو افزوں ہے
حال جی کا مرے دگرگوں ہے

بیدماغی کمال ہوتی ہے
جان تن کے وبال ہوتی ہے

دل کوئی دم میں خون ہوویگا
آج کل میں جنون ہووے گا

بیکلی جی کو تاب دیتی ہے — طاقت دل جواب دیتی ہے
جی میں آتا ہے ہوں بیابانی — پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی
مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر — ایک دودم رہیں گے دریا پر
گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو — ورنہ کیا جانیئے کہ پھر کیا ہو
دایہ بولی کہ اے سراپا ناز — حُسن کا در پہ تیرے روئے نیاز
اب تو میں فتنے کو سُلایا ہے — اس بلا کے تئیں بٹھایا ہے
کون مانع ہے گھر کے چلنے کا — سدّ رہ کون ہے نکلنے کا
ہو محافے میں دلخوشی سے سوار — شاد شاداں کر آب سے تو گزار
دل سے اپنے پدر کے غم کم کر — مادرِ مہرباں کو خرم کر
کر ملاقات ہمدموں سے تو — گرم بازی ہو محرموں سے تو
یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق — گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے — عاقبت اُس کو مار رکھتا ہے
جذب سے اپنے جب کرے ہے کام — عاشق مردہ سے بھی لے ہے کام
صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید — اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہونچی نصف النہار دریا پر — روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی — دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش — تھا تلاطم سے کسطرف ہمدوش
تجکو آیا نظر کہاں آکر — پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جاکر
مجھکو دیجو نشان اُس جا کا — میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں نا آشنائے سیرِ آب — ناشناسا لئے موجۂ و گرداب
لجہ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں — گھر میں ہم نام سُنتے رہتے ہیں
ہیں میسر کہاں یہ سیرِ عبور — اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
مکر میں گر چہ دایہ تھی کامل — لیک تہ سے سخن کے تھی غافل

یہ نہ سمجھی کہ ہے فریبِ عشق
ہے یہ مہ پارہ نا شکیب عشق

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف
یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند
پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند

سُنتے ہی یہ کہا کہاں کرکر
گر پڑی قصد ترک جاں کرکر

موج ہر اک کمند شوق تھی آہ
لپٹی اُس کو برنگ مارِ سیاہ

دام گستر وہ عشق تھا تہ آب
جس کے حلقے تمام تھے گرداب

حسن موجوں میں یوں نظر آوے
نورِ مہتاب جیسے لہراوے

تھیں وہ اُس کی حنائی انگشتاں
غیرت افزائے پنجۂ مرجاں

سر پہ جسدم کہ آب ہو کے بہا
سطح پانی کا آئینہ سا رہا

کشش عشق آخر اُس مہ کو
لے گئی کھینچی ہوئی تہ کو

کودے غواص و آشنا سارے
تا بمقدور دست و پا پارے

کھینچ کو کوفت سب ہوئے بیتاب
نہ لگا ہاتھ وہ درِ نایاب

جا ہم آغوش مردہ یار ہوئی
تہ میں دریا کے ہمکنار ہوئی

پاک کی زندگی کی آلایش
ہو کے دست و بغل کی آسایش

سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ
آفت اک لے گئی نئی دایہ

اب و عم مادر و برادر سب
خاک افشاں بسر و نالہ بلب

دارو دستہ تمام اُس گل کا
ترک آئین کر تجمل کا

سوئے دریا رواں ہوئے گریاں
آتشِ غم سے دل جگر بریاں

خلق یکجا ہوئی کنارے پر
حشر برپا ہوئی کنارے پر

دام داروں سے سب نے کام لیا
آخر اُن کو اسیر دام کیا

نکلے باہم ولے موئے نکلے
دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

ربط چسپاں بہم ہویدا تھا
مرگئے پر بھی شوق پیدا تھا

ایک کا ہاتھ ایک کی بالین
ایک کے لب سے ایک کو تسکین

جو نظر اُن کو آن کرتے تھے
ایک قالب گمان کرتے تھے

کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی دار
ہمدگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہووے انکا فصل
جان دیدے ہوا وہ جن کا وصل
حیرت کار عشق سے مردم
شکل تصویر آپ میں تھے گُم

مقولۂ شاعر

میر اب شاعری کو کر موقوف
عشق ہے ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے
اس سے جو تو کہے سو آتا ہے
کتنی وسعت ترے بیاں میں ہے
کتنی طاقت تری زباں میں ہے
لب پہ اب مُہر خامشی بہتر
یا سخن کی فرامشی بہتر

مثنوی عشقیہ

چمن سے عنایت کے بادام دار
الٰہی زباں دے مجھے مغز دار
صفت عشق کی تا کروں میں بیاں
رہوں عشق کہنے سے میں تر زباں
عجب عشق ہے مرد کار آمدہ
جہاں دونوں اس کے ہیں برہمزدہ
جہاں جنگ صف کی یہ ظالم لڑا
صف الٹی جہاں اک مارا پڑا
اگر لوگ مارے گئے سر بسر
ولے فتح اُس کی ہے یہ طرفہ تر
کوئی کشتنی جو طرف ہو گیا
تہ تیغ اس کے تلف ہوگیا
جہاں جس کسو سے اسے چاہ ہے
وہیں اس کے تا قتل ہمراہ ہے
کسو سے اگر ہوگئی لاگ سی
درونے میں اسکے لگی آگ سی
ہوا ملتفت یہ کسو سے کہیں
تو نام نشاں اسکا پھر واں نہیں
وفاق اس کا نکلا سراسر نفاق
پڑا عاشقوں میں عجب اتفاق
جواں کیسے کیسے موئے عشق میں
بہت گھر خرابے ہوئے عشق میں

بہت عشق میں لوگ روگی ہوئے
بہت خاک مل منھ پہ جوگی ہوئے

گئے دشت میں کچھ نمد مو ہوئے
کچھ اک شہر میں پھر کے یکسو ہوئے

نہ مرغ چمن ہی ہے نالاں و زار
گئے داغ کہسار سے لالہ زار

کسو کا جگر غم سے خوں ہوگیا
کسو کوہ کن کو جنوں ہوگیا

کوئی زار باراں بہت رو چکا
کوئی برق ساجل بجھا ہو چکا

غرض عشق کا ہر طرف شور ہے
نئی روز شہروں میں اک گور ہے

بہت جان ناکام دیتے گئے
تمنائے دل ساتھ لیتے گئے

بہت اہلِ اسلام کافر ہوئے
بہت اول عشق آخر ہوئے

بہت جرم الفت پہ مارے گئے
جوا عشق بازی کا ہارے گئے

ہوئے خانداں کیسے کیسے خراب
جواں جوں جوانی گئے کیا شتاب

کیا عشق جس دن سے مرتے رہے
جیون کا ہی اندیشہ کرتے رہے

کسے عشق نے جی سے مارا نہیں
یہی درد ہے درد چارہ نہیں

دوا عشق کی سخت نایاب ہے
سر عاشقاں سنگ کا باب ہے

جو ہو عشق عارض تو پھر یاس ہے
عبث کوئی دن جینے کا باب ہے

محبت ہے نیرنگ سازِ عجیب
فسانے ہیں اُسکے عجیب و غریب

کوئی عشق کرنا دھرا تھا ورے
گئے میکدے سے بھی صوفی پرے

نہ واں مکر و نے شید و طامات ہے
خرابات جانا کرامات ہے

کہیں عشق نے آرزو کش کیے
گئے خوش جو عاشق سو ناخوش گئے

کہیں سہل تر پار مرنے لگے
کہیں لوگ دشوار مرنے لگے

کہیں کام اُن نے کیے ہیں عجب
فسانہ ہوئی بزم عیش و طرب

کہیں بادشہ اس سے درویش ہیں
کہیں اس سے درویش دلریش ہیں

لیا کاہ کا کوہ سے کیں کہیں
ملائے کہیں آسمان و زمیں

کہیں پڑ گئے اس سے فتنے فساد
رہے زیرِ شمشیر حد سے زیاد

یہ عالم کا آشوب ہے دہر سے
مراد خطر گہ ہے اس شہر سے

ہوئے عشق میں زہد کیشاں خراب — رہے دل شکستہ پریشاں خراب
اُٹھا عشق کا شور عزلت گزیں — گئے دشت گردی کو کر ترک دیں
ہوا عشق سے مجلس حالِ دہر — تواجد لگے کرنے شیخانِ شہر
کیا عشق میں ترک صوم و صلوٰت — گئے اہلِ مسجد سوئے سومنات
مسلماں ہوئے عشق میں برہمن — گئے کعبہ کو چھوڑ دینِ کہن
نہ سبحہ نہ زنار نہ کفر و دیں — جہاں سب ہے، عشق اور کچھ بھی نہیں
محبت کے ساغر کش اہل صلاح — یہ بیہوش دارو ہے ان کی فلاح
کوئی ہوش میں اپنے رہتا نہیں — ہر اک چپ ہے کچھ کوئی کہتا نہیں
رباطی ہیں خانہ سیہ عشق میں — مصلے ہوئے ان کے تہ عشق میں
ہمہ خاندانِ تقاوت خراب — خرابے سے ہیں بے تفاوت خراب
یہی عشق جس سے کہ حاصل ہے کام — یہی عشق ہے جس سے نکلا ہے نام
اسی عشق سے روسیہ رو سفید — رکھیں عشق سے نا اُمیداں اُمید
یہی عشق ہے عقدۂ دل ہے یہ — یہی عشق حلال مشکل ہے یہ
کہیں اس کو لڑنے سے پایا معاف — کہیں ان نے میداں مارے ہیں صاف
کہیں مومنانہ اسے درد دین — کہیں کافرانہ ہوا بے یقین
غرض عشق ہے طرفہ نیر نگ ساز — کہیں ناز یکسر کہیں ہے نیاز

حکایت

حکایت ہے عشقی حکایات میں — کہ افغاں پسر ایک گجرات میں
جواں خوش تھا پر کار و پرہیز گار — بہت حُسن کا اُسکے واں اشتہار
یہ صورت یہ طاعت یہ دامانِ پاک — نہ دامن پہ مانند گل گرد خاک
اگر ہووے حور بہشتی دوچار — وہ دریائے حُسن اس سے ڈھونڈھے کنار
وگر آگے سے ہو پری کا گزر — حیا سے نہ اُس پر کرے تک نظر
رہے محو پاکیزگی و صلوٰۃ — نہ ہوں ترک سہواً کبھی واجبات

تناسب بہت اُسکے اعضا سے خوب
سراپا میں دیکھو تو ہر جا سے خوب

زباں نرم طالع وری و صلاح
نہ طنز و کنایہ نہ رمز و مزاح

خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو
کسو وقت رہتا نہ تھا بے وضو

جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف
لب سُرخ پر دلبروں کا نہ حرف

حیا کو سیاہی سے پلکوں کی راہ
نکلتی تھی باہر نہ گاہے نگاہ

بہت پاک دامن معیشت ہوئی
نظافت نزاہت میں مدّت ہوئی

کہ ناگاہ اس راہ یک زن گئی
جیوں پر خدا جانے کیا بن گئی

جواں کی نظر شرگیں جا لڑی
وہ شرمائی آنکھ اُسکے اوپر پڑی

نہ دل مستقل نا شکیبا ہوا
دل طرف ثانی بھی بیجا ہوا

حیادار تھی زن گئی اپنے گھر
وفادار تھا یہ رہا دیکھ اُدھر

کیا چند شرط وفا ہی کا پاس
لگے رہنے دونوں گھروں میں اُداس

کئی دن میں ہند و زن آنے لگی
لیے پانی اس راہ جانے لگی

نگاہیں ہوئیں ہمد گر آشنا
محبت کا دونوں نے پانی بھرا

یہی مدّتوں دیکھا دیکھی رہی
دلوں کی کسو سے نہ ہرگز کہی

جیون میں شب و روز مرتے رہے
وے پاس ظاہر کا کرتے رہے

رہے دیر تک دونوں ناکام عشق
نہ آیا لبوں پر کبھو نام عشق

یہ کیا دخل اظہار اُلفت کریں
یہی بستہ لب مشق حیرت کریں

گھروں میں نگاہیں تھیں کلفت بھری
در و بام پر پڑتیں حسرت بھری

لبوں پر نہ آیا کبھو حرفِ عشق
اگرچہ ہمہ تن رہے صرفِ عشق

بجایا کیے پردے میں سازِ دل
نہ نکلا کوئی نغمۂ رازِ دل

دوانوں میں تو گرمجوشی رہی
دہانوں پہ مہر خموشی رہی

کریں حسرت آگیں نگہ چار اور
لب اُن کے یہ ساکت سرو میں یہ شور

کسو سے نہ حرف و حکایت انہیں
محبت سے شکر و شکایت اُنہیں

کہیں درد دل سو کبھو زیر لب
وگرنہ سکوت اُن کو تھا جب نہ تب

شب و روز دونوں تھے صورت مثال
بہم محوِ خوبی و صرفِ خیال

پیئے جائیں آنکھیں بھری بہر ضبط
کہ جانا نہ جاوے یہ آپس کا ربط

کبھو آہ اُٹھتی تو دم سرد ہو
کہیں منکشف تا نہ یہ درد ہو

دلوں میں جو تھی چاؤ خوں ہو گئے
گرفتہ رہے سو جنوں ہو گئے

بیاباں کی جانب کھنچے دل بہت
کہ تھا شہر میں کام مشکل بہت

ارادے ہوے یہ دلوں میں ہی خون
کیا پھر بھی دونوں نے صبر سکون

صبا سے رہے دو طرف کے پیام
کہ اے باد کہیو یہ بعد از سلام

خیالات ملنے کے جاتے نہیں
قرار و سکوں دل تک آتے نہیں

شب و روز رہتا ہے یاں اضطراب
کیا شوق نے کام کو کیا خراب

کوئی طور ملنے کا ایجاد کر
نہ جو رحم سے ہو تو بیداد کر

پیام ایک کا یہ کہ اے بادِ خرم
کہہ اسکو محبت سے کچھ بھی ہے شرم

تنِ زار بیجان کیونکر جیے
جگر میں نہ ہو خوں تو کیا خوں پیئے

ملاقات کا رکھے کیونکر خیال
رہے کیونکہ جاں تا اُمیدِ وصال

اگر دیکھیں آنکھیں ہیں دو اسطرف
وگر منھ ہمارا ہے سو اس طرف

اسے دیکھنا ہی ہے ارمان بھی
ادھر ہی چلی جائے ہے جان بھی

کہ اس سے کہ مرتے ہیں تیرے لیے
کیا عشق یا جرم ہم نے کیے

نہیں صبر آتا ترے بن ملے
لبوں سے جگر تک بھرے ہیں گلے

کسو سے کسو کو نہ ہو جائے لاگ
کہے تو لگائی ہے سینے میں آگ

کسو کا کسو سے نہ لگ جائے دل
کہ کہنا پڑے ہائے دل وائے دل

کسو کی نہ اچھی لگے کوئی آن
کہ جانِ المناک دیجے ندان

کسو کے مجعد نہ کھل جائیں بال
کہ ہو دِل کے عقدوں کی واشد محال

کسو لالہ رُخ کا نہ اُٹھے نقاب
کہ ہوں داغ دونوں مہ و آفتاب

قد آرا نہ ہو فتنہ در سر کوئی
کہ سر پر قیامت رکھے ہر کوئی

کسو کے نہ چاہ زنخ میں گریں
مبادا کہ واں سے نہ جیتے پھریں

کسو کے نہ انداز پر جا سے جا
صبا ہوئے کیا جانیے کیا سے کیا

کسو کی نہ آنکھوں کو دیکھا کریں
کہ لوگ اس کا آخر پر یکھا کریں

کسو کے نہ ایمائے ابرو پہ جائیں
فریب فریبندگاں تا نہ کھائیں

صبا چلتے اس سے یہ کہ آئیو
کہ غافل ہی ہم سے نہ ہو جائیو

دل زار تجھ بن ہے بے کل بہت
نہ جی کو مرے بن ملے مل بہت

گئے ہم سے پھر ہاتھ آتے نہیں
یہ گم گشتہ پھر پائے جاتے نہیں

انھیں کا نہیں رہتا نام و نشاں
کوئی ان کو ڈھونڈھے تو پھر یہ کہاں

کہیں یوں فراموش ہوتے ہیں یار
ہمارا ترا عشق ہے یادگار

ترحم کہ اب بھی گیا کچھ نہیں
تلطف کہ ہم میں رہا کچھ نہیں

نہ کر یوں کہ افسوس باقی رہے
گلِ تر پہ چند اوس باقی رہے

گھٹی جان جاتی ہے یوں ہر زماں
تلف جیسے ہر دم ہو آب رواں

نہ ہو جاتی اے کاش الفت ہمیں
اُٹھانی نہ پڑتی یہ کلفت ہمیں

نہ آنکھیں لگی ہوتیں نا گاہ کاش
کہ چھاتی کی دل تک نہ جاتی خراش

نہ دل کو ہوئی ہوتی چسپیدگی
کہ داغوں کو ہوتی نہ بالیدگی

نہ پڑتی مری آنکھ گر اسکی اور
تو اُٹھتا نہ سر سے جنوں کا یہ شور

ہوئی آتش عشق آخر بلند
جگر دل ہوئے دونوں اسکے سپند

زبانے تھے اس آگ کے کیا دراز
ہوئی دونوں بیتابوں کی جاں گداز

پڑی آگ وہ دل جگر جل گئے
جگر دل نہ بل دونوں گھر جل گئے

ہوا ناگہاں شوہر زن مریض
نہایت ہوئی تپ طویل و عریض

تشتت ہوا تب کا دل کے تئیں
کھنچی رفتہ رفتہ دق و سل کے تئیں

نزاری سے دل ہو گیا زار تر
ہوا خشک ہو کر وہ بیمار تر

بدن کاہ سا رنگ کا ہی ہوا
بہت حال اُس کا تباہی ہوا

دموں پر بھی وہ رفتنی کم رہا
ٹھہر کر گئے دم ہوا ہو گیا

فنا یعنی طاری ہوئی ہو چکا
اسے وارودستہ بہت رو چکا

جلانے کی تیاری کرنے چلے — چلی زن بھی تا ساتھ اسکے جلے

کھلی دعوی سوختن میں زبان — کیا پاس ظاہر سے نقصان جان

لگی جلنے چھوڑا نہ اصرار کو — خبر پہونچی اِس نو گرفتار کو

اٹھا وہاں سے بیتاب آیا چلا — اسے دیکھ جلتے بہت جی جلا

جھکا آگ کی اور کر اضطراب — کہ جی میں نہ طاقت تھی مطلق نہ تاب

کہا ہم کو کیا کہتی ہو اس گھڑی — نظر اُسکی جلتے جو اُس پر پڑی

کہا آئے ہو تو چلے آؤ تم — شتابی کرو جو ہمیں پاؤ تم

یہ بیتاب تھا آگ پر پھر پڑا — پتنگا سا اُس شعلے پر گر پڑا

لگے آتے تھے کتنے انفار ساتھ — وہیں کھینچ لائے اُسے ہاتھوں ہاتھ

چلے ادھ جلا لے کے سب اُسکو گھر — ہوا گرم ہنگامہ اک یہ ادھر

کیا لوگوں نے اسکے سر پر ہجوم — ہوئی شہر میں شور محشر کی دھوم

قدم کتنے چل کر وہ آتش بجاں — ہوا یوں سخن زن کہ اے دوستاں

تعب کش ہوں میں آتشِ تیز کا — اُسے قصد تھا میرے خونریز کا

لے آئے مجھے گرمی سے تم نکال — کیا گھر بھی لے چلنے کا اب خیال

نہیں متصل راہ چلنے کی تاب — کہ ہوں نیم سوز آگ کا میں کباب

کہیں مجکو سائے میں ٹھہرایئے — جو دم ٹھہرے تو آگ لے جایئے

کوئی دم مرا کھینچئے انتظار — کہ گرمی سے ہوں بیخود و بیقرار

توقف کیا سب نے زیرِ درخت — کہا واقعی رنج کھینچا ہے سخت

نہ جانا کہ ہے مانع راہِ عشق — رکھے ہے عجب جذب جانکاہِ عشق

نہ آتش نہ گرمی نہ بے طاقتی — بہانے ہیں سب جذب ہے الفتی

عجب تر نظر آتے ہیں کارِ عشق — نہیں سمجھے جاتے ہیں اسرارِ عشق

اُٹھانے کو کہنے تو کہلائے تھا — دل اسکا ادھر ہی چلا جائے تھا

اگر آنکھیں کھلتیں تو اودھر نظر — ہوئی خاک معشوقہ جل کر جدھر

گیا منتظر اُس کو وہ دن تمام — نظر کر کے کیا دیکھتا ہے کہ شام

خراماں چماں آتی ہے وہ پری — وہی ناز عشوہ وہی دلبری
وہی صورت اسکی ہے جلوہ نما — وہی رنگ رو گل کا غیرت فزا
اسی طرز و انداز و خوبی کے ساتھ — اُٹھایا اُسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ
گئی اس طرف لے جدھر تھی چلی — نظر کرتے تھے واقعی یہ سبھی
ولے مانعیت کا کس کو جگر — کہ حیران سب رہ گئے دیکھ کر
ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں — گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں
بہت سے ہوئے لوگ گرم سراغ — کنھوں نے نہ پایا نشاں غیر داغ

نہ کر میرا اب عشق کی گفتگو
قلم اور کاغذ کو رکھدے بھی تو

فسانے ہیں اس کے ہزاروں ہزار — یہی کشت وخوں کا ہے یہ گرم کار ہے؟
بہت خاک جل جل کے یاں ہوگئے — رہِ عشق میں جی بہت کھو گئے

غرض ایک ہے عشق بیخوف وباک
کئے دونوں معشوق عاشق ہلاک

مثنوی معاملاتِ عشق

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق — حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ — عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق تھا جو رسول ہو آیا — اُن نے پیغام عشق پہونچایا
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں — ہے محمدؐ کہیں علی ہے کہیں
عشق عالی جناب رکھتا ہے — جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق حاضر ہے عشق غائب ہے — عشق ہی مظہر عجائب ہے
عشق کیا کیا مصیبتیں لایا — روز کو رات کرکے دکھلایا
عشق میں لوگ زہر کھاتے ہیں — عشق سے رنگ سبز پاتے ہیں

عشق سر تا قدم امید ہوا
زیرِ تیغِ ستم شہید ہوا

مجھ سے مت پوچھ یہ کنھیں ہے عشق
عشق ہے ان ہی کو جنھیں ہے عشق

عشق سے رنگ زرد ہوتا ہے
عشق سے دل میں درد ہوتا ہے

رہتے ہیں عشق ہی میں مژگاں تر
یہیں دیکھی ہیں آنکھیں آتے بھر

عشق ہی کا خراب ہے کنعاں
عشق ہے ایک خانہ آباداں

عشق لایا ہے آفتیں کیا کیا
اس سے آئیں قیامتیں کیا کیا

قیس کیا رنج کھینچ کھینچ ہوا
سر پہ فرہاد کے سُنا جو ہوا

عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں
آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں

عشق میں ایک جی کو کھو بیٹھے
ایک آنکھوں کو رو کے رو بیٹھے

ایکوں کا جیب تا بدامن چاک
ایک ڈالے ہے سر کے اوپر خاک

شان ارفع ہیں جن کی خوار ہیں یاں
عقل والے جنوں شعار ہیں یاں

خستۂ عشق کچھ نہ میر ہوئے
بادشہ عشق میں فقیر ہوئے

کوئی دلتنگ ہو کنیں میں گرا
کوئی ڈوبا کوئی گیا نہ پھرا

جب پتنگا ہوا تھا اس سے داغ
تب دیا جی کو اس نے پیش چراغ

عشق کی فاختہ سمکش ہے
عشق سے عندلیب دلکش ہے

عشق باعث ہوا وطن چھوٹے
مرغ پکڑے گئے چمن چھوٹے

مایۂ درد و رنج سب ہے عشق
متصل رونے کا سبب ہے عشق

پڑگئے دل جگر میں آخر چھید
کچھ نہ پایا کنھوں نے عشق کا بھید

اپنی تیغ ستم جو اینچے عشق
جامے بہتوں کے خونمیں کھینچے عشق

عشق سے قمری ہے حریف سرد
مہ سے آنکھیں لڑا رہا ہے تدرد

عشق کے دل فگار سارے ہیں
اُن نے کیا کیا جوان مارے ہیں

کہیں حق ناحق ان نے خون کئے
کہیں سر پہ کھڑا ہے تیغ لئے

کوئی محوِ گزاف ہیں اس سے
کہیں میدان صاف ہیں اس سے

اس سے یک جمع نے لیا ہے جوگ
ایک فرقہ کا ہے یہ جی کا روگ

ایک کے لب پہ آہ ہے اس سے ‌‌ ایک کا دن سیاہ ہے اس سے
ایک کا شیوہ اس سے نالہ کشی ‌‌ ایک کو بیدلی ہے جیسے غشی
ایک ناشاد زندگانی سے ‌‌ ایکوں کے دل گداز پانی سے
ایک کے پھول گل پہ نالے ہیں ‌‌ ایک کی جان ہی کے لالے ہیں
ایک نے کوہ اس سے توڑ دیے ‌‌ ایک تنکا کر اُن نے چھوڑ دیے
چپ لگی ہے کسو کو اس کے سبب ‌‌ بند رہتے نہیں کسو کے لب
کوئی باتیں کرے ہے شوق کے ساتھ ‌‌ کوئی چپکا ہوا ہے ذوق کے ساتھ
ہے تواجد کسو کو حال کہیں ‌‌ کہیں نقصان ہے کمال کہیں
ایک محوِ لباس عریانی ‌‌ ایک سر گرم دامن افشانی
کسو کو فکر* کوئی ذاکر ہے ‌‌ کوئی صابر ہے کوئی شاکر ہے
کہیں وسعت کہیں ہے تنگ اوقات ‌‌ عشق کے بینگے مختلف حالات
سیر قابل ہیں اس کے دیوانے ‌‌ سُننے کے گوں ہیں اس کے افسانے
وصل میں جن کے دل رہیں بیجا ‌‌ فصل ہوتو اُنھوں کا حال ہو کیا
اس بلا سے مجھے بھی کام ہوا ‌‌ عاشق زار میرا نام ہوا
قصہ میرا بھی سانحہ ہے عجب ‌‌ کس پہ گزرا ہے یہ ستم یہ غضب

* [illegible]

معاملۂ اوّل

ایک صاحب سے جی لگا میرا ‌‌ اُن کے عشووں نے دل ٹھگا میرا
ابتدا میں تو یہ رہی صحبت ‌‌ نام سے اُن کے تھی مجھے الفت
خوبی اُن کی جو سب کہا کرتے ‌‌ گوش میرے اُدھر رہا کرتے
بخت برگشتہ پھر جو یار ہوئے ‌‌ اک طرح مجھ سے وے دوچار ہوئے
کیا کہوں طرز دیکھنے کی آہ ‌‌ دل جگر سے گزر گئی وہ نگاہ
چپکے منھ اُن کا دیکھتا رہتا میں ‌‌ جی میں کیا کیا پہ کچھ نہ کہتا میں
وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے ‌‌ پر تصرّف میں ایک اور کے تھے

کرتے ظاہر میں احتیاط بہت
مجھ سے بھی رکھتے اختلاط بہت
بات کی طرز میری ہی بھاتی
میری آزردگی نہ خوش آتی
پیار چتون سے پھر نکلنے لگا
دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا
کہیں دیکھوں تو بات دیر کہیں
بیدماغ اور بیگمان رہیں
کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے
قسم اقسام مجھ سے لینے لگے
میں جو کھاتا قسم تو ہو برہم
کہنے لگتے کہ کیا گدا کی قسم
ایک دو دن میں بعد رفع ملال
لطف سے پوچھتے کہو کچھ حال
جو گزرتی تھی مجھ پہ میں کہتا
یا کوئی اشک آنکھ سے بہتا
دیکھ کر رونے آپ بھی روتے
دلدہی کرتے جبتلک سوتے

معاملہ دوّم

ایک مدّت تلک یہ صحبت تھی
کبھو الفت کبھو یہ کلفت تھی
رفتہ رفتہ سلوک بیچ آیا
ہاتھ پانوں کو اپنے لگوایا
گاہ بیگاہ پانوں پھیلاتے
میری آنکھوں سے تلوے ملواتے
چلکر آتے تھے جب کبھو ایدھر
پانوں رکھتے تھے میری آنکھوں پر
دیکھنے میں تو پائمالی تھی
حُسن سے چال یہ نہ خالی تھی
جلتی چھاتی تو ہوتا میں سائل
کہ ٹک اے سرد ہو ادھر مائل
کفِ پا رکھئے یاں تو احساں ہے
تیرے پانوں تلے مری جاں ہے
جلسکے سینے پہ پانوں رکھ دیتے
دل مرا یوں بھی ہاتھ میں لیتے
کیا کہوں کیسا قد بالا ہے
قالب آرزو میں ڈھالا ہے
ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب
پیکرِ ناز اس کے سب محبوب
موئے سر ایسے جی بھی کریے نیاز
بل ہی کھایا کرے یہ عمر دراز
اس کے کاکل سے حرف سر نہ کرو
کاکل صبح پر نظر نہ کرو

کچھ بھی نسبت ہے تم کو سودا ہے
کالے کوسوں کی بات کا کیا ہے

اُسکی زلفوں کے دل گئے نہ پھرے
رہے سنبل کے پیچ پاچ دھرے

اُس جبیں سے ہے دل کی کب جاذب
صبح صادق کے دعوے ہیں کاذب

ویسی بھوئیں کشیدہ بھی ہیں کہیں
یہ کمانیں کسو سے کھنچتی نہیں

پھری پلکوں کی اور سب کی نگاہ
چشم پر میری تیری چشم سیاہ

کہوں چتوں کے دیکھنے کے طور
اس قیامت پہ وہ قیامت اور

سطح رخسار آئینے سے صاف
جو نہ ٹھہرے نگہ تو رکھئے معاف

لطف بینی کا فہم ہے دشوار
ایک باریک بینی ہے درکار

کیا جھمکتا ہے ہائے رنگ قبول
جیسے مکھڑا گلاب کا سا پھول

ہے دہن تنگی سے سخن کوتاہ
کچھ نکلتی نہیں سخن کی راہ

اس سے گل کیا چنے کوئی ہمدم
غنچۂ ناشگفتہ سے بھی کم

برگ گل سے زباں ہے نازک تر
پھول جھڑتے ہیں بات بات اوپر

کیا کہوں کم ہیں ایسے شیریں گو
وہ زباں کاش میرے منھ میں ہو

دمبدم سوے گوش اشارۂ صبح
گوہر گوش یا ستارۂ صبح

جب بنا گوش اُن نے دکھلایا
صبح کا سا سماں نظر آیا

ان لبوں کا مزا لیا سو بھانت
تسکے اوپر ہمارا بھی ہے دانت

تم نہ گل برگ و لعل ناب کہو
بات جب تک نہ ٹھہرے چپکے رہو

کوئی جاں بخش یوں کہے سو کہے
ہم تو مرتے ہی اُن لبوں پہ رہے

کنج لب آرزوے جان و دل
آگے چلنا نگاہ کو مشکل

اُن لبوں سے جو کوئی کام رکھے
قند و مصری کو کیوں نہ نام رکھے

جو حلاوت انھوں کی کہئے اب
ہمدگر سے جدا نہ ہوویں لب

جب وے کھاتے ہیں بیڑۂ پاں کو
رو نہیں دیتے لعل و مرجاں کو

ایسی ہوتی نہیں ہے سرخ لبی
رنگ گویا ٹپک پڑے گا ابھی

ہو تبسّم سے لعل کا دل خون
ہنستے دیکھا تھا سو مجھے ہے جنوں

نہیں دیکھے مسی ملے دنداں
برق ابر سیہ ہے تب خنداں

کیسے کیسے چمکتی ہے بے تہ
جگ ہنسائی کرے ہے اپنی یہ

بو اگر کیجیے اُس زنخ کا سیب
جائے سر سے جنوں کا آسیب

رہے گردن میں ان کی میرا ہاتھ
یہ تو یارب ہے میرے جی کے ساتھ

بس چلے تو گلے لگا ہی رہوں
تیغ سے پھر جدا کریں تو نہ ہوں

اس میں ہر چند جی کا نقصاں ہے
مدّعا اختلاط چسپاں ہے

خوش و پر کب پری اِن سی
اور ہو تو کہاں ہے ہم جنسی

دیکھے از بس برآمدہ سینے
ایسا معلوم دل جو یوں چھینے

کیا نظرگاہ کی کروں خوبی
نظریں اٹھتی نہیں یہ محبوبی

شانہ و دست ساعد و بازو
دل کشی میں تمام یک پہلو

اس کے تو پہلو سے میں ہو کے جدا
درد پہلو سے تنگ دل ہی رہا

ہائے اُس سے خُدا جدا نہ کرے
دور اس سے جیوں خدا نہ کرے

یوں نہیں سرخ اس کی ہر انگشت
ڈوبی ہیں میرے خون میں یکمشت

وہ کفِ دست راحت جاں ہے
کاش سینے پہ رکھ دے غم یاں ہے

کیا بیاں خوبی شکم کو کرے
دیکھنے سے کبھو نہ پیٹ بھرے

صدر کے ناچے سے لے تا ناف
چپ کی جاگہ ہے کیونکہ کہیے صاف

اس سے پھر آگے غنچۂ گل ہے
یاں سخن بابتِ تامل ہے

پردے میں بھی جو کچھ کہہ جاوے
آپ سے تو نہ ٹک رہا جاوے

گئی نظروں سے وہ کمر باریک
ہو نہ آنکھوں میں کیوں جہاں تاریک

اور کیا دل زدے کو بات آوے
کہیں یارب شتاب ہاتھ آوے

نازکی اس میاں کیا کہیے
بنے تو ہاتھوں میں لیے رہیے

ٹک اگر لیجیے تو قیامت ہے
پھر قیامت تلک ندامت ہے

کیوں پڑی ران پر نظر تا ساق
اس بن اب زندگی ہوئی ہے شاق

پائے جاناں سے گفتگو ہے اب
خاک میں ملنے کا یہی ہے ڈھب

وہ قدم کاش فرق سر پہ ہو / ساق سیمیں مری کمر پر ہو
وہ کفِ پا قریب ہو میرے / ٹھوکر اس کی نصیب ہو میرے
پنڈلی نازک ہے شاخ سنبل کی / پشت پا پنکھڑی سی ہے گل کی
یوں نصیبوں سے ہو حنا کا ناؤ / ورنہ ڈوبے ہیں میرے خوں سے پاؤ
ناخنِ پا حنائی ہیں ایسے / برگ گل پا سے سرو ہوں ایسے
ہو خراماں تو اس طرف نکہیں / گل کفش اُسکی لوگ دیکھ رہیں
گل و بلبل سبھی تماشائی / آگئے جس طرف بہار آئی
رنگ رفتار دیکھ مجنوں ہو / طرز گفتار جیسے افسوں ہو
سر سے پاؤں تلک وہ محبوبی / ساتھ اس خوبیوں کے یہ خوبی
کہ بہت دل ہے آشنائے رحم / درد مندوں کو جان جائے رحم
اب جو ثابت ہوئی ہے میری چاہ / اس کو مدّ نظر ہے مجھ سے نباہ
طعن و تعریض بیچ میں آئے / کچھ نہ خاطر میں دے مجھے لائے
راستے ہیں اک طرف وفا کے لئے / چلے جاتے ہیں مجھ پہ لطف کئے
نہیں آزار کی رواداری / مہرورزی ہے یا وفا داری
پر جو معشوقی آب و گل میں ہے / چھیڑ رکھنے کا شوق دل میں ہے
میں کروں تو کہیں خوش آتا ہے / تیرا آزار جی سے بھاتا ہے
خواہ ناخواہ وہ نہیں منظور / کہ رہے دل شدہ مرا رنجور
یہ بھی شوخی سے ہے کہے گا ہے / پر اس انداز سے کہ جی چاہے

معاملۂ سوم

ایک دن فرش پر تھا میرا ہاتھ / باتیں کرتے تھے وے بھی میرے ساتھ
پاؤں سے ایک اُنگلی مل ڈالی / لطف سے درد وہ نہ تھا خالی
درد سے کی جو میں نے بیتابی / دست نازک سے دیر تک دابی
یاد آتے ہیں ایسے لطف جو اب / گزرے ہیں جان غم زدہ پہ غضب

تن بدن دیکھ جی نہ رہتا تھا
میں جو گستاخ ہو کے کہتا تھا
کہ یہ جاگہ تم اس فقیر کو دو
متبسّم ہو کہتے وے یہ لو
یہ بھی کیا کیا خیال رکھتے ہیں
آرزوئے محال رکھتے ہیں
پھر گھڑی بھر میں کہتے ہو نہ ملول
مار کھانے کی باتیں سب ہیں قبول
جب سلوک ان کو یاد آتا ہے
کیا کہوں جی ہی بھول جاتا ہے

معاملہ چہارم

ایک دن پان وے چباتے تھے
سُرخ لب اُن کے مجھ کو بھاتے تھے
کہہ اٹھا میں اگر اُگال مجھے
منھ سے دو تو کرو نہال مجھے
بولے یونہیں ہے میں کہا ہاں سچ
جھوٹا کھاتے ہیں میٹھے کی لالچ
ہنسکے اُس وقت مجھ کو ٹال دیا
پھر اُسی رنگ سے اُگال دیا
ایسی صد رنگ مہربانی تھی
تب سیہ رو کی زندگانی تھی
ابکے سے رنگ گر فلک لاتا
خاک کے رنگ میں مجھے پاتا

معاملہ پنجم

منقبت ایک مجھ سے کہوایا
جس کا میں نے صلہ انھیں پایا
پھر وہی کرتے میں جو کچھ کہتا
ایک پردہ سا بیچ میں رہتا
دوستی رابطہ وفا اخلاص
مختلط ہونے کو سدا کہتا
میری تسکیں تھی ہر زماں منظور
آپ بھی کرتے ملنے کا مذکور
وصل کے وعدے ہی رہا کرتے
آج کل رات دن کہا کرتے
دل تو تھا رحم آشنا از بس
کڑھتے تھے جان کر مجھے بیکس
جانتے تھے کہ ہے یہ دل دادہ
سیّدِ خستہ خاک اُفتادہ
دیکھتے مجھ کو جو پریشاں دل
کہتے اے میرؔ کچھ نہیں حاصل
دیکھ ٹک تو ہی تیرا حال ہے کیا
جانے دے اب بھی یہ خیال ہے کیا

آفتِ جاں ہے دوستی کرنا
کب تلک گھٹ کے اس طرح مرنا
میں جو دیوانہ اُن کے روکا تھا
شیفتہ پیچدار موکا تھا
کچھ نہ سمجھی گئی کہن اُن کی
اب جدائی جو ہے کٹھن اُن کی
یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں
وعدہ بن ہی ہلاک ہوتا ہوں

معاملۂ ششم

گلرووں بن جگر ہے داغ کباب
گیسووں بن ہے جی کو پیچ و تاب
صورت اُن کی خیال میں ہر دم
خواب میں جو ہوں وہ مژہ باہم
میں تو بستر پہ دل شکستہ اُداس
چاند سا مُنھ اُنھوں کا تکیے پاس
میں بچھونے پہ بیخود و بیخواب
ایک پیکر پری کا سا ہمخواب
فرش پر پاؤں یہ غبار آلود
ان میں وے دونوں پا نگار آلود
میں تو اُفتادہ محو عجز و نیاز
بازو میرے کسو کی بالش ناز
جلتی آنکھوں کنے گل رخسار
جس پہ کچھ بکھرے موئے عنبر بار
پاس مُنھ کے وے لال تر نازک
دست گستاخ پر کمر نازک
فرش اُس گلبدن سے سب بویا
پھول میں نے بچھائے تھے گویا
شب کٹی صورتِ خیالی سے
دن کو ہوں میں شکستہ حالی سے
گرچہ روزانہ بھی تصور تھا
لیکن اندوہ سے مکدّر تھا
کہیں تصویر سی نظر آئی
کہیں مُنھ پھیر جیسے شرمائی
کبھی دل اُن کے رو و مو میں رہے
کبھی ملنے کی آرزو میں رہے
صورتِ حال اور کچھ ہر دم
گاہ لب خشک گاہ مژگاں نم
میں بھی مقدور تک وفا کی ہے
جانِ غمناک پر جفا کی ہے
برسوں تک میں پھرا ہوں سرگرداں
روز و شب دونوں تھے مجھے یکساں
نے فقط جان سے جہاں سے گیا
زن و فرزند و خانماں سے گیا
کیچ پانی ہو مینھ ہو یا برسات
روز روشن ہو یا اندھیری رات

اُن تلک میرے تئیں پہونچ رہنا / بیٹھے مُنھ دیکھنا نہ کچھ کہنا
آشنا یار سارے بیگانے / کہ ہوئے میر جی تو دیوانے
رشتۂ ربط اُنھوں نے توڑ دیا / ملنا جلنا سبھوں نے چھوڑ دیا
نظر آتے نہیں ہیں مدت سے / اُنس پیدا کیا ہے وحشت سے
صبح ہوتے ہی گھر سے چلتے ہیں / جیسے کھوئے گئے نکلتے ہیں
چلے جاتے ہیں دیکھتے ہی راہ / پر کہیں کی کہیں پڑے ہے نگاہ
مل گیا جو کوئی تو بچ نکلے / سڑی خبطی دوا نے بچ نکلے
شوق سے اُن کے حال دیگر گوں / پارہ پارہ دل و جگر سب خوں
رنگ ہر دم مزاج کا کچھ اور / کل کا کچھ اور آج کا کچھ اور
کیا بیاں کریے بیقراری کا / ذکر کیا حال اضطراری کا
جی پڑا ترے ساتھ سونے کو / دل پریشان جمع ہونے کو
پاس اُن کے رہوں تو دل کو قرار / پھر نہ ٹھہرے ٹک ایک کریے ہزار
گئی برباد عزت اُن کے لیئے / جلف لوگوں نے مُنھ پہ طعنے دیئے
گھورے پرسے جو اُٹھ نہ سکتے تھے / وے بھی کناس پوچ بکتے تھے
سفر آیا جو اُن کے تئیں در پیش / ساتھ اس رنج میں بھی تھا درویش
کیا کہوں جو اذیتیں دیکھیں / ہر قدم پر قیامتیں دیکھیں
جو پڑھے گا بسنگ نامہ یاں / ہوگی ساری حقیقت اس پہ عیاں
یاں نہ تفصیل کرنے کا تھا مقام / کہ محبت سے یاں ہے حرف کلام

معاملہ ہفتم

بارے کچھ بڑھ گیا ہمارا ربط / ہو سکا پھر نہ دو طرف سے ضبط
تب ہوا بیچ سے یہ رفع حجاب / جب بدن میں رہی نہ مطلق تاب
ایک دن ہم وے متصل بیٹھے / اپنے دلخواہ دونوں مل بیٹھے
شوق کا سب کہا قبول ہوا / یعنی مقصود دل حصول ہوا

واسطے جسکے تھا میں آوارہ
ہاتھ آئی مرے وہ مہ پارہ

گہ گہے دست دی ہم آغوشی
ہمسری ہمکناری ہمدوشی

چند روز اس طرح رہی صحبت
پیار اخلاص رابطہ اُلفت

کچھ کہوں جو اُنھوں کی ہو تقصیر
نا رسائی تھی طالعوں کی میر

ہوگئے بخت اپنے برگشتہ
پھر کیا آسماں نے سرگشتہ

بات ایسی ہی اتفاق پڑی
کہ ہوئی سر بہ فرقت آن کھڑی

لگی کہنے کہ مصلحت ہے یہ
کتنے روزوں جدا تو مجھ سے رہ

یوں بھی آتا ہے عشق میں درپیش
کہ نشانِ بلا ہوں اُلفت کیش

میں اُٹھایا نہیں ہے تجھ سے ہاتھ
کڑھیومت تو ہے میری جان کے ساتھ

اس جدائی کا مجھ کو بھی غم ہے
کیا کروں آبرو مقدم ہے

میں کہوں کیا مجھے نہ انا ہوش
جیسے تصویر سامنے خاموش

آنسو آنکھوں میں پر پڑے جاؤں
دے کہیں کچھ تو ہاں کیے جاؤں

ان سے رخصت ہوئے جو بعد شام
تیرہ دیکھا جہان کو ہر گام

دل ٹھہرتا نہ تھا ملالت تھی
جان کو رفتگی کی حالت تھی

یوں ہوا اُن کے کوچہ سے آنا
جیسے ہووے جہان سے جانا

اب جو گھر میں ہوں تو فسردہ سا
چارپائی پہ ہوں تو مردہ سا

جی اُنھوں میں فسردہ قالب یاں
متحرک ہو کیا تن بیجاں

حال دل کا کہوں جو ہمدم ہو
کروں پیغام کچھ جو محرم ہو

جی میں کچھ آیا روکے بیٹھ رہا
دل زدہ چپکا ہو کے بیٹھ رہا

کوئی آیا جو واں سے جی آیا
سو نہ آیا کبھی کبھی آیا

دیکھیے چند یوں رہیں گے جُدا
چاہے ہے کیا ہمارے حق میں خدا

خونِ دل کب تلک پئیں گے ہم
رنگ یہ ہے تو کیا جئیں گے ہم

آہ کیا کیا بیاں کروں خوبی
دل وہی حال پُرسی محبوبی

تند ہو کر نہ بات کو کہنا
ملتفت حال زار پر رہنا

لطف مبذول حال پر ہر آن　　تازہ ہردم مروّت و احسان
لب سے جاں بخش حرف سے دلجو　　لطف سے پوچھنا کہ خوش ہے تو
یاد کر روؤں اُن کی کونسی بات　　کس کاٹوں ہجر کے اوقات

مدّت ہجر اگر تمام ہوئی
ورنہ اپنی تو صبح و شام ہوئی

مثنوی جوشِ عشق

ضبط کروں میں کب تک آداب　　چل اے خامے بسم اللہ اب
کر ٹک دل کا راز نہانی　　ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میر اک خستۂ غم تھا　　سر تا پا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جاگہ　　بیخود ہوگئی جانِ آگہ
صبر نے چاہی دل سے رخصت　　تاب نے ڈھونڈھی اکدم فرصت
تاب و تواں و شکیب و تحمل　　رخصت اس سے ہوگئے بالکل
سینہ فگاری سامنے آئی　　بیتابی نے طاقت پائی
کرتے آئے داغ سیاہی　　کام جگر کا کرنے تباہی
خون جگر ہو بہنے لاگا　　پلکوں ہی پر رہنے لاگا
خواب و خورش کا نام نہ آیا　　ایک گھڑی آرام نہ پایا
چاک جگر سے محبت ٹپکی　　آنسو کی جاگہ حسرت ٹپکی
سوز سے چھاتی تا بہ گویا　　اور پلک خوں نابہ گویا
آہ سے اُس کی مشکل جینا　　درد فقط تھا سارا سینا
دل میں تمنا داغ جگر میں　　شیون لب پر یاس نظر میں
نالے شبکو اُس کے سُن کر　　مر گئے کتنے سر کو دُھن کر
آہ و فغاں ہے اُس کے لب پر　　روز ہے ابتک آفت سب پر

روئے و جبیں پہ خراشِ ناخن
داغوں سے خوں کے قیامت گلبن

زخمِ سینہ دل تک پہونچا
کوئی نہ اس گھائل تک پہونچا

آبلہ دل کا جب کوئی پھوٹا
فوّارہ لوہو کا چھوٹا

غم نے تو دل میں کیا ہے چھوڑا
پر میں تھا اک پکّا پھوڑا

سو نہ گیا یکدم وہ بے کل
بخت نہ جاگے اسکے اک پل

کام رہا ناکامی ہی سے
تسکیں بے آرامی ہی سے

رخساروں پر خون رواں ہو
دل میں ہو سو منھ پہ عیاں ہو

وشنۂ غم سے سینہ کو چا
ناخن سے مُنھ سارا نوچا

دل آما جگہ غمنا کی
اور نفس اک تیر خاکی

نے طاقت نے یارا اُس کو
ضعفِ دلی نے مارا اُس کو

نالۂ دل میں حزینی اُسکے
خاطر میں غمگینی اُس کے

رنگ اُڑے چہرے کا ہر دم
تھا گویا گل آخر موسم

دست بدل ہر آن رہے وہ
بیطاقت بے جان رہے وہ

رنگ شکستہ بس کہ فسردہ
کہنے کو زندہ لیکن مردہ

خونباری سے چہرہ گلگوں
حلق بسمل دیدۂ پر خوں

جدول جاری چاک گریباں
گوشۂ دامن وقفِ مژگاں

دیدۂ تر کے دریا قائل
ساحل خشک لبی کے سائل

ہر دم ہو ہر سمت کو جاری
خوں باری سے سیلِ بہاری

تشنہ لبی اک منھ پر پیدا
لب چش جس کا ہووے نہ دریا

خاک بسر آشفتہ سری سے
شور قیامت نوحہ گری سے

سر تا پا آشفتہ دماغی
داغِ جنوں دے جسکو چراغی

غم سے گرچہ دم بھی کہیں تھا
جامے میں اک تار نہیں تھا

وادی پر جب اپنے آوے
صحرا صحرا خاک اڑاوے

کلفتِ دل جب خاک فشاں ہو
اشک کی جاگہ ریگ رواں ہو

گل اُن نے از بسکہ کھائے — پھولوں کی چھڑیاں ہاتھ بنائے
دل کے غبار نے راہ جو پائی — شہر میں گویا آندھی آئی
سر پر اُس کے سنگ ہمیشہ — جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
آہ سرد کرے وہ عریاں — بید سا کانپے موئے پریشاں
گرد کی تہ اس کا پیراہن — دامن صحرا جس کا دامن
بار دامن تار گریباں — دامن قرب جوار گریباں
پامالی میں مثلِ جادہ — نقشِ قدم ساخاک اُفتادہ
دشت تلک گئی آبلہ پائی — دور کھنچی اُس کی رسوائی
اُس کے جو پامال ہوئے سب — خار بیاباں لال ہوئے سب
جن نے دیکھا اُس کو یکدم — اُن نے کہا یہ بھول کے سب غم
چندے یہ ناشاد رہے گا — پر مدت تک یاد رہے گا
جلنا اُس سے کرے نہ کنارہ — جیسے چراغِ وقف بچارا
لوہو ٹپکے آہِ سحر سے — لالہ گتھواں لختِ جگر سے
رکھتا سدا تھا وہ دیوانا — درد زباں یہ شعرِ دانا
صار فوادی شقاً شقا — حقاً حقاً حقاً حقا
ہوش خرد ناشاد گئے سب — دین و دل برباد گئے سب
دردِ دل سے کچھ نہ کہے وہ — ہر اک کا مُنھ دیکھ رہے وہ
حسرت اُس کی ایک اعجوبا — آب دہن کی موج میں ڈوبا
غیر سے بولے نہ یاروں ہی سے — بات کہے تو اشاروں ہی سے
سمجھ تو کوئی داد کو پہونچو — عاشق کی فریاد کو پہونچو
سرنہ رہے مَن مار کر اپنا — سر دے مارے ہار کر اپنا
کیونکر غم سے ہو آزادی — جان کے ساتھ اُسکی ناشادی
کوئی نہ اس پر سایہ گستر — اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر
نے کعبے نے دیر کے قابل — مذہب اس کا سیر کے قابل

کیسا کہیئے کیسا کچھ تھا　　القصہ وہ ایسا کچھ تھا

در صفتِ دلبرے کہ با اوُ علاقۂ دل بوُد

وہ کیسا تھا جس پر عاشق　　جی سے تھا یہ عاشق صادق
دیدۂ گل میں جاگہ اُس کی　　نکہتِ گل گردِرہ اُس کی
چشم برہ سارا چمن اُس کا　　نقش قدم تھا یاسمن اُس کا
آگے اُس کے کبھو نہ آیا　　یہ روگل نے کہاں سے پایا
گل آشفتہ اُس کے رو کا　　سنبل اک زنجیری مو کا
جب وہ چہرہ تابندہ ہو　　ماہ دو ہفتہ شرمندہ ہو
زلف اس چہرے پر تابندہ　　کا کل صبح سے خوش آیندہ
دیکھ اس گل کی نور افشانی　　شمعِ مجلس پانی پانی
ہو ہر چند یہ بدرِ کامل　　اس چہرے کے ہو نہ مقابل
حوصلہ کتنا اُس بے تہ کا　　مُنھ دیکھو آئینہ مہ کا
رکھتی تھی دعویٰ خوش چشمی پر　　لیکن اُس کی چشم نظر کر
بہتوں کی جب جامیں گھل گئیں　　نرگس کی بھی آنکھیں کھل گئیں
دور چشم ہے اُس کا جب سے　　فتنہ اک سوتا نہیں تب سے
رخ لب سے جاں بخش عالم　　بلکہ سراپا جان مجسم
عیسیٰ کو گر لب دکھلاوے　　ہرگز اُس کو بات نہ آوے
کوئی مردِ اندازِ حیا پر　　چشم اُس کی تھی پشت پا پر
کچھ مت پوچھو تنگی دہن کی　　مشکل تھی واں جائے سخن کی
کر کے شمیم زلف گزارا　　پھیلاوے ہے عنبر سارا
خط آیا ہے گرد اس لب کے　　شاید شکر تنگ ہو اب کے
دونوں لب اُس کے لعل بدخشاں　　دست حنائی پنجۂ مرجاں

تھا دیکھا یکرہ پردے میں   برق خرمن مہ پردے میں
جسدم برقع مُنھ سے اُٹھاتا   خورشید اُس دم ڈوبا جاتا
پار دلوں کے خدنگ مژہ کا   کاوش کم کم تنگ مژہ کا
بھوں کی کشش کا دوانہ عالم   تیر نگہ کا نشانہ عالم
تیغ و تیر تھی ابر و اُس کی   آتش سرکش جو تھی اُس کی
ناز کی مے سے مست رہے وہ   اکثر دست بدست رہے وہ
زلفوں کے سب تار پریشاں   سر اوپر دستار پریشاں
سایہ سے اُسکے سرو بنایا   خاک رہی سے تدرو بنایا
ہووے خراماں جب وہ کافر   کبک کی ہووے جان مسافر
چشم کرشمہ جان تغافل   شایاں اُس کی شانِ تغافل
کیا جانے وہ حال کسو کا   پتھر دل اُس آئینہ رو کا
پاتے ہی ابرو کا اشارا   غمزے نے اک خنجر مارا
جب وہ خرام ناز کرے ہے   جی کو جور نیاز کرے ہے
رخصت دے گر عشوہ گری کو   ایک ہی جلوہ بس ہے پری کو
ہنسنے میں وہ صفائے دنداں   برق خرمن عالمِ امکاں
رشک سحر کو صافی تن پر   خونِ صراحی اُس گردن پر
آہ صفائی اُس سینے کی   حیرت افزا آئینے کی
شکل چیں میں یہ ناز کہاں ہے   صورت ہے انداز کہاں ہے
ایسا خوب جہاں میں کہیں ہے   رحم ہے اسپر اب جو نہیں ہے
جب وہ شکل نظر آتی تھی   کلفت دل کی نکل جاتی تھی
نگیں اس کی اس کفِ پا سے   جائیں نہ کیوں یاں اپنی جا سے
چشم کرو انصاف کی گر وا   یوسف و شیریں لیلیٰ عذرا
کون ہوا اس محبوبی سے   خوبی تھی پر اس خوبی سے
ر نزاکت کیونکہ اُٹھاوے   شاخ گل سا لہکا جاوے

ہے گی رگ گل یا رگ جاں ہے
پر نازک اسرار میاں ہے
صید ملک قربانی اُس کا
یوسف اک زندانی اُس کا
اور جو خوباں پاویں اُس کو
یکدیگر و کھلاویں اُس کو
جاویں اس پر جان سبھوں کی
تیغ رہے درمیاں سبھوں کی
تھا بنا جائے کس کے کنے وہ
غصے ہو تو پھر نہ منے وہ
کیا کوئی شوخی اُس کی بتاوے
کچھ ٹھہرے تو کہنے میں آوے
کیا ہے اُس کے آب و گل میں
آرزو اُس کی سب کے دل میں
سب کو میل اُس بت کی ادا کا
بندہ کون رہا ہے خدا کا
دیکھے نہ عاشق زار کو اپنے
پوچھے نہ وہ بیمار کو اپنے
عاشق ظلم و جور و جفا کا
دشمن جانی اہل وفا کا
کوچہ رشک فزائے کعبہ
واں پہونچے نہ دعائے کعبہ
ہر شب اک فریاد و تظلم
اُٹھ گئی واں سے رسم ترحم
آہیں جن کی درد و ظائف
سو دل خستے واں کے طائف

رخصت شدہ رفتن یار و بیتاب شدن عاشق بیقرار

کراے خامہ وہ تحریر اب
آوے زباں پر جو تقریر اب
یعنی میر اُس خستہ غم کا
سر تا پا اندوہ و الم کا
بارے سفر کا مائل ہو کر
حبِ وطن کو جی سے دھو کر
رخصت کو اُس پاس بھی آیا
جلتے کے تئیں اور جلایا
وقتِ وداع قیامت گزرا
سر سے آب حسرت گزرا
اک دم بیخود ہو کے رہا وہ
اس سے آگے آپ گیا وہ
آنکھیں لگیں ناسور ہو بہنے
دیکھ اس گل کو لگا یہ کہنے
ظلم ہے لوہو پیتے رہیے
جان گئے پر جیتے رہیے
عمرِ عزیز چلی یوں جاوے
اور فلک آنکھوں سے دکھاوے

آخر کر کے خدا کے حوالا — آئینے پر پانی ڈالا
تا کہ رو دکھلاوے شتابی — راہِ دور سے آوے شتابی

یار رگئے پر میر جواب ہے
جان سے خالی اک قالب ہے

راقم غم ہے وہ دل تفتہ — نامہ بر اس کا رنگ رفتہ
غم سے فرصت اُس کو کہاں ہے — قاصد اشک ہمیشہ رواں ہے
خط لکھتا ہے اس مضموں سے — تر ہو بال کبوتر خوں سے
خط سے اک آتش پر ہووے — جس سے کباب کبوتر ہووے
جب دردِ دل اُن نے لکھا ہے — شعلہ خط میں لپیٹ دیا ہے
سوز کے آوے جب وہ بیاں پر — شعلہ اک جوں شمع زباں پر
جب کرے خونِ جگر سے انشا — یار کا اپنے شوق کفِ پا
ہو انگشت بُریدہ خامہ — اور حنائی کاغذ نامہ
راہ پہ بیٹھا وہ سرگشتہ — دیکھے راہِ عمرِ گزشتہ
آگے تھا کب ہجراں دیدہ — آہ وہ تازہ ظلم رسیدہ
کیا کیا بے طاقت ہوتا ہے — ہر دم جی رخصت ہوتا ہے
حال عجب ہے رنجوری سے — مرنے قریب ہے وہ دوری سے
جب وہ دردِ دل کو جتاوے — باتوں پر اُسکے رونا آوے
دستہ دستہ داغ بسر ہے — پرکالہ پرکالہ جگر ہے
اشک نہیں آنکھوں سے ٹپکتا — ہے یہ گرہ اک دل کی تمنا
داغ دروں ہے گلشن گلشن — گل یہ چنے وہ دامن دامن
چھوڑے نہ راہ و رسمِ وفا کو — دے پیغام ہمشہ صبا کو
پاس اس کے گر تیرا ہو جانا — بھولوں ہوؤں کو یاد دلانا
زیرِ لب اُس کے بات یہی ہے — شام سحر دن رات یہی ہے
کھینچیں گے کب تک یہ سختی ہم — پھر بھی ملیں گے جیتے جی ہم

بس اے خامہ رکھ لے زباں کو
تاب نہیں ہے اہل جہاں کو
قصۂ غم کو نہایت کب ہے
اس سے خموشی اب انسب ہے

مثنوی اعجازِ عشق

ثنائے جہاں آفریں ہے محال
زباں اس میں جنبش کرے کیا مجال
کمالات اُسکے ہیں سب پر عیاں
کرے کوئی حمد اسکی سو کیا بیاں
کہوں کیا میں اس کی صفات کمال
کہ ہے عقلِ کل یاں پریشاں خیال
خرد کنہ میں اُس کی حیران ہے
گماں یاں پریشاں پشیمان ہے
زمین و فلک سب ہیں اُسکے حضور
مہ و خور ہیں اس سے ہی لبریز نور
یہ صنعت گری اس ہی صانع سے آئے
کفِ خاک کو آدمی کر دکھائے
نہ آوے کسی کے جو ادراک میں
سو رکھ جائے وہ اس کف خاکمیں
بری ہے گا تمثیل و تشبیہ سے
منزہ ہے وہ بلکہ تنزیہ سے
وہی حاصل مزرع آسماں
کیے اُن نے دانے میں خرمن نہاں
سفید و سیہ کو نہیں اُس کی بار
ورے ہے زمانے کی لیل و نہار

در توحید انشاطراز حسینے کہ فقرۂ یکتائی او بعالم دویدہ

سوا اُس کے نقصاں ہے گر دیکھیے
کمال اُسکے ہی ہیں جدھر دیکھیے
سر رشتۂ ہے خلق کا اُس کے ہاتھ
وہ شب بازان پتلیوں کے ہے ساتھ
سبھوں میں نمود اُسکی ہی شان ہے
یہ قالب ہیں سارے وہی جان ہے
گل و غنچۂ و رنگ و بوئے بہار
یہ سب رنگ اللہ ہی کے ہیں یار

اگر چہ سبھوں کی ہیں طرحیں جدا — یہ سب طرحیں ہیں ایک نام خدا

سما ارض و خورشید یا ماہ ہے — جدھر دیکھو اللہ ہی اللہ ہے

نظر کر کے ٹک دیکھو ہر جا ہے وہ — نہان و عیاں سب میں پیدا ہے وہ

بہر صورت آئینہ ہے گا جہاں — یہ سب عکس اُسکے ہی پڑتے ہیں یاں

ملک جن و حیواں جماد و نبات — جو اس بن ہیں تو حیف ہے کائنات

وجود عدم اس سے دونوں ہیں شاد — وہی ہے گا مبدا وہی ہے معاد

مجھے ساقی دے کوئی جام عقیق — ولیکن لبالب ہو اس میں رحیق

رکھے آپ میں جس کی آمد مجھے — کہ در پیش ہے نعت احمدؐ مجھے

در نعت سیّد المرسلین

ثنا جانِ پاک محمدؐ کے تئیں — درود تحیات احمدؐ کے تئیں

رسولِ خدا و سرِ انبیا — زہے حشمت و جاہ صلِّ علیٰ

دیا مجلس کبریا کا ہے وہ — شرف دودمان قضا کا ہے وہ

سب اس صفحے میں ہیں ظہور خدا — پر اس سے عبارت ہے نورِ خدا

جہاں وہ ہے واں جبرئیلِ امیں — اُڑے حشر تک تو پہونچتا نہیں

کروں اُس کی قربت کا کیا میں بیاں — کہ تھا قاب قوسین ادنیٰ مکاں

مرا زیرِ پا اُس کے فرقِ نیاز — کیا جس کی خلقت پہ صانع نے ناز

بصورت اگر عبد مشہود ہے — حقیقت کو پہونچو تو معبود ہے

نہیں پا شکستوں کا اب دستگیر — محمدؐ بن اور آل بن اُسکے میر

گنہگار ہوں چشم ایک اُس سے ہے — توقع شفاعت کی ایک اُس سے ہے

درود آل پر اُسکے ہر صبح و شام — وہ ہے شافع حشر و خیر الانام

پلا ساقیا بادۂ لعل گوں — کہ ہو جائیں سرخ آنکھیں مانند خوں

ہے اب حرفِ مستانہ کا دمیں جوش — کر آویزۂ گوش گر کچھ ہے ہوش

مناجات بطور عاشقانِ زار در بلائے جدائی گرفتار

مرا زخم یارب نمایاں رہے — پس از مرگ صد سال خنداں رہے
رہے دشمنی جیب سے چاک کو — صبا دوست رکھے مری خاک کو
مژہ اشک خونیں سے سازش کرے — غمِ دل بھی مجھ پر نوازش کرے
جگر سے طپیدن موافق رہے — مرا درد دل مجھ پہ عاشق رہے
جو نالہ ہو شبگیر کا روشناس — وہ آٹھوں پہر ہی رہے میرے پاس
مژہ گرم افسوس و نمناک ہو — کہ سیلاب آتش پہ خاشاک ہو
کرے نیزہ بازی یہ آہِ سحر — کہ خورشید کی پھوٹ جاوے سپر
خموشی سے مجھ کو رہے گفتگو — اُڑے پر پر لگا کر مرا رنگ رو
نہ مرہم سے افسردہ ہو داغ دل — شگفتہ رہے یہ گلِ باغِ دل
سدا چشم حیرت سے نسبت رہے — مجھے دیکھ رہنے کی فرصت رہے
اگر ضعف تک کسب طاقت کرے — مری ناتوانی قیامت کرے
مری بیکسی ناز بردار ہو — مروں میں تو مرنے کو تیار ہو
بیاباں میں آشفتہ حالی کروں — کہیں تو دل پر کو خالی کروں
کریں دونوں عالم ملامت مجھے — ڈبو دیوے اشک ندامت مجھے
مرا ہاتھ ہو چاک کا دستیار — کہ تا جیب دامن ہو قرب و جوار
جنوں میرے سر پر سلامت رہے — بیاباں میں مجھ سے قیامت رہے
بھٹکنے سے مجھ کو نہ ہو وار ہی — بھلا دے خضر کو میری گمرہی
جو ہو گرم رہ پائے پُر آبلہ — تو ہو جائے سرد آتشِ قافلہ
ارے ساقی اے غیرتِ آفتاب — کہاں تک ہمیں خون دل کی شراب
کبھو ساغرِ بادہ کا دید ہو — محرّم ہمارا کبھو عید ہو

در تعریف عشق خانماں آبا و آزادگاں برنا نہاد

رہے عشق نیرنگ سازی تری
کہ ہے کھیلنا جی پہ بازی تری

تجھی سے ہے آبِ رخِ زرد زرد
تجھی سے مرے دل میں اُٹھتا ہے درد

تجھے ربط کفار و دیندار سے
تجھے رشتہ تسبیح و زنار سے

تجھی سے ہے بلبل کو نوحہ گری
تجھی پر ہے قمری بھی خاکستری

ترا جذب دریا کو بہنے نہ دے
ترا شور صحرا کو رہنے نہ دے

تجھی سے دلِ شاد غمناک ہے
تجھی سے مرا سینہ صد چاک ہے

تمنا کو تو نے کیا ہے شہید
تجھی سے نہ بر آئی میری اُمید

تجھی سے مجنوں صحرا نورد
تجھی سے ہے فرہاد کوہوں پہ مرد

تجھی سے گلو بند ہے خستگی
تجھی سے ہے وابستہ دل بستگی

تجھی سے دل عاشقاں ہے کباب
تجھی سے ہے پروانہ آتش کا باب

ترا کام دینا ہے بدنامیاں
تری ریجھ دیکھی ہیں ناکامیاں

تجھی سے سراسیمہ ہیں یار لوگ
تری تیغ سے قیمہ ہیں یار لوگ

تجھی میں ہیں یہ کار پردازیاں
تجھی پر ہیں موقوف جانبازیاں

مجھے اس کے چھپنے کا سودا رہا
ولیکن ترا راز رسوا رہا

لہو اپنا عاشق پیا ہی کیے
ترے جرم پر جی دیا ہی کیے

ترا ہی نمک خوار ہے زخم دل
کہ مرہم سے بیزار ہے زخم دل

تجھی اک ہی مژگاں سے یہ ربط اشک
کہ مشکل ہوا ہے مجھے ضبط اشک

کدھر ہے تو اے ساقی لالہ فام
نہ لغزش ہے تجھ بن کہ بہکا کلام

کہاں تک کوئی خونِ دل کو پیے
کوئی کیونکر اس رنگ ظالم جیے

زبانیٔ درویش جگر ریش کہ ایں بلا در سر آمد

کسو معتبر سے روایت ہے اک | کہ درویش سے یہ حکایت ہے اک
کہ اک ملک میں میں قضارا گیا | جواں ایک واں مفت مارا گیا
وہ جسطور مارا گیا اب کہوں | تعجب میں اسکے کہاں تک رہوں
سُن اب آجو کچھ اسکے جی پر ہوا | مصیبت زدہ بن اجل ہی موا
اُٹھا سیر کرنے کو میں ایک روز | پشیمانی اس کی ہے مجکو ہنوز
نظر جا پڑی جو مری اک سو | سرِ راہ بیٹھا تھا اک خوبرو
فقیروں کی سی جھولی ایک اُسکے پاس | بدن میں نہایت مکلّف لباس
سر اوپر تھا ہنگامہ اک اُسکے جمع | پتنگے اکٹھے ہوں جوں گرد شمع
لقب اُس کا دیوانۂ عشق تھا | کہ شہرت میں افسانۂ عشق تھا
جوانی کے گلشن کا وہ تازہ گل | کرے جس کی خاک قدم غازہ گل
اُسی کی سی مقدور تک سب کہیں | سدا اُس کا مُنھ دیکھتے ہی رہیں
وہ اک دودماں کا تھا روشن چراغ | جلاتے تھے سارے اُسی پر دماغ
ولے اُسکے دل میں اک آتش نہاں | کہ دیکھے جلا اُس سے سارا جہاں
سب آرام چاہیں اسے اضطرار | سراپا تلک ایک دل بیقرار
نہ کچھ ہوش گھر جانے کا اُسکو تھا | تشتت نہ مر جانے کا اُس کو تھا
نہ طاقت تھی تن میں نہ کچھ جی میں تاب | نہ دل پاس نے صبر و آرام و خواب
سر راہ دل قیمہ قیمہ لیے | یہ کہتا تھا مر جایئے بس جیے
سُن اُس نوگل عشق کی بیکلی | رہا کرتی ماتم سدا وہ گلی
دل و صبر و ہوش و توان و حواس | رہیں اُسکی وحشت سے سارے اُداس
نہ ناموس کا ننگ نے نام کا | بلا دوست دشمن تھا آرام کا
شب و روز فریاد کرنا اُسے | کئی بار اک دم میں مرنا اُسے

تماشے کا دیوانہ پیدا ہوا — زمانے کو چندے تماشا ہوا
جو دم لے طپش تو شتابی کرے — تسلی دل کی خرابی کرے
کرے طرح داغوں سے وہ باغ کو — روانی اُسی سے زر داغ کو
دل غمزدہ سے محبت اُسے — قیامت خوشی سے عداوت اُسے
وہ بیتابیوں سے بہت کم فراغ — کہاں صبر کرنے کا اُس کو دماغ
اُٹھی اُس کے جی سے فغاں کی شرر — وہی برچھیاں سہتی آہِ سحر
وہ ہر چند ہر صبح کو ہو ملول — ولیکن دعا اُسکی کیا ہو قبول
نہ آنسو کو اُس کے تھی اسپر نظر — نہ آہ سحر میں تھا اُس کے اثر
کہے رنگ رو کیوں مرا زرد ہے — رکھے ہاتھ دل پر کہ کچھ درد ہے
کرے دیدۂ اشک افشاں پہ ناز — بدے لخت دل رونے کی کچھ نیاز
وہ کاندھے پہ نعش تمنا کے تیئں — کرے تعزیت خانہ دنیا کے تیئں
سُنے نہ کسو کی نہ اپنی کہے — بیاں اُس کا کچھ گومگو ہی رہے
لے آ ساقی گر بادہ کا شوق ہے — یہ مستی کا ہم کو بھی ذوق ہے
کھلا چاہتا ہے گلِ رازِ عشق — کہ پردے میں کب تک بجے سازِ عشق

رفتن درویش پیش آں جوان رفتہ از خویش ودلدہی کردن او بیش از بیش

یہ قصہ جہاں میں فسانہ ہوا — مجھے بھی سخن کا بہانہ ہوا
دلے گاہ وہ شمع مجلس فروز — کئی بیتیں پڑھتا تھا وہ سینہ سوز
کہ جن کا یہ مضمون تھا دوستاں — جلے ہیکی تقریر کرتے زباں
بڑی آتش عشق سرکش ہے یاں — جگر کیوں نہ جلجائے آتش ہے یاں
نظر آ کہیں جا رہا ہے یہ جی — کہ آنکھوں میں اب آرہا ہے یہ جی
زن ومرد کی ہوں زباں سے بتنگ — ہوا ہوں میں سارے قبیلے کا ننگ

سدا خون دل میں طپیدہ ہوں میں
کہ آہ بلب نارسیدہ ہوں میں

تری دوری میں پہونچی ہے اے حبیب
وداعِ دمِ واپسیں بھی قریب

جگر تو ہو پانی بہا غم کے بیچ
یہ دم بھی ہوا ہے کوئی دم کے بیچ

سمجھنا یہ بھی اے مرے سر پہ خاک
کس اُمید پر میں ہوا ہوں ہلاک

تو جب سے در اوپر نظر آگئی
رہیں آفتیں میرے سر پر نئی

نہ نامہ نہ پیغام نے رسم وراہ
یونہیں ہوتی جاتی ہے حالت تباہ

دل و دیدہ سب مدّعی ہوگئے
تماشائی مجھ پر بہت رو گئے

کئی بار جاں لب پر آپھر گئی
کہاں ہے تو اے گل ہوا پھر گئی

یہ حیران ہوں صبر آتا نہیں
تصوّر ترا جی سے جاتا نہیں

خراشِ جگر سے ہے چھاتی میں درد
کہ جس سے ہوا جائے ہے رنگ زرد

رہا کرتی ہے داد بیدادیاں
دلِ شب سے گزرے ہے فریادیاں

سر رہ تک آدیکھ یہ خستہ حال
کہ ہے نقش پا کی طرح پائمال

ترے دورِ غم میں تو جوں کیمیا
سُنا ہی گیا نام مہرووفا

نہ آتا نظر ہی ادا ہے ولیک
نہ اتنا کہ جاتا رہے جی سے ایک

ترے غم میں اسے آفت روزگار
ہزاروں بلائیں ہیں یاں روبکار

کہاں ہے تو محمل نشین حیا
سرِ راہ نالاں تھا مثلِ درا

کہہ اس طرز سے حالِ دل کا تمام
خموشی کو پھر اُس نے فرمایا کام

کہاں ہے تو اے ساقیِ گلعذار
کہ دے مجھ کو جام خوشگوار

لکھوں قصۂ عشق بے کیف دکم
قلم بیخودانہ کرے کچھ رقم

مجھے آہ اک اس کے دل کی لگی
کہے تو کہ سینے میں برچھی لگی

گیا زہرۂ تاب دل آب ہو
کہا آگے جا کر میں بیتاب ہو

کہ اے ناز پرورد مہر و وفا
کوئی اپنے جی پر کرے ہے جفا

مثل ہے کہ جی ہے تو ہے گا جہاں
وگرنہ موئے پر ہے کیا میری جاں

تلف یوں نہیں جان کرتا کوئی
نہیں اس سلیقے سے مرتا کوئی

تہ دل ہو معلوم تا بول تک
تو مژگان خوں بستہ کو ٹک کھول تک

سخن حسرت آلود کہنے پہ آ
کچھ اک دل کی باتیں زباں پر بھی لا

وگرنہ تو رُک رُک کے مرجائیگا
یہ ہے عشق کام اپنا کر جائے گا

تو ہے صرصرِ غم سے آتش بجان
دیا سانہ بجھ جائیو اے جوان

تو اے شمعِ خامش زباں ٹک ہلا
کہ کس مجلس افروز سے تو جلا

تو کس آتشِ تند پر ہے سپند
ترا دودِ دل یہ ہوا ہے بلند

جلاتی ہے آتش تری میرے تئیں
کیا داغ کس شعلے نے تیرے تئیں

گھٹا پاتے ہیں تجھ کو ہر صبح و شام
نہ کاہیدہ ہو تو ہے ماہِ تمام

ترا درد پنہاں ہے گو آشکار
یہ مجھ سے بیاں کر کہ ہوں رازدار

کہیں دل لگا ہو تو یہ مجھ سے کہہ
کہوں اس سے جا کر غمیں تو نہ رہ

جہاں کو تو بھیجے وہاں جاؤں میں
کہے کام جو تو بجا لاؤں میں

جو حورِ بہشتی بھی ہو تیری یار
کروں میں ملک کی طرح واں گزار

خدا جانے کیا جی میں بات آگئی
کہ یہ میری دلجوئی ہی بھا گئی

یہ سُنکر جوانِ زخود رفتہ نے
جگر سوختہ اور دلِ تفتہ نے

کیا سوزِ دل کو لبوں پر نمود
زباں تاب کھانے لگی جیسے دود

سخن ہونے لاگے نمودار کچھ
لگا کرنے پیچیدہ گفتار کچھ

کہ جس سے یہ معنی ہوئے مستفاد
کہ اے غمگسارِ دلِ نامراد

جو دلجوئی میری ہے مدِ نظر
تو یاں اک محلّہ ہے ٹک قصد کر

نہیں اُسکو درکار کچھ جستجو
سرا ایک تر ساکی ہے قبلہ رو

زبانی مری درپہ یہ جا کے کہ
کہ احوال سے میرے غافل نہ رہ

ترے واسطے خوب رسوا ہوا
مرے سر پہ ہنگامہ برپا ہوا

تسلّی شکیبائی مطلق نہیں
پر اب تب تنہائی مطلق نہیں

رہی جب تلک تن میں تاب وتواں
اُٹھایا تحمل کا بارِ گراں

شتابی سے دے ساقیا جامِ عشق
کہ لکھنے لگا ہوں میں پیغامِ عشق

ہوا آخراب دل کا سب خون ناب — پیوں کب تلک اک گلابی شراب
کہے سے جواں کے غرض قصد کر — گیا بندہ ترسا کے دروازے پر
سُن آواز دستک کی اک رشک حور — مہ چاردہ سی نپٹ با شعور
دوچار آکے مجھ سے ہوئی ایکبار — گیا جسکے دیکھے سے صبر و قرار
ہوئی دیکھے سے جب حقیقت عیاں — کہا میں کہ تاجر پسر تھا جہاں
بشر کیا کہ دیکھ ایسی آفت کے تئیں — فرشتہ بھی رو بیٹھے عصمت کے تئیں
کہا میں نے پیغام جو آیا بن — یہ خوبی سے اس کی کروں کیا سخن
مژہ بخت عاشق کی برگشتگی — نگہ ایک عالم کی سرگشتگی
قد و قامت اس کا کروں کیا بیاں — قیامت کا ٹکڑا ہوا تھا عیاں
وہ نازاں جدھر آتی تھی اچپلی — قیامت بھی آتی جلو میں چلی
میں سودائی اس زلف تاریک کا — ہر اک مو سبب رنج باریک کا
شکن اُس کی کاکل کا دام بلا — ہر اک حلقۂ زلف کامِ بلا
بھوؤں کی کمانوں سے لگ زلف تار — اُلٹتے تھے اُڑ اُڑ کے جوں تیر مار
اگر ابر و اُس کی جھمک جاتی تھی — مہ نو کی گردن ڈھلک جاتی تھی
ہلے اس کے ابرو جدھر کر کے ناز — کرے اُس طرف ایک عالم نماز
کمان اُسکے ابرو کی عاشق کمیں — خدنگ اُسکے مژگاں کی سب دلنشیں
نہ آنکھوں کی مستی کی اُس کو خبر — خرابی نہ عاشق کی مدِ نظر
نگہدار تھی سُرخی چشم کی — طرفدار تھی اپنے ہی خشم کی
شہید اُس کی چشمک کے دل خستگاں — نشانے نگاہوں کے دل بستگاں
مژہ موجب قتل جمع کثیر — غرض سب تھے یہ ایک ترکش کے تیر
چھپیں اسکے غمزے میں کتنی سناں — نمایاں ہوئے سب پہ مرگ جہاں
رواں اس شب افروز سے اشک شمع — یہیں سے ہے روشن کہ تھی رشک شمع
وہ مردوں کو زندہ دوبارا کرے — مسیحا جہاں سے کنارا کرے
پری منفعل رنگ رخسار سے — خجل کبک انداز رفتار سے

خضر تشنہ اُسکے ہے دیدار کا
مسیحا شہید اُس کے بیمار کا

سوا اُس کی باتوں کے سب باتیں ہیں
جسے سُنکے مردے بھی جی جاتے ہیں

غرض اور سب یونہیں کہنے کو ہیں
مسیحا کے لب یونہیں کہنے کو ہیں

لبِ سُرخ اُس کے وہ گلبرگ تر
چھپیں جن میں دنداں کے سلک گہر

تبسم میں اپنے وہ برق بہار
دم حرف ہوتے گئے آبدار

دہن غنچۂ ناشگفتہ سے کم
سخن رہروراہ تنگ عدم

تبسم تنک گر وہ دلکش کرے
تو گلشن میں گل صد چمن غش کرے

نہ دیکھا کسی نے جوتن اُس کا صاف
نظر گرنہ ٹھہرے تو کیجے معاف

کمر اس کی ممکن نہیں ہاتھ آئے
مگر صاحب دستِ غیب اُسکو پائے

نہ رنگ صفا ہی فقط تن پہ تھا
کہ مینا کا خون اُس کی گردن پہ تھا

کیا اُن نے پامال فتنوں کا خون
حنا اُسکے ہاتھوں میں کتنوں کا خوں

ادا اُس کی عاشق کے جی کی بلا
نہ میری تمہاری سبھی کی بلا

اگر جلوہ گر ہو وہ محشر خرام
تو معلوم ہے پھر جہاں کا قیام

خراماں خراماں جدھر آگئی
قیامت ہی گویا ادھر آگئی

اُسے لغزشِ پا مئے ناز سے
وہ مستِ سر انداز انداز سے

نہ ہووے وہ دن جس میں ہووے نقاب
چلا جائے پردے ہی میں آفتاب

اُسی بت کا ہر اک تئیں ذکر ہے
خدا کو خدائی کی اب فکر ہے

چڑھاوے اگر ہاتھ سے آستیں
تو پھر دستِ موسیٰ بھی کچھ ہے نہیں

ہوئیں طرح اس سے جفا کاریاں
نکالی ہیں اُن نے دل آزاریاں

ترحم کو پاؤں تلے وہ ملے
ستم اُس کے کوچے سے بچکر چلے

جو آمد ہو اُسکی نصیب چمن
کرے ترک گل عندلیب چمن

گلی اس کی فردوس کا تھی شرف
بہشت اک گنہگار سی اک طرف

زمین اس کی یکدست گلزار تھی
نسیم چمن واں گرفتار تھی

گلی اس کی وہ قتلگاہِ عجیب　　شہادت جہاں خضر کو ہو نصیب
وہی جائے باشِ دلِ عاشقاں　　اسی پر معاشِ دلِ عاشقاں
صبا گر اُڑا دے تنک واں کی خاک　　تو نکلے زمیں سے دلِ چاک چاک
کئی نعرہ کش واں کئی نعرہ زن　　کئی خوں گرفتہ کئی بے کفن
کئی بے وطن واں سفر کر گئے　　سسکتے ہیں کتنے کئی مر گئے
ہر اک جان ہر شخص ناکام کی　　ہوادار اس کے لبِ بام کی
پھروں گرد ساقی نشے میں ترے　　گلابی ہی منھ کو لگا دے مرے
مجھے مست آبِ سیہ دیکھ کر　　چلوں جوں قلم پھر بھی مطلب اوپر
سُنا وہ جگر سوز پیغام جب　　کئے آشنا حرف سے لعل لب
پڑھی اک رباعی یہ کر اعتبار　　کہ مضمون جس کا یہ موزوں ہے یار
کہ ہجراں میں جو بیقراری کرے　　سرِ راہ فریاد و زاری کرے
نہ سونے دے نالوں سے ہمسایہ کو　　بھلی مرگ ایسے فرد مایہ کو
محبت کی رہ میں یہ پہلا ہے کام　　کہ سر سے گزر جایئے شاد کام
نہیں شرط اُلفت میں چینِ جبیں　　اگر پیش آوے دمِ واپسیں
جو پھوٹا ہی پڑتا ہو جوں آبلہ　　وہ ہے دم میں وا ماندۂ قافلہ
نہ ہو جو سکے ہجر کا پائمال　　تو بہتر ہے ہونا ہی اُسکا وصال
گیا میں جواب اس سے لیکر ادھر　　سرِ رہ تھا پامالِ غم وہ جدھر
حقیقت بیاں کی سب اس جائے کی　　جواں نے یہ سُنتے ہی اک ہائے کی
گئی ساتھ اس ہائے کے اُسکی جان　　گرا خاک پر ہو کے بیدم جوان
تکے تھا مگر رہ سفر کر گیا　　کہ اک بات کی بات میں مر گیا
نہ دیر اس کو ہوتے ہوئے جی سے سیر　　مجھے بات کے کہنے لاگی بھی دیر
مری بات میں خون بلبل ہوا　　دیا سا وہ جلتا جو تھا گل ہوا
میں یہ واقعہ دیکھ گھبرا گیا　　کہ یوں یہ گل تازہ مرجھا گیا
نہ سوجھا مجھے اور کچھ اس سوا　　کہ کریے بیاں طرفہ ثانی سے جا

ملامت کروں اسکو میں اک جہاں
کہ اے بے حقیقت گئی اسکی جاں

ترے ناز بیجا کا تو کیا گیا
پر اک بے گنہہ اس میں مارا گیا

رہی گھر میں خوبی پہ تجھ کو نظر
سر رہ گیا ایک جی سے گزر

کفِ خاک اس کی ہے ذلت کا باب
تری آستاں بن یہ ہے گی خراب

یہ ٹھہرا ادھر میں روانا ہوا
اُدھر مرنا اس کا فسانہ ہوا

پلا ساقیِ ماہ وش ایک جام
گیا کاستن ہی میں ماہِ تمام

کہاں ہے وہ خونِ کبوتر سی مے
کہ پی کر فغاں کیجیے مثلِ نے

غرض جوں توں کر قطع میں راہ کی
گیا تھی جہاں منزل اس ماہ کی

کی آواز دستک کہ یارِ دگر
ہوئی گھر میں القصہ میری خبر

درخانہ پر آئی ایک پیرزن
لگی کرنے عشق جواں سے سخن

کہ کیوں دوسری بار آیا ہے تو
شگوفہ مگر اور لایا ہے تو

کوئی رہ گیا تھا پیام جواں
جو تو پھر شتابی سے آیا ہے یہاں

بیاں کر جو کہنا ہو تجھ کو شتاب
کہ ہے منتظر غیرتِ آفتاب

کہا میں نے اے پیرزن کیا کہوں
عزادار اس نوجواں کا میں ہوں

پیام اُس کا لایا تھا میں اسلیے
کہ وہ بے اجل مرتا ہے ٹک جیے

سویاں سے گیا ایسا لے کر جواب
کہ جس سے نکلتا تھا ناز و عتاب

نہ تھی تاب حرف درشت اُسکے تئیں
کیا غم نے تھا نیم کشت اُسکے تئیں

نہ مشغول یونہیں وہ زاری سے تھا
وہ بیتاب بے اختیاری سے تھا

نہ سمجھی یہ رشک پری اسکے تئیں
دکھائی دی عشوہ گری اُسکے تئیں

چڑھا اُن نے تیوری اک انداز سے
کہا بیمزہ ہو کے یوں ناز سے

کہ جس کو نہ ہو تاب لانے کی تاب
شتابی سے مرنا ہے اُسکا صواب

ہوا سامنے اُسکے میں حرف زن
یہ اُسکی زباں سے کہا میں سخن

جواں سُنتے ہی کر کے ایدھر نگاہ
سفر کر گیا جان سے بھر کر آہ

یہی ماجرا کہنے آیا ہوں یاں
خبر اُسکے مرنے کی لایا ہوں یاں

کہہ اس سے کہ اے کشتۂ غم کی جان
گیا آخر الامر جی سے جوان
یہ کہہ دس قدم واں سے میں تھا چلا
کہ اک شور کانوں میں میرے پڑا
گزرنے لگی دل سے آواز آہ
لگا ہونے آنکھوں میں عالم سیاہ
صدا ایک نوحے کی آنے لگی
کہ یعنی وہ دختر ٹھکانے لگی
محبت نے کام اپنا پورا کیا
کہ ان دونوں لعلوں کو چورا کیا
فقیر آن کر سخت نادِم ہوا
کہ میرے سبب دونوں کا جی گیا
یہ بھی جائے گر یہ ہے ساقی سُنا
کہ بدلے گزک کے ہے یاں دل بُھنا
تھوڑی دارو دے سایۂ تاک میں
برنگِ گل اب لوٹیے خاک میں

مقولۂ شاعر

عجب کی نہیں جانہ کھا پیچ و تاب
یہ میرا اب جو ہے عشق خانہ خراب
سُنا ہے کہ فرہاد پر کیا ہوا
پھر اس عشق نے شیریں سے کیا کیا
عزا کا ہے مجنوں کی نوحہ پڑا
سیہ خیمہ لیلیٰ کا بھی ہے کھڑا
گئی جان وامق کی کس رنگ سے
ہوا خاک عذرا کا سر سنگ سے
گئی آہ نل کی فلک سے ادھر
دمن سے بگولہ زمیں کے اوپر
بہت عشق کی آگ میں جل گئے
بہت اُٹھتے جاتے ہیں شعلے نئے
گئی جل کے آخر پتنگوں کی جاں
چراغوں سے اک دودِ دل ہے کشاں
ہے بیتاب ذرّہ اسی سے کباب
جلے ہے اسی آگ میں آفتاب
دل اس داغ سے مہہ کا بھنتا ہی ہے
کتاں کا جگر چاک سُنتا ہی ہے
سیہ رنگ اُگتا ہے سرو سہی
وہی رنگ قمری ہے خاکستری
بھنور کے بھی جی پر پڑے گل گئی
کنول کی کھلی آنکھ پھر مند گئی
کوئی نالہ بلبل سے ہے یادگار
خزاں اس چمن میں ہے گل کی بہار
کہیں ساقی دے آب گلرنگ کو
کشادہ بھی کر اس دل تنگ کو
گلے لگ کے مینا کے ٹک رو یئے
فسانہ بھی آخر ہے اب سو یئے

بعض سوانحات میر

مثنوی ننگ نامہ

پاؤ توفیق ٹک تو سر کو دُھنو
یہ بھی اک سانحہ ہے میر سُنو

ہم کو درپیش تب سفر آیا
جبکہ برسات سر ہی پر آیا

ابر ہونے لگے سپید و سیاہ
پانی رستوں میں کیچ ساری راہ

بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب
مُنھ اٹھانے کی جی میں ہوتی تاب

سو تو کمل نہ پٹو نہ لوئی
سایہ گستر نہ ابر دن کوئی

ابر ہی بیکسی پہ روتا تھا
ابر ہی سر کا سایہ ہوتا تھا

کیچ پانی میں کپڑے خوار ہوئے
ووہیں گاڑی میں جا سوار ہوئے

رہروی کا کیا جو ہم نے میل
بھینس چھلے کے تھے بہل کے بیل

آسماں آب سب زمیں سب کیچ
خاک ہے ایسی زندگی کے بیچ

شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی
پانی کے سطح پر نگاہ پڑی

لجے لطمے کا کیا کہوں میں اوج
باتیں کرتی ہے آسماں سے موج

دامن ابر پاٹ دریا کا
دے گرہ تو کہے کہ باندھا تھا

ہوش جاتا تھا دیکھ جوش آب
گوش کرتا تھا کر خروشِ آب

آب تہ دار اور تیرہ بہت
لہر اُٹھتی جو تھی سو خرہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفان
دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان

ہمرہِ موج سیکڑوں گرداب
ساتھ تھی صدتری کے چشم حباب

ناؤ میں پاؤں ہم نے بارے رکھا
خوف کو جان کے کنارے رکھا

جزر و مد سب حواس کھوتا تھا
خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا

جبکہ کشتی رواں ہوئی واں سے
جسم گویا کہ تھا نہ تھی جاں سے

موجہ اُٹھنے لگا جو طوفاں زا
لجہ آیا نظر سو عماں زا

کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم — تا خدائی خدا نے کی اُس دم

بَلّی لگتی نہ تھی نہ کچھ تھی تھاہ — عقل گم کردہ لوگ تھے ہمراہ

ریلا پانی کا جبکہ آتا تھا — خوف سے جی بھی ڈوبا جاتا تھا

خطرِ غرق سے تھی طاقت طاق — بیخودی سے ہوا تھا استغراق

بہتا پھرتا تھا خضر کشتی پاس — غوطے کھاتے تھے حضرتِ الیاس

بد بلا سے تھے ہمکنار ہوئے — تھا خدا ہی تو بلّی پار ہوئے

کسو درویش کا تھا یمن قدم — جاکے پہونچے جو اس کنارے ہم

ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا — گوہر جاں سے ہاتھ دھویا تھا

اس کنارے کا جو اثر پایا — ہم تلاطم کشوں میں جی آیا

اُس طرف اُترے آب کے جاکر — میرؔ اور پیر صاحب و چاکر

شکر لب پر دلوں سے محو گلا — کس و ناکس سبھوں سے خضر ملا

پار کا گنج تھا جو شاہ درا — سب نے رہنا وہیں کا جی میں دھرا

فاصلہ ایک کوس کا تھا بیچ — راہ یاں سے تھی واں تلک سب کیچ

تھے بہت بیچ میں نشیب و فراز — پہونچے واں شام کھینچ رنج دراز

سو نہ جاگہہ تھی نہ مکانِ مبیت — چار دوکانیں ایک پھوٹی مسیت

جا کے حیراں ہوئے کدھر جاویں — سر گھسیڑیں جو ٹک جگہ پاویں

تگ ودو ہر طرف لگے کرنے — تسپہ پڑتے تھے مینھ کے بھرنے

کوئی میداں میں کوئی چھپر میں — کوئی در میں کوئی کسو گھر میں

گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ — جسر، سے بیت الخلا کو آوے ننگ

بیٹھنے دیں نہ جب کہ صاحب کو — کون پوچھے نفر مصاحب کو

ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے سرایائی — ویسے گھر چھوٹے ویسی جا پائی

رہنا بھٹیاری کے غنیمت جان — جو کہا اُن نے ہم گئے سب مان

کچھ پکانے کا جب سوال کیا — میں نے اظہار اپنا حال کیا

یاں جو لائے ہیں مجھکو اپنے ساتھ — زندگانی مری ہے ان کے ہاتھ

پہونچے ہے اُنکے روبرو سے طعام — صبح کا صبح مجھ کو شام کا شام

اور پکوایئے تو زاید ہو — خامے سے اپنے اور عاید ہو

جو کچھ آیا سوکھا لیا میں نے — کچھ رہا سو اُٹھا دیا میں نے

سُن کے اک دل سے کھینچی اُن نے آہ — اور بولی کہ واہ صاحب واہ

ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے — چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے

کچھ یہ کھاویں گے کچھ کھلاوینگے — ہم کچھ اُن کے سبب سے پاوینگے

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم — ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

کھانے پینے کی کچھ نہیں ہے بات — دیکھیے کس طرح سے گزرے رات

صدقے ہیں ایسے بھی اُتارے کے — سو گئے بخت گھر ہمارے کے

میں کہا مہترانی جی کچھ لو — مجھ سے آزردہ دل نہ اتنی ہو

بعضے کھاتے ہیں کچھ کھلاتے ہیں — بعضے مجھ سے بھی آتے جاتے ہیں

بارے جوں توں ہوئی وہ رات تمام — صبح کو صاحبوں کا ٹھہرا مقام

یہ بھی دن شب ہوا سحر تھا کوچ — غازی آباد کو گئے سب پوچ

راہ طے کر سرا میں جا اُترے — کچھ ستم دیدہ پاس آ اُترے

صاحب اُترے حویلی میں آکر — باغ میں اُسکے سب نفر جاکر

بارور تھے درخت سب یہ بھی — پھل و لیکن کنھوں نے پایا بھی

اس بھی منزل میں ایک روز رہے — گزرے جس طور کوئی کس سے کہے

لوگ جسدم سوار ہونے لگے — اور اسباب بار ہونے لگے

سوہنی اس رواروی میں گئی — لوگ تھے مضطرب جگہ تھی نئی

وحشت اسکو زبس کہ طاری ہوئی — سر پٹک کر کسی طرف کو موئی

ایدھر اودھر تلاش کر دیکھا — گم شدہ کو نہ پھر نظر دیکھا

ساری بستی میں جست و جو کو گیا — دیر تک یہ خیال سب کو رہا

جن کی آتی ہے ایسے جاتے ہیں — کہ نہ پھر کھوج ان کا پاتے ہیں

مرگ تھی اس کی اس جگہ تقدیر — بلّی تھی یا کہ گربۂ تصویر

رنگ جیسے کہ وقت گرگ و میش — یعنی سُرخی تھی کم سیاہی بیش
جن سے مالوف تھی وہیں رہتی — ان سے کچھ کچھ نگاہوں میں کہتی
کیا نفاست مزاج کی کہیے — ستھری اتنی کہ دیکھ ہی رہیے
خال جوں پھول گل کترتے ہیں — یا کہ نقشوں میں رنگ بھرتے ہیں
چوہے چڑیا پہ اُن نے کب کی نظر — حج کا کرنا نہ فرض تھا اُس پر
موہنی بھی تو تھی بہن اُس کی — نسبت اس کی تھی وہ بہت گھسکی
پاوے جو کچھ سو مار کھاوے یہ — ایک کیا چار چار کھاوے یہ
جانور مارنا تو ہے یک سو — تیز پنجہ کیا نہ اُن نے کبھو
یہ نزاکت اسی کو بن آوے — موش دشتی کو دیکھ ڈر جاوے
ان نے مارے ہیں ایسے کتنے ڈھونس — گھونس دیکھی تو ہووے کوئی گھونس
یہ چھچھوندر کے بولتے بھاگے — وہ پڑی سوتی بھی ہو تو جاگے
چھپکلی سے یہ پھیر مُنھ کو لے — وہ جفا کا رجیفہ پر جی دے
یہ پری سی تھی جو خرام کرے — وہ جو اُچھلے تو دھوم دھام کرے
کبک اس کی خرام کے عاشق — جانور اس کے نام کے عاشق
غرض افسوس کی جگہ بلّی — اب کہاں گو کہ چھانیے دلّی
ایسی بیگم مزاج بلّی کھو — بیگم آباد ہم گئے یارو
واں سے میرٹھ سبھوں نے کی منزل — کیچ پانی اگر چہ تھا حائل
گرتے پڑتے پہونچ گئے سارے — ہم جفائے سپہر کے مارے
واں سے لاوڑ نسنگ پھر وان سے — جا کے واں تنگ آگئے جاں سے
اگ گڑھی بود و باش کو پائی — کچھ نہ کھانے کو جس میں نے کھائی
چھوٹی پھاٹی سی چاردیواری — اور میدان تھی گڑھی ساری
پھر نہ میدان بھی برابر تھا — ہر قدم ایک غار و پتھر تھا
کھنڈر سے اس میں تین چار مکان — جنکا گرنے پہ سخت ہے میلان
وہ گڑھی ساری کھتّے ناج کے تھے — برسوں سے تھے پڑے نہ آج کے تھے

خاک مٹی سے ان گڑھوں کو بھرا
بنگلا اک لا کے اُسکے بیچ دھرا

خشتی پائے اگر نہ بنواتے
باؤ میں اس سمیت اُڑ جاتے

باؤ جنگل کی تند کچھ نہ رکاؤ
مینھ میں چل پڑے تو کانپے جاؤ

اک گڑھی جس کی سیکڑوں راہیں
واں ٹھہرنے کو چاہیئے باہیں*

وہ رہے جو رکھے بہت سے لوگ
یا کوئی جوگی جو کرے واں جوگ

ورنہ مشکل بہت ثبات قدم
دل میں اک ہول ہی رہے ہردم

باؤ سی دن کو سائیں سائیں کرے
رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے

گر شکستہ ہوئی کہیں دیوار
بے زری سے بنانا ہے دشوار

ہفتہ ہفتہ تلک پڑی ہے خراب
پردہ کا ہے کا پھر ہے رفع حجاب

کار پردازوں کو تقید ہے
شور ہے گالی ہے تشدد ہے

وے بچارے بہانے کرتے ہیں
رات دن لوگ چوکی بھرتے ہیں

کہتے اُن سے تو یہ ملے ہے جواب
کس کے گھر سے بناویں لاکے شتاب

ہم کو کھانے ہی کا تردّد ہے
صبح بقال کا تشدّد ہے

بنیا مُنھ کو چھپائے جاتا ہے
روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے

حال کب پوچھنے کے ہے قابل
ہم فقیروں کے رنگ ہیں سائل

سوچیں ہیں جب تو جھول جاتے ہیں
بات کہتے ہیں بھول جاتے ہیں

تم کو دیوار پاکھے ہیں گے یاد
ہم کو کرتا نہیں خدا آزاد

کس کو موسیں کہاں سے کچھ لاویں
واں آٹا جو تم کو پہونچاویں

تم کہو دال ماش کی ہے زبوں
یاں بہم پہونچے ہے جگر ہو خوں

تم کہو آٹا کرکرا کھایا
یاں کلیجہ چھنا تو ہاتھ آیا

اور دو چار روز یہ بھی ہے
ایک غم سینہ سوز یہ بھی ہے

فصل ہونے ابھی نہیں پائی
پیشگی سب سے قرض لے کھائی

جس سے جھوٹے ہوئے ہیں ہم دس بار
چوتھا وہ کہے ہے ساہوکار

ماش کی دال کا نہ کریے گلا
گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا

* واں کے آگے جگہ چاہیئے

چاہتے ہو تو مول لو اک بُز　　ورنہ بیٹھے رہو بنے جز بز

ہی لینے کو پیسے ہیں کس پاس　　کھاؤ دال اور پادو بے وسواس

جی اگر چاہے کوئی ترکاری　　گول کدّو ملے بصد خواری

بھنڈی بیگن کے ناؤں ڈھینڈس تھا　　اروی توری بغیر جی بس تھا

جز کدّو پاوے کلّو مدّھو کیا　　یعنی کچھ اور واں تھا کدّو کیا

دارو گولی کے کچھ نہ تھے اسباب　　ماش کی دال کھاتے تھے احباب

جو گڑھی میں نہ چھوٹتے یوں گوز　　بجتی رہتی تپک کہاں سے روز

گھاس ہی گھاس اس مکاں میں تمام　　تس میں لساع جانور اقسام

جیسے زنبور زرد ایسے ڈانس　　کاٹ کھاویں تو اچھلو دو دو بانس

پشۂ دکیک اور کتّی تھی　　جن کاٹے اچھلتی پتّی تھی

ہاتھ پنڈوں پہ سب چلے جاتے　　شبگوں سے بدن جلے جاتے

ان کے کاٹے بدن پہ دانا ہے　　مرچ جدوار پھر لگاتا ہے

ایک دو دن جلا فراغ ہوا　　اس کی جاگہ سیاہ داغ ہوا

نہ کھجاتے کھجاتے سارے گھسے　　چھٹے چپٹے ہوئے جو دانے پسے

دن کو وہ صورتِ طعام ہوئی　　رات کو نیند یوں حرام ہوئی

کتّوں کے چاروں اور رستے تھے　　کتّے ہی واں کہے تو بستے تھے

دو کہیں تھے کھڑے کہیں بیٹھے　　چار لوگوں کے گھر میں ہیں بیٹھے

ایک نے پھوڑے باسن ایکو نے　　کھود مارے گھروں کے سب کونے

کوئی گھورا کرے کوئی بھونکے　　خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے

سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک　　شعر عف عف سے آفت آئی ایک

گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے　　روٹی ٹکڑے کی بو پہ گرنے لگے

ایک نے آکے دیگچا چاٹا　　ایک آیا سوکھا گیا آٹا

ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا　　پھر پیا آکے تیل اگر چھوڑا

گھورنے اک لگا اندھیرا کر　　ایک نے اور ایک پھیرا کر

گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیے ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیے
لوگ سوتے ہیں کتے پھرتے ہیں لڑتے ہیں دوڑتے ہیں گرتے ہیں
جبکہ ہڈی پہ چار چار لڑیں گوشت پر بھیڑیے سے دوڑ پڑیں
ایک کے پیچھے ایک روز و شب لینڈی سی واں نہ بندھ رہی تھی کب
کتے ہی واں دو چار رہتے ہیں دو گئے بھی تو چار رہتے ہیں
جاگتے ہو تو دو بدو کتے سو کر اُٹھو تو روبرو کتے
سر پہ دربان کے بلا ہی رہے کتا ایک آدھ گھر میں جا ہی رہے
منھ میں کف دور دور کرنے سے حال بیحال شور کرنے سے
تو کہے سنکے وہ گلا پھاٹا باؤلے کتے نے اُسے کاٹا
کتوں کی کیا سما جتوں کو کہیں چچڑی سے رات دن لگے ہی رہیں
باہر اندر کہاں کہاں کتے بام و در چھت جہاں تہاں کتے
جھڑ جھڑاوے ہے کان کو کوئی رووے ہے اپنی جان کو کوئی
ایک طرف ہے چپڑ چپڑ کی صدا یعنے کتا ہے چکی چاٹ رہا
ایک چھینے کو منھ میں لے آیا ایک چولھے کو کھودتا پایا
ایک کے منھ میں ہانڈی ہے کالی ایک نے چلنی چاٹ ہی ڈالی
تیل کی کپی ایک لے بھاگا ایک چکنے گھڑے سے جا لاگا
کتے یارو، کہ جان کا تھا روگ جاں بلب ہوں نہ کسطرح سے لوگ
آدمی کی معاش ہو کیونکر کتوں میں بود و باش ہو کیونکر
بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد کہ بیابان سخت سے دے یاد
چار چھپر کہیں چماروں کے سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
پھر چلو آگے تو نہیں ہے کچھ ڈھنڈھ سا اور جو کہیں ہے کچھ
پھوٹی ٹوٹی کوئی حویلی ہے سو بھی میدان میں اکیلی ہے
ایک دو مردے سے پڑے ہیں واں زرد ہو ہو گئے ہیں بے لب ناں
لوگ ایسے مکان سب ایسے ایسی جاگہ سے اُچٹیں دل کیسے

اور جو چار گھر نظر آئے
ان کی خوبی کھلے وہیں جائے

وہ بھی کولی چمار تھے کوئی
فاقوں کے زیر بار تھے کوئی

صورتیں کالی سوکھے سوکھے سے
سارے کنگال اور بھوکھے سے

چار دانوں کے واسطے جی دیں
جان کھا جائیں کچھ نہ جھجک لیں

اس سے آگے بڑھے تو دھینور تھے
اُجڑے پجڑے اُنھوں کے کچھ گھر تھے

اور آگے گئے تو تھا بازار
اس میں بنیوں کی تھیں دُکانیں چار

ایک کے پاس دال کچھ آٹا
تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا

ایک کے سانواں اور تھوڑے چنے
چھبڑوں میں کاک دھول ایک کنے

جو تھا باقی رہا سو تھا کنگال
ناؤں کو کہتے تھے اُسے بقال

اس کا عامل کے یاں اُٹھا مایا
اُن نے جیسا کیا تھا سو پایا

ایک کنجڑے کے چار گٹھی پیاز
تس پر اُس کو ہزار فخر و ناز

کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی
اُس مچھندر میں کچھ بھی بھدرگ تھی

ایک دوکان تھی پساری کی
اُن نے ہم لوگوں سے بھی یاری کی

اس سے جاکر جو مانگئے ہلدی
زرد مٹی کو باندھ دے جلدی

دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے
بس تم اس بستی میں میاں جی رہے

یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں
میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں

مانگو اس سے جو مرچ یا دھنیا
دیوے لُچا وہی بتا دھنیا

اُن میں دودانے اور سب کنکر
دیے کاغذ میں ہاتھ لنبا کر

نونگ چورا نفر سے منگوایا
لال مرچیں کُٹی ہوئی لایا

اور اشیا یہیں سے کریے قیاس
آگے جاتا نہیں کہا مجھ پاس

اور دس بیس گھر گنواروں کے
اور دوچار فاقہ ماروں کے

چھوٹی مسجد خطیب تھا نہ اذاں
یہی خانہ خطیب کا تھا واں

نہ تھی قید صلوٰۃ و رسم صوم
اس پہ سیّد امام واں کی قوم

بندے سب جن کا تھا خدا نہ کوئی
اس طریقے سے آشنا نہ کوئی

راہ و رسم و طریق سب بیڈھب
پہلے گالی تھی پیچھے حرف بہ لب

کوسوں بھاگا اگر ملا کوئی
صحبت ایسوں سے رکھے کیا کوئی

ایک تکیہ نہ جسمیں فرش کاہ
حالِ درویش قابل صد آہ

ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اسکو
مرض جوع لاعلاج اُس کو

برسوں چلّا کے نا اُمید ہوا
چپکی سادھی جگر میں چھید ہوا

آتے جاتے سے اُن نے جو پایا
اُسی پر رہگیا وہی کھایا

گرد جو چار خاک کے سے ڈھیر
جن کو کہتے تھے لیٹے ہیں یاں شیر

اپنا تو اعتقاد تھا ہی کم
پر کبھو بلی بھی نہ دیکھی ہم

کچھ نہ دیکھا ہم اُن بھی گوروں سے
کام نکلا سو اپنے زوروں سے

کی توجہ جو ٹک دروں کی اور
دل جگر پر مرے پڑا کچھ زور

جس سے چھاتی میں درد ہونے لگا
رنگ چہرے کا زرد ہونے لگا

پھر زمینداروں میں نفاق ہوا
یہ عجب اور اتفاق ہوا

دونوں کا اک جدا ہی مطلب ہے
یہ کہے روز وہ کہے شب ہے

آس پاس اُس گڑھی کے آئی جھیل
گم تھے برسات میں طریق و سبیل

ایدھر اودھر اُتر کے پانی جاؤ
قہر ہے پھر جو ٹک بھی ہووے چڑھاؤ

اُس سے واں کی ہوا بہت مرطوب
ہووے نزلہ زکام بے اسلوب

کتنے روزوں میں ہوتی ہے کھانسی
ایسی جیسے گلے میں دیں پھانسی

پھر وہ درجہ ہے جس میں ہووے دق
یہ کوئی نکلی ایک ثالث شق

بڑی آفت خطر تھا سکھوں کا
کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا

اس میں آجاتے تو قیامت تھی
مال و جال غرض سکی رخصت تھی

نہ کوئی دادرس نہ وقت داد
مفت ہی ہم گئے تھے سب برباد

کیا کڈھب چرخ کج نے پھینکا تھا
پر خدا کچھ ہمارا سیدھا تھا

جس نے قدرت نمائی کی اپنی
اس بلا سے رہائی کی اپنی

بس قلم ہے صریر تیری تند
شور سے تو پڑا جہاں میں ڈند

بد زبانی کا مجھ کو کب ہے دماغ
ایسی باتوں سے میں کیا ہے فراغ

ہو چکی صاحبوں کی فرمایش
چپ رہ اب ہے زمان آسایش

مثنوی خواب خیال میر

خوشاں حال اس کا جو معدوم ہے
کہ احوال اپنا تو معلوم ہے

رہیں جان غمناک کو کاہشیں
گئیں دل سے نومید سو خواہشیں

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانیِ روزگار
رہا میں تو ہم طالعِ زلفِ یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہونچی خبر مجھ کو آرام کی

اُٹھاتے ہی سر پہ پڑا اتفاق
کہ دشمن ہوئے سارے اہل وفاق

جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغ بالائے داغ

زمانے نے آوارہ چاہا مجھے
مری بیکسی نے نباہا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی
غریبی نے اک عمر کی ہمسری

مجھے یہ زمانہ جدھر لے گیا
غریبانہ چندے بسر لے گیا

بندھا اس طرح آہ بار سفر
کہ نے زاد رہ کچھ نہ یارِ سفر

دل اک بار سو بیقرارِ بتاں
غبار سرِ رہ گزار بتاں

گرفتار رنج و مصیبت رہا
غریب دیارِ محبت رہا

چلا اکبرآباد دے جس گھڑی
درو بام پر چشم حسرت پڑی

کہ ترکِ وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دل مضطرب اشکِ حسرت ہوا
جگر رخصتانے میں رخصت ہوا

کھنچا ساری رہ دامنِ چاک دل
رہا برقفا روِ غمناکِ دل

پس از قطع رہ لائے دلی میں بخت
بہت کھینچیاں میں نے آزار سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھو سنگ در دست رہنے لگا

کبھو غرق بحرِ تحیّر رہوں
کبھو سر بجیب تفکر رہوں

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا
کہ کار جنون آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر گر پڑی
تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑی

مہہ چار دہ کار آتش کرے
ڈروں یاں تلک میں کہ جی غش کرے

توہم کا بیٹھا جو نقشِ درست
لگی ہونے وسواس سے جان سست

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور و خواب میں

اگر چند پرتو سے مہہ کے ڈروں
ولیکن نظر اُس طرف ہی کروں

ڈروں دیکھ مائل اسے اسطرف
بجدے کہ آجائیں ہونٹوں پہ کف

رہی فکر جاں میرے احباب کو
اڑادیویں سب گھر کے اسباب کو

ہوئے پاس کوئی تفاوت سے ہو
سراسیمہ کوئی محبت سے ہو

کوئی فرط اندوہ سے گریہ ناک
گریباں کسو کا مرے غم سے چاک

جو دیکھوں تو آنکھوں سے لوہو بہے
نہ دیکھوں تو جی پر قیامت رہے

کہے چشم بندی کو ہر بار غیر
ولے منزل دل میں اس مہہ کی سیر

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا
تصور مری جان کے ساتھ تھا

اگر ہوش میں ہوں وے بے خبر
وہ صورت رہے میرے پیش نظر

اُسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ
وہی ایک صورت ہزاروں جگہ

نگہ گردش چشم سے فتنہ ساز
مژہ آفتِ روزگارِ دراز

عجب رنگ پر سطحِ رخسار کا
مگر وہ تھا آئینہ گلزار کا

جو آنکھ اُس کی بینی سے جا کر لڑے
دمِ تیغ پر راہ چلنی پڑے

مکاں کنج لب خواہش جان کا
تبسم سبب کاہشِ جان کا

دہن دیکھ کر کچھ نہ کہیئے کہ آہ
سخن کی نکلتی تھی مشکل سے راہ

سزا ہے جگر اس کسو کے لیے
جو سیب ذقن اس کا بو کر جیے

گل تازہ شرمندہ اس رو سے ہو
خجل مشکناب اس کے گیسو سے ہو

سراپا میں جس جا نظر کیجئے
وہیں عمر اپنی بسر کیجئے

کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے
کہیں بادۂ حُسن سے مست ہے

کہیں نقش دیوار دیکھا اُسے
کہیں گرم رفتار دیکھا اُسے

کہیں دلبری اُس کو درپیش ہے
کہیں مائل خوبی خویش ہے

کہیں جملہ تن مہر صرف سلوک
کہیں مجھ سے سرگرم حرف سلوک

لطافت سے یک جان ہووے تمیز
سبک سیر مانند عمرِ عزیز

کہیں جلوہ پرداز وہ عشوہ ساز
کہیں ایستادہ بصد رنگ ناز

ہر اک جائے لے ناز سے وہ سبق
درو بام تصویر کا سا ورق

رہے سامنے اک طرح پر کبھو
رکھے وضع سے پانوں باہر کبھو

بغل میں کبھو آرمیدہ رہے
کبھو اپنے برخویش چیدہ رہے

کبھو صورت دلکش اپنی دکھائے
کبھو اپنے بالوں میں مُنھ کو چھپائے

کبھو گرم کینہ کبھو مہرباں
کبھو دوست نکلے کبھو خصم جاں

کبھو یک بیک یار ہو جائے وہ
کبھو دست بردار ہو جائے وہ

گلے میں مرے ہاتھ ڈالے کبھو
طرح دشمنی کی نکالے کبھو

کبھو چیں بہ ابرو کبھو ہنسکے بات
کبھو بے وفائی کبھو التفات

جو میں ہاتھ ڈالوں وہاں کچھ نہیں
بجز شکل وہمی عیاں کچھ نہیں

ہر اک رات چندے یہ صورت رہی
اسی شکل وہمی سے صحبت رہی

دم صبح ہو گرم رہ سوے ماہ
کہ درپیش آوے یہ روز سیاہ

کہ جھوما کروں بید مجنوں کی طرز
رہے یاد اس سرد موزوں کی طرز

رہوں زرد میں گاہ بیمار سا
پریشاں سخن گہ پریدار سا

بری خوان کو لا کوئی افسوس پڑھائے
کسو سے کوئی جا کے تعویذ لائے

طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے
نہ پینا جو کچھ تھا پلایا مجھے

دوا جو لکھی سو خلاف مزاج
کھنچا اس خرابی سے کار علاج

کہ سر رشتہ تدبیر کا گم ہوا
دل اوپر ہجومِ توہم ہوا

دروں خود بخود بیحواسی رہی
پریشاں دلی اور اُداسی رہی

کروں بیکلی جاؤں تا ہر کہیں
نہ گھر میں لگے جی نہ باہر کہیں

قیامت جنوں کا رہے سر میں شور
کھنچا جائے دل کوہ و صحرا کی اور

رہے شوق سر درگریبانِ دل
ہوا کھینچے صحرا کو دامانِ دل

سر آشفتہ زلفِ گرہ گیر کا
قدم حلقہ در گوش زنجیر کا

جنون آہ درپے ہوا جان کے
مجوز ہوئے یار زندان کے

کیا بند اک کوٹھری میں مجھے
کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے

لب نان اک یار دینے لگے
دم آب دشوار دینے لگے

کہاں علم کا کسب فرصت نہ آہ
ہوا کا بھی واں گشت روزن کی راہ

نہ آوے کوئی ڈر سے میرے کنے
کہ کیا جایے کیسی صحبت بنے

وہ آشفتہ سر ہوشمندی سے دور
نہیں رابطہ مقتضائے شعور

وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر
در اُس کا نہ کھلتا تھا دو دو پہر

جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا
تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا

سر شام بیٹھا تھا میں ایک روز
افاقت نہ آئی تھی مجھ کو ہنوز

کہ یاروں نے برجستہ تدبیر کی
مرے خون میں کچھ نہ تقصیر کی

اگر چند کہنے کو خوں کم کیا
لیا لوہو اتنا کہ بیدم کیا

بڑی دیر تک خون جاری رہا
میں بیہوش وہ رات ساری رہا

جگایا سحر مجھ کو اک شور سے
کھلی آنکھ میری بڑے زور سے

وہی دستِ فصاد میں نیشتر
وہی رنگ صحبت کا پیشِ نظر

وہی لوہو لینے کا ہنگامہ پھر
وہی تر لہو میں مرا جامہ پھر

لگے نشتر ایسے کہ لگتے نہیں
چبھے جیسے مژگاں کسو کے تئیں

ہوا خون سے دامن و جیب تر
رگِ جاں تلک زخم پہونچا مگر

ٹپکتا رہا دیر تک خون ناب
مجھے لے گئی بیخودی کی شراب

سخن ضعف سے سخت دشوار تھا — پلک کا اُٹھانا بھی اک بار تھا
کئی روز بالیں پہ یہ سر رہا — خمار ایک مدّت تلک پھر رہا
کھڑا ہوں اگر پانوں لغزاں رہے — بدن بید کی طرح لرزاں رہے
چلا جائے سر پانوں تھر تھر کرے — نسیمِ سحر کارِ صرصر کرے
جفا ضعف سے مجھ کو کیا کیا نہ تھی — افاقت گئی یوں کہ گویا نہ تھی
پس از چند آنکھیں ٹھہرنے لگیں — نگاہیں بھی کچھ کام کرنے لگیں
بندھا ناتوانی کا رختِ سفر — کیا طاقتِ رفتہ نے منھ ادھر
کسے تھا مری زندگانی کا دھیان — ولیکن نہایت تھا میں سخت جان
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ — کوئی روز رہنا تھا دُنیا کے بیچ
پھرا ناتواں میں بہت دور سے — کہ نزدیک تھا عالمِ گور سے
غلط کاریِ وہم کچھ کم ہوئی — وہ صحبت جو رہتی تھی برہم ہوئی
وہ صورت کا وہم اور دیوانگی — لگی کرنے درپردہ بیگانگی
پس از دیر آنکھوں میں آنے لگی — نہ دو دو پہر منھ لگانے لگی
نہ دیکھے مری اور اس پیار سے — غریبانہ سر مارے دیوار سے
کہیں ٹک تسلّی کہیں بیقرار — کہیں شوق سے میرے بے اختیار
کہیں واسطے میرے روتی ہے خون — کہیں دست زیرِ زنخ ہے ستون
کہیں دل کو اپنے دکھاوے مجھے — مری بیوفائی جتاوے مجھے
کہیں دست بر دل وہ رشکِ قمر — کہیں حسرت آلودہ مجھ پر نظر
کہیں بیدماغانہ سرگرمِ ناز — کہیں آتشِ شوق سے جانگداز
کہیں چشمِ گریاں سے دامان پاک — کہیں سوجگہ سے گریبان چاک
کہیں کام دل کی شکایت سے ہے — کہیں نقشِ دیوار حیرت سے ہے
کہیں مجھ سے کہتی ہے رخصت مجھے — کہ مطلق نہیں غم کی طاقت مجھے
کہیں لب پہ وہ شکوۂ خوں چکاں — کہ ٹپکا جس سے آزار جاں
کہیں وہ نگہ جس سے یہ پایئے — کہ یہ دردِ دل ہے تو مٹ جایئے

کہیں وہ روش جس سے نکلے عتاب
کہیں وہ طرح جس سے رہیے خراب

کہیں وہ حرف زن اس طرح ناز سے
کہ دیکھا گیا دل کس انداز سے

کہیں وہ ادا جس سے معلوم ہو
کہ جیسے وہ عاشق کہ محروم ہو

کہیں وہ سخن جو جگر خوں کرے
کہیں طرز ایسی کہ مفتوں کرے

کہیں وضع ایسی کہ بیگانہ ہے
کہیں آشنا ہے تو دیوانہ ہے

کسو جا ہے جلوے میں اس آن سے
کہے تو کہ بیزار ہے جان سے

کسو وقت اس کا یہ اسلوب ہے
کہ شرمِ محبت سے محجوب ہے

کبھو بیقراری ہے اس رنگ سے
کہ پھرتی ہے سر مارتی سنگ سے

کبھو بے ادائی و دشنام ہے
کبھو باد کے ہاتھ پیغام ہے

کہ اے بیوفا آہ دل نرم کر
محبت کی بھی مُنھ سے کچھ شرم کر

کبھو وہ تبختر کہ پروا نہیں
کبھو کیونکہ کہیئے کہ سودا نہیں

کبھو یہ سخن جس سے ہو مستفاد
کہ اے بیوفا حرف من یاد باد

کہ ظاہر میں میؔر اب توانا گیا
کہ وہ دوستی کا زمانہ گیا

غرض نا اُمیدانہ کر اک نگاہ
وہ نقش تو ہم گیا سوے ماہ

نہ آیا کبھو پھر نظر اس طرح
نہ دیکھا اُسے جلوہ گر اس طرح

مگر گاہ سایا سا مہتاب میں
کبھو وہم سا عالمِ خواب میں

دل خو پذیرِ وصالِ دوام
رہے خواب میں روز و شب صبح و شام

اگر وصل خواب فراموش تھا
ولیکن وہی خواب کا جوش تھا

پلک سے پلک آشنا ہے وہی
زخود رفتگی کی ادا ہے وہی

کھڑا ہوں تو سوتا ہوں اک ذوق میں
رگِ خواب دل ہے کفِ شوق میں

جو بیٹھا ہوں خواب گراں ہے مجھے
وہ غفلت جہاں در جہاں ہے مجھے

خیال اس کا آوے کہ سُن ہو رہوں
تلے سر کے پتھر رکھوں سو رہوں

مجھے آپ کو یونہیں کھوتے گئی
جوانی تمام اپنی سوتے گئی

دکھایا نہ اُس مہ نے رو خواب میں
نہ دیکھا پھر اُس کو کبھو خواب میں

بہت بیخود و بیخبر ہو چکا　　ہم آغوش طالع بہت ہو چکا
نہ دیکھا کبھو میرؔ پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

مثنوی در مذمّتِ دُنیا

سنو اے عزیزانِ ذی ہوش و عقل　　کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے　　سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے
کہوگے کہ آگے تھا کہتا کوئی　　نہیں اس سرا بیچ رہتا کوئی
بجا ہی گیا کوس رحلت مدام　　کنھوں نے نہ بجتا سنایاں مقام
یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں　　جہاں جملہ ہے ایک بزمِ رواں
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش　　یہ منزل نہیں جائے بود اور باش
گدا ہو کہ ہو شاہِ عالی تبار　　تہ خاک سب کا ہے دارالقرار
نہ یک بوئے خوش ہی ہوا ہو گئی　　وہ رنگینیٔ باغ کیا ہو گئی
ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر　　پریشاں ہوئے مرغِ گلشن کے پر
پتنگوں نے گر خاک مسکن کیا　　چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا
گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ　　رہا آب سو بھی روانی کے ساتھ
رہی راکھ ہو اگر آگ تھی　　رکن ہے جہاں باد کی لاگ تھی
نہ جدول رہے گی نہ سروِ رواں　　گلستاں کو پاویں گے ہو کا مکاں
زمیں کا رہے گا یہی کیا سبھاؤ　　لپٹ جائیں گے آسماں جیسے تاؤ
سکوں یاں کا دیکھا سرا سر شتاب　　چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب
جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب　　نہیں جائے باش اور جا ہے عجب
بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں　　عیاں ہے کہ کہتے ہیں جاں کو رواں
جوانی گئی موسمِ شیب ہے　　شہود ایک دو روز کو غیب ہے

ہنسوں کیونکہ ہستی میں دنداں نما — کہ ہے جائے دنداں ہی دنداں نما
گیا شور سر سے جھکا ہے بہت — گئی واشد اب دل رکا ہے بہت
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے شام — مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح وہ شام
کریں لمس کیا ہر گھڑی ہے صداع — نہیں لذّت اکل و شرب دوقاع
بلا ارتعاشِ تنِ زار ہے — ہر اک عضو چلنے کو تیار ہے
ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف — نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف
ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے — کہوں کیا گزرتی ہے خاموش ہائے
نہ پوچھو لب و لہجہ بے طور ہے — سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
نہیں گود کے کام سے کچھ فراغ — کسے ذوق صحبت کہاں ہے دماغ
نہ کچھ یونہیں عینک نظر چڑھ گئی — بصارت کی بے طاقتی بڑھ گئی
نہ رکھیے جو عینک نہ آوے نظر — کہے تو کہ اعمیٰ ہیں ہم بے بصر
رہیں دیکھ بھو حرف زن ہو حریف — رہا سننے کے گوں نہ سمعِ شریف
صد افسوس لطفِ سماعت نہیں — صدا دور سے جیسے آوے کہیں
شباب آہ داغ و جگر دے گیا — قد خم زمیں کی طرف لے گیا
نہ کچھ زور بازو بہت کم ہوا — جھکا سر سو زانو کا ہمدم ہوا
جوانی کی شب کیا بسر ہوگئی — سفیدی مو سے سحر ہوگئی
بدن زار اعضا سبھی رعشہ دار — کرے کون خوباں سے بوس و کنار
جو یہ چال ہی جا رہے ہیں ہم اب — دموں پر غرض آ رہے ہیں ہم اب
کھڑے ہوں تو تھرّائے ران اور ساق — جئیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو یوں پانوں چلتے بچلتے رہے — تو دیکھو گے ہم یاں سے چلتے رہے
اگر ضعف سے چپ ہی رہتے ہیں ہم — یہ سوچو تو کیا کیا نہ کہتے ہیں ہم
کہے میں نہیں اپنے تک پاؤ دست — کیا خاک میں مجھ کو پیری نے سخت
جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں — اگر منھ کو دیکھو تو وہ رو نہیں
بدن کی ہوئی میرے صورت ہی اور — وے آنکھیں نہیں وے نہ چتون کے طور

جسد ناتواں جائے مہمان تنگ
سخن منھ پہ آوے وداعی کے رنگ

لبوں پر نہایت ضعیف ایک آہ
در و بام پر حسرتوں سے نگاہ

شکن جلد میں دل کو پژمردگی
غریزی حرارت میں افسردگی

برودت بہت جسم میں آگئی
مزاجی تھی گرمی سو ٹھہرا گئی

چھڑکتا رہوں منھ پہ میں آب کاش
کہ ہوتا رہے روح کا انتعاش

وگر نہ دیا سا بجھا جائے ہے
پھر اٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے

سیہ روے شیب اک ستم کر گیا
لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

قلم رکھ دے کر میرؔ ختم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

☆☆